لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی

مذہب کے معاملے میں کچھ زبردستی نہیں ہے - سیدھا راستہ گمراہی سے الگ واضح ہوگیا ہے

حقائق اسلام

جسے بہ ایماے

علیا حضرت والا شوکت جناب نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ

بالقابہا - سی آئی - جی سی ایس آئی جی سی آئی ای -

فرمان رواے ریاست بھوپال دامہا اللہ بالعز والاقبال الی یوم المآل

خاکسار

مفتی محمد انوار الحق ایم اے منشی فاضل ڈائرکٹر تعلیمات ریاست بھوپال

نے تصنیف کیا

اور

مطبع مفید عام آگرہ میں محمد قادر علی خاں صوفی کے اہتمام سے چھپا

قیمت فی جلد عہ ۸

طبع اول دو ہزار جلد

لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی

مذہب کے معاملے میں کچھ زبردستی نہیں ہے سیدھا راستہ گمراہی سے الگ واضح ہو گیا ہے

حقائق اسلام

جسے بہ ایمائے

علیا حضرت والا شوکت جناب نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ

بالقابہا۔ سی آئی۔ جی سی ایس آئی جی سی آئی ای۔

فرماں روائے ریاست بھوپال دامہا اللہ بالعز والاقبال الی یوم المآل

خاکسار

مفتی محمد انوار الحق ایم اے منشی فاضل ڈائرکٹر تعلیمات ریاست بھوپال

نے تصنیف کیا

اور

مطبع مفید عام آگرہ میں محمد ادریس صوفی فاعل خاں کے اہتمام سے چھپا

شکریہ

یوں تو قیام قیامت تک انشاء اللہ

ہماری

آقائی ولی نعمت قدر قدرت سلیمان شوکت سکندر حشمت علیا حضرت جناب نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ سی آئی۔ جی سی ایس آئی۔ جی سی آئی ای فرماں روائے دارالاقبال بھوپال ادامہا اللہ بالعز والاقبال الی یوم المآل کا نام نامی واسم سامی علمی دلچسپی۔ قومی ہمدردی۔ اور اسلامی سرگرمی کے آسمان پر آفتاب تاباں بنکر چمکیگا اور مسلمانوں کی اخلاقی۔ دماغی اور تمدنی ترقی پر ہمیشہ انکے فیوض بیکران اور الطاف بے پایاں کا احسان رہے گا۔ مگر میں حیران ہوں کہ اس بندہ نوازی اور ذرہ پروری کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں جو حضور عالیہ ہمیشہ خدام بارگاہ سلطانی کے حال پر مبذول رکھتی ہیں۔ یہ مضامین علیا حضرۃ کے ایما ہی سے نہیں لکھے گئے بلکہ انکے اصلاح وارشاد سے بھی ممتاز ہوئے ہیں اور تمہید سے لیکر تکمیل تک اس کتاب کا ہر ایک باب حضور ممدوحہ کے نظر فیض اثر کا احسان مند ہے اسلئے اگر میری یہ ناچیز کوشش کسی پہلو سے بھی کچھ مفید ثابت ہو تو یقیناً میری محنت اور دماغ سوزی سے زیادہ علیا حضرۃ کی توجہ قابل تحسین اور مستحق ستایش ہوگی اور اس کا شکریہ ہم سب پر لازم ہے ؎

تا جہد زرع سبز آسماں خواہد بود | تا خرمی باغ جہاں خواہد بود
ہر تخم کہ ریشہ بردں خواہد داد | فیض کرم تراز باں خواہد بود

خادم خاکسار۔ الانوار

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تہدیہ

میں دلی خلوص سے اِس ناچیز کتاب کو اپنے پاک اور مقدس مذہب

اسلام

کے نام سے معنون کرتا ہوں

خاکسار مصنّف

فہرست مضامین حقائق اسلام

معذرت

مین ناظرین کرام سے سخت نادم و شرمسار ہون کہ اس کتاب مین بہت سی غلطیان
رہ گئی ہین - مین نے کاپیان توحتی المقدور احتیاط سے دیکھ لین تھین -
مگر پروف نظر سے نہ گزر سکے - اور اسی کا نتیجہ ہے کہ مجھے اس عذرخواہی
کی ضرورت پڑی - یون تو اس کے ایک ایک نقطے کی کمی بیشی سے میرے دل پر
صدمہ ہے - مگر مجھے خاص کر ان غلطیون کا نہایت ہی افسوس ہے
جو آیات قرآنی کی کتابت مین کی گئی ہین - اور افسوس پر افسوس یہ کہ یہی
غلطیان زیادہ ہین - غلطنامہ کا لگانا عموماً زیادہ مفید ثابت نہین ہوتا -
اس لئے مین قارئین کی صحیح خوانی اور غلط پوشی پر بھروسہ کرکے اسی معذرت
پر اکتفا کرتا ہون -

خاکسار مصنف

۷۸۶

استعذار

حقائق اسلام پر مجھ جیسے ہیچمداں کا قلم اُٹھانا ہی استعذار کا مستلزم ہے۔ مگر میں اس کے سوا اور کیا عذر کر سکتا ہوں کہ میری سرکار ابد قرار صانہا اللہ عن الشرور و الآفات نے اس قسم کے مضامین کی ضرورت محسوس فرمائی اور اس خاکسار کو تعمیل ارشاد پر مامور کیا اور میں نے اس فرمان واجب الاطاعت کو ایک مذہبی عبادت سمجھ کر انجام دیا۔ اب میری کوششوں کا نتیجہ جیسا کچھ ہے۔ ناظرین کے سامنے ہے لیکن بہر حال مجھے شروع ہی میں اس اہم خدمت کی انجام دہی کے متعلق اپنے۔ قصور علم و فہم کا اعتراف کر لینا ضروری ہے۔ کیونکہ میں اور کچھ جانتا ہوں یا نہیں مگر اپنی خامیوں کو اچھی طرح جانتا ہوں اور میری حقیقت ناشناسی کی ایک دلیل یہی ہے۔ کہ میں نے بیدل کی اس نصیحت کو جانکر بھی اس پر عمل نہ کیا۔ حالانکہ اسنے سچ کہا ہے۔

کیونکہ مشکل یہ ہے کہ جو لوگ تحقیق حق کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ وہ
فریق مخالف کے خیالات سے تو انکی کتابوں کے ذریعے سے متاثر
ہو جاتے ہیں۔ مگر مذہب کی حمایت میں عقلی دلائل کی کتابیں نایاب ہوتی
ہیں اور یوں ان کے دل و دماغ میں روز بروز وہی مذہب کا بیخ کُن اثر
جڑ پکڑتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر وہی لوگ مذہب کے نام سے چڑنے لگتے ہیں۔

ابھی چند دن ہوئے کہ بمبئی میں ایک نہایت شاندار دعوت
دی گئی تھی جس میں حسن اتفاق سے راقم الحروف بھی شریک تھا۔ اس
جلسے میں میری ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ جو وجود باری کی عقلی
دلائل چاہتے تھے۔ کیونکہ تعارف کرنیوالے بزرگ نے راقم الحروف کی
ایک سابقہ تالیف "اثبات واجب الوجود" کا ان سے ذکر کر دیا تھا۔
بلکہ حقیقت میں یہی ایک امر بنائے تعارف ہوا تھا۔ اس لئے ملاقات
ہوتے ہی حقیقت مذہب کی بحث چھڑ گئی۔ اور اثنائے گفتگو میں اُنہوں نے
بیان کیا کہ وہ ہمیشہ حق کی تلاش میں سرگرداں اور کوشاں رہے ہیں مگر
اب تک وجود باری کی کوئی عقلی وجہ ان کی سمجھ میں نہیں آئی اسی ضمن
میں اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ "ایک دن میں نے ایک مولوی سے یہ ذکر کیا تو
اُنہوں نے مجھ سے فرمایا" کہ تم کلام مجید پڑھا کرو" اس پر میں نے جواب دیا
کہ "تم افیم کھایا کرو" مگر آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس سے میرا مقصد کلام مجید کی
کی توہین نہ تھا" چونکہ وقت تنگ تھا اور میں ایک حد تک ان کے
اس بظاہر بے تعلق جواب کا اصلی استدلال بھی سمجھ گیا تھا۔ اس لئے

اے کہ از فہم حقائق دم زنی خاموش باش - عمرہا باید کہ دریابی زبانِ خویش را

اس کی ضرورت کے متعلق میں فقط یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مخالف اسباب نے اسلام کی حقیقت اور حقانیت کو اتنا خس پوش کر دیا ہے کہ غیر اقوام میں ہی تبلیغ مذہب کیلئے نہیں بلکہ خود مسلمان نوجوانوں کو گمراہی اور کجراہی سے بچانے کے لئے۔ ایسے مضامین کی نہایت سخت ضرورت ہے جو معقول دلیلوں سے اسلام کے روشن چہرے پر سے ان بدنما داغوں کو دور کر دیں جو معترضین کی نکتہ چینیوں اور مخالفین کی حرف گیریوں نے اس پر لگا دئے ہیں۔ اور جنسے حقیقت میں اس کا دامن بالکل پاک ہے۔ عقاید مذہبی میں خود بھی بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ جو دشمنوں کے ہاتھ میں جا کر خوفناک دلیلیں بنجاتی ہیں۔ حالانکہ اسلام کسی طرح بھی انکا جوابدہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس میں انکا وجود ہی نہیں ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ایسے مغالطوں کو بھی ظاہر کر کے انکی صحیح صورتیں بتائی جائیں۔ تاکہ ہمارے انگریزی خواں نوجوان غیر مذہب کے مبلّغوں کے دھوکے میں نہ آئیں۔ بہرحال گو میں اس خدمت کا اہل نہیں ہوں مگر چونکہ اشاعت اسلام میں تھوڑا بہت حصہ لینا ہر ایک مسلمان کا فرض ہے اس لئے جو کچھ مجھ سے بن پڑا میں نے بھی کیا۔ اور اگر میری سعی مشکور نہ ہو تب بھی اس کام کی ضرورت یقیناً مسلّم ہے۔ اور جس قدر عیسائی مشنریوں کی کوششیں اور رشنلسٹک پریس کی مطبوعات بڑھتی اور پھیلتی جائینگی اسی قدر اس خدمت کی حاجت اور اہمیت بھی ترقی کرتی جائے گی

شخص افیم کھانے کی عادت ڈال دے۔ اور پھر افیم نہ ملنے کی صورت
میں اپنی آشفتہ سری اور پریشان حالی دکھا کر اس سے افیم کی واقعی ضرورت
اور لازمی فائدوں کا استدلال کرے۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ ایسا کرنے سے
ہم صحیح نتیجے تک نہیں پہونچ سکتے" (مجھے افسوس ہے کہ میرے معزز
ملاقاتی یہاں موجود نہیں ہیں۔ ورنہ میں ان سے پوچھ لیتا کہ میں نے ان کا
مطلب سمجھنے میں غلطی تو نہیں کی۔ بہرحال اب تو مجبوری ہے) مجھے
اتفاق ہے کہ اس لحاظ سے ان کا جواب بالکل معقول تھا۔ مگر میں ان سے
یہ پوچھتا ہوں کہ کبھی فلسفے اور سائنس کی کتابیں پڑھتے وقت بھی انکو
یہ خیال آیا ہے کہ وہ اپنی طبیعت کو وجود باری سے انکار اور عقائد
مذہبی کے ابطال کا بالکل اسی طرح خوگر کر رہے ہیں جیسے کوئی شخص روز
افیم کھا کھا کر اپنا آپ کو اس کا عادی بنائے یا جیسے وہ کلام مجید
کے پڑھنے کی عادت ڈالتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ یقینی بات ہے کہ
خواہ وہ فلسفے سے کیسی ہی فطری مناسبت لیکر کیوں نہ آئے ہوں۔
پھر بھی وہ تمام فلسفیانہ دلائل کو بادی النظر میں سمجھنے پر قادر نہ ہونگے
بلکہ یہ قابلیت انہوں نے رفتہ رفتہ سبقاً سبقاً حاصل کی ہوگی جسمیں
ہر ایک آیندہ دلیل کو گزشتہ دلیلوں سے مدد اور سہارا ملا ہوگا۔
ریاضی سے زیادہ معقول اور کونسا علم ہوگا؟ مگر پھر بھی آپ کسی معمولی
شخص سے اقلیدس کی شکل عروس یا الجبرے کی بائی نومیل[۵] تھیوریم کا

۵؎ بائی نومیل تھیوریم الجبرے کا ایک مشہور اصول ہے جو سر اسٹن نیوٹن نے تحقیق کیا تھا۔

ان کو مزید تصریح کی ضرورت نہ تھی۔ مجھے اب تک افسوس ہے کہ اس وقت یکایک دسترخوان پر بلا لیئے جانے کی وجہ سے یہ دلچسپ گفتگو ناتمام رہگئی۔ ورنہ ممکن تھا کہ یہ کتاب بھی ناتمام رہجاتی۔ بہرحال چونکہ یہ نکتہ خیال کسی ایک فردِ واحد سے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ طالبانِ صداقت کو یہ مرحلہ اکثر پیش آتا ہے۔ اسلیئے میں یہاں اپنی سمجھ کے مطابق اس کا جواب دیئے دیتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ جب میرے وہ محترم شناسا اس کو پڑھیں گے تو خواہ وہ میرے ہمخیال ہوں یا نہوں مگر ان کو بمبئی کی اس دعوت کا وہ دلکش منظر ضرور یاد آجائے گا۔ اب ان کے اعتراض کو لیجئے۔

فی الواقع قرآن شریف پڑھنے کی ہدایت کے جواب میں ان کا یہ کہنا کہ "تم افیم کھایا کرو" بظاہر خواہ کتنا ہی حقارت آمیز کیوں نہو مگر دراصل کلام پاک کی توہین پر مبنی نہ تھا کیونکہ اس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ ہم کلام مجید ہی کی صداقت کا تو ثبوت چاہتے ہیں۔ اور آپ اسی کی تلاوت کی ہدایت کرتے ہیں۔ گویا آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم پہلے اسکو مان لیں۔ اور اس کو سچ سمجھ کر پڑھا کریں تاکہ ہم اسکے خوگر ہو جائیں۔ اور پھر یہ عادت خود ہی رفتہ رفتہ ہمارے خیالات پر اثر ڈالکر ان کو ایسے سانچے میں ڈہال دیگی کہ ہم اس کی صداقت کا ثبوت مانگنا بھول جائیں گے۔ لیکن اگر یوں کوئی اسکو سچ مان بھی لے تب بھی اس سے اسکی صداقت واقعی لازم نہیں آتی۔ کیونکہ اسکی مثال بعینہ ایسی ہی ہوگی۔ جیسے کوئی

میں اس کے مخالف خیالات کا گزر ہی محال اور ناممکن ہو جائے گا۔ اور یوں ہم صرف انہی باتوں کو معقول سمجھنے لگیں گے جو ہمنے خود رفتہ رفتہ اپنے دماغ میں بھر دی ہیں۔ اسکے برخلاف اگر شروع سے ہمارا میلان طبع خدا پرستی اور مذہب کی طرف رہا ہے۔ تو پھر اگر یکایک کوئی فلسفیانہ اعتراض ان عقائد پر کیا بھی جائے گا تو خواہ وہ کتنا ہی معقول اور سنجیدہ کیوں نہو۔ مگر ہم اسکے سمجھنے سے قاصر ہونگے اور ہمارا دل اسے قبول نہیں کرے گا۔ کیونکہ ہمارے خیالات نے اس روش پر چلنا سیکھا ہی نہیں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ ہمارے اکثر علما آجکل کے نوجوانوں کے اعتراضوں کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اور ان کی معقولیت کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔ یہ ہی سبب تھا کہ ہمارے محترم ملاقاتی نے تلاوت قرآن کو افیم کی عادت سے تشبیہ دی۔ اور یہی باعث ہے کہ ہمکو اپنے سارے استدلال میں کہیں بھی کوئی بات غیر معقول نہیں معلوم ہوتی کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ط

غالباً میرا یہ استدلال غلط نہو۔ اس طول طویل تقریر سے مجھے صرف یہ دکھانا تھا کہ ہمارے مکرم کو عادتاً مذہب کے معتقد ہو جانے پر جو اعتراض ہے بعینہ وہی اعتراض عادتاً مذہب سے انکار کرنے پر بھی وارد ہوتا ہے اور حقیقت میں مسائل سائنس بھی اتنے معقول اور قریب الفہم نہیں ہیں جتنے کہ وہ علی العموم سمجھے جانے لگے ہیں۔ نہ مذہبی عقاید اس قدر نامعقول اور خلاف قیاس ہیں۔ جیسا کہ آج کل عام طور پر ان کو کہا جاتا ہے۔ ہاں

عقلی ثبوت مانگیے پھر دیکھیے کہ وہ کیا کہتا ہے۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ نہ ایک کی صحت میں کچھ شک ہو سکتا ہے۔ نہ دوسری کی صداقت پر بحث کیجا سکتی ہے۔ تاہم وہ شخص ان کو اس وقت تک ثابت نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ پہلے اقلیدس کی پہلی شکلیں اور الجبرے کے گزشتہ مسئلے نہ سمجھ لے۔ یہ حال تو ان علموں کا ہے جنکو "مجموعۂ بدیہیات"[۱] کہا جاتا ہے اس سے بدرجہا زیادہ مشکل سائنس کے دیگر شعبوں اور فلسفے کی اور شاخوں کا مطالعہ ہے جن کے قیاسات کو کوئی شخص قطعاً تب تک نہیں سمجھ سکتا جب تک کہ وہ پوری توجہ اور احتیاط سے ان کے ابتدائی مسائل پر غور و خوض نہ کرے۔ لیکن ذرا سوچیے کہ اس تدریجی ترقی کے کیا معنے ہیں ؟ یہی کہ ہم آہستہ آہستہ اپنے خیالات کو ایک خاص سانچے میں ڈھالتے ہیں اور ایک معینہ روش اختیار کر کے قدم بقدم اس پر چلتے ہیں۔ اور جب تک ہم ایسا نہ کریں تب تک ہم اسکے آیندہ مسائل سمجھنے کے قابل ہی نہیں ہوتے۔ لیکن طبیعت کو ان کا عادی بنانے سے آخر وہ باتیں اتنی دلنشین ہو جاتی ہیں کہ ان کے ظنیات بھی ہماری نظروں میں یقینیات بنجاتے ہیں۔ اب اگر یہ سانچہ سائنس اور فلسفہ جدیدہ کا ہوگا اور یہ روش مذہب اور خدا سے اعراض کی ہوگی تو چند دن میں ہمارا دماغ ایسے قیاسات و تصورات سے بھر جائیگا کہ آخر ہمارے ذہن

---

[۱] ۔ بعض فضلانے ریاضی کی یہی تعریف کی ہے کہ ریاضی حقیقت میں بدیہی اور عام فہم باتوں کا مجموعہ ہے۔ جو مرتب کر دی گئی ہیں۔

بنا پر یہ پایا جاتا ہے کہ وہ زبردستی ہر شخص کے دل میں سما جائے۔ اور خواہ کوئی مانے یا نہ مانے جبراً ہر ایک سے اپنے آپکو منواتا پھرے۔ کس اصول اور کس قاعدے کے مطابق ایسا ہونا ممکن ہے؟ اور کیا دنیا کی کوئی اور سچی سے سچی اور بدیہی سے بدیہی بات بھی اس معیار کے موافق اپنی سچائی کو ثابت کر سکتی ہے؟ البتہ اگر عقائد مذہب اور مسائل فلسفہ کی معقولیت اور مطابقت فطرت میں انصاف کے ساتھ محاکمہ کرنا منظور ہو تو یوں ہو سکتا ہے کہ ان کو کسی ایسے شخص کے سامنے پیش کیا جائے جو دونوں سے یکساں تعلق اور ناواقف ہو۔ کیونکہ فی زمانہ ایسا فاضل کامل ملنا تو محال ہے جو سائنس اور مذہب دونوں میں دستگاہ تام رکھتا ہو اور پھر دیکھا جائے کہ کسی قسم کے سابقہ رجحان کے بغیر وہ کن باتوں کو جلدی اور زیادہ آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔ کیونکہ کسی بات کے مطابق فطرت ہونے کا اسکے سوا اور کوئی معیار سمجھ میں نہیں آتا۔

اس لئے حقیقت میں ہمارے دوست کا فرض ہے کہ اگر وہ تحقیق حق کے دعوے میں سچے ہیں۔ تو جسطرح انہوں نے فلسفیانہ کتابیں پڑھ پڑھ کر اپنے خیالات کو ایک خاص رنگ دیدیا ہے۔ ویسے ہی وہ سچے دل سے خالی الذہن ہو کر مذہبی کتابوں کا بھی مطالعہ کریں اور انکی حکمتوں اور نصیحتوں کو بھی سوچیں اسکے بعد ان کو ان دونوں میں محاکمہ کرنے کا حق حاصل ہوگا ورنہ موجودہ صورت میں اصول ارتقا کے مطابق ان کا اپنے خیالات کو بدل کر کوئی اور رنگ اختیار کرنا ناممکن ہے اور

بات یہ ہے کہ چونکہ علوم عقلیہ کی بنا ہی تجربات اور عملی ثبوت پر رکھی گئی ہے۔ اور انہی سے شروع ہوکر آخر وہ ان دقیق اور پیچیدہ مسائل پر منتہی ہوتے ہیں۔ جو وجود باری اور بقاے روح وغیرہ عقائد میں مخل ہیں اسلئے بتدریج دماغ کی قوت فکر انہی کے قالب مین ڈھل جاتی ہے۔ اور ان کے سارے نظریے بدیہی معلوم ہوتے لگتے ہیں۔ اس کے برخلاف مذہبی تعلیم کا مدار ہی باطنی قوتوں پر ہے۔ جو کبھی مشاہدات اور عملیات کے ضمن میں آ ہی نہیں سکتیں اور چونکہ عموماً آج کل اس کی طرف سے لاپروائی اور کم توجہی کیجاتی ہے۔ اس لئے آہستہ آہستہ وہ قوتیں اتنی بیکار اور بے حس ہو جاتی ہیں کہ وہ ہمکو ان نتائج تک پہنچا ہی نہیں سکتیں جنکی رہبری کے لئے وہ بنائی گئی تھیں۔ اسلئے جس طرح ایک ناخواندہ شخص ڈارون اور ہیکل کے مسئلوں کی صحت کا حکم نہیں ہو سکتا ویسے ہی ہمارے ہاں کے گریجوایٹ عقائد مذہب کے صدق و کذب کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ اگر انکے تسلیم نہ کرنے سے مذہب کے اصول نامعقول اور خلاف فطرت مان لئیے جاتے ہیں۔ تو اس شخص کے نہ ماننے سے فلاسفہ کے اقوال کیوں لغو اور لچر نہ سمجھے جائیں جیسے یہ ان کی دلیلوں سے بیخبر ہے ویسے ہی وہ ہمارے خیالات سے بے بہرہ ہیں۔ غرض جس بات کی بابت یہ دونوں فریق رائے زنی کرتے ہیں۔ اس سے ناواقف ہونے میں دونوں برابر ہیں۔ پھر مذہب بیچارے کے ساتھ یہ بے انصافی کیوں کیجاتی ہے اور اس سے کس

ابھی انہی دونوں چیزوں کا ایک مظہر ہیں اور یوں اگر کوئی چیز اپنے آپ کو
نہ ہٹا سکے تو اُس سے اوسکی قدامت ثابت کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے
کسی پتھر کے بذاتہ متحرک نہونے سے کوئی یہ کہے کہ اس کا ہلانا ہی ناممکن ہے
اس استدلال سے کوئی اور بات ثابت نہو تو کم سے کم یہ تو معلوم ہوتا ہے
کہ اگر فلسفے کے مسائل عقلی اور یقینی ہیں - تو ہمارے اعتراض بھی بالکل
لچر اور نامعقول نہیں کہے جا سکتے - اور اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ
اُن اصحاب کو جو ان امور میں تقلید کی بجائے خود ہر ایک بات کو سمجھکر
ماننے کے مدعی ہوں اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ دونوں شقوں پر یکساں
توجہ اور غور کریں اور محض اس وجہ سے کہ کوئی بات یکایک ان کی سمجھ
میں نہیں آتی اس سے انکار نکر دیں اور [لہ] بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ
(سورہ یونس) کے مصداق نہوں

اگر از صنع تا صانع راہی می تواں بردن	چرا در بند نقش ما نباشد نقش بند ما

اس لئے کم سے کم اتنا تو ہم سب کا فرض ہے کہ ہم مذہبی کتابوں کا بھی مطالعہ
ضرور کریں اور محاکمہ کرتے وقت ان سب دلائل پر بھی پورا غور کریں - جو فلسفے
کے مقابلے میں مذہب کی طرف سے پیش کیجاتی ہیں - ممکن ہے کہ یوں رہبر
حقیقی ہم کو بھی گمراہی سے نکالکر صراط مستقیم دکھا دے جس پر وہ لوگ
چلتے ہیں جو اسکے انعام سے مالا مال ہیں -

لہ **ترجمہ** بلکہ وہ جس چیز کو سمجھ نہ سکے اسے جھٹلانے لگے حالانکہ اسکی تصدیق کے
موقع ہی پیش نہیں آسکے -

اس میں بڑی گہری بات یہ ہے کہ گو ان کو اپنے خیالات کی صحت کا یقین ہو جائے پھر بھی اس یقین سے ان کے خیالات کی واقعی معقولیت کا استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ بعینہ جس طرح ایک عادتاً وطبیعتاً پابند مذہب شخص کے عقائد سے اِن عقائد کی صداقت لازم نہیں آتی۔ یا جیسے ایک عادی افیمی کی جمائیوں اور انگڑائیوں سے افیم کے فائدوں کا ثبوت نہیں ہوتا۔

اسی قسم کا اعتراض لا ادریت پر بھی وارد ہوتا ہے اسکے پیرو کہتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں جانتے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ "وہ کچھ نہیں جاننا چاہتے اس لئے وہ کچھ نہیں جان سکتے" وہ اصحاب جنہوں نے عمر بھر مخالفانہ روش پر چلکر اپنے دلوں اور کانوں اور آنکھوں کو آیات ربانی کی طرف سے بند کر دیا ہے وہ اپنے انکار سے اسکی نابودگی کو کیونکر ثابت کر سکتے ہیں؟ جبکہ انہی کے سے ذی عقل بندگان خدا کی ایک تعداد کثیر کو ہر ایک چیز میں اسی کا جلوہ نظر آتا ہے بعینہ جس طرح وہ نظام کائنات کو قایم اور جاری رکھنے کے لئے قوانین قدرت کے سوا اور کسی ذی ارادہ حکمران کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ویسے ہی ہم ایک صاحب عقل و عزم مقنن کے بغیر قانونوں کے وجود کا تصور نہیں کر سکتے یا جیسے وہ اپنے تجربوں کی بنا پر قوت اور مادے کو غیر فانی کہتے ہیں ویسے ہی ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ اِن کے تجربوں سے صرف اتنا ثابت ہو سکتا ہے کہ مادہ اور قوت اپنے آپ کو فنا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ تجربہ کرنے والے خود

اصلی تعلیم اور سچی تلقین ہے - اگرچہ چونکہ مجھے نہ تو فلسفہ جدید پر پورا عبور ہے اور نہ مسائل مذہب پر کامل دستگاہ ہونیکا دعویٰ ہے اسلئے مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں تو فضلاے سائنس میرے جوابات کو ناکافی سمجھیں گے اور کہیں علماے ملت میرے استدلال کو بدعت کہیں گے - مگر ان شبہوں کے جواب میں میں صرف یہ ہی کہہ سکتا ہوں کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے اپنی سمجھ اور اپنے عقیدے کے مطابق سچ سچ لکھا ہے - اور بخیال خود کہیں غلط تاویل اور نامعقول توجیہ پیش نہیں کی ہے - یعنی میں کوئی ایسی دلیل نہیں لایا ہوں جسے میں خود معقول اور دلنشین نہ سمجھتا ہوں - اور میں نے کلام پاک کے کہیں ایسے معنی نہیں لیئے ہیں جن کا مجھے خود سچے دل سے یقین نہو - اگرچہ اس میں بھی میں نے اپنے مقدور بھر یہ کوشش کی ہے کہ میری راے مذہب جمہور کے خلاف نہ ہو - تاہم چونکہ اختلاف آرا ایک ناگزیر چیز ہے - اسلیئے ممکن ہے کہ بعض اصحاب کو میرے خیالات سے اتفاق نہو - ان سے میں باادب یہی عرض کر سکتا ہوں کہ میری سمجھ میں یونہی آیا - ممکن ہے کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہو - کیونکہ میں انسان ہوں اور اپنے قصور علم و فہم کا پہلے ہی اقرار کر چکا ہوں - البتہ میں اپنی غلط فہمیوں کو اتنا اہم اور وقیع نہیں سمجھتا کہ ان اصحاب کو یہ تکلیف دوں کہ وہ مجھے میری لغزشوں سے آگاہ کردیں - لیکن اگر کوئی صاحب ازراہ کرم ایسی مہربانی کریں تو وہ مادام الحیات میری دلی شکر گزاری کے مستحق ہوں اس سے زیادہ مجھے اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی - وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ -

آخر میں مجھے اس رسالہ مختصرہ کی بابت اتنا اور کہنا ہے کہ چونکہ میں ذات باری تعالےٰ کے ثبوت میں جس قدر عقلی دلائل پیش کر سکتا تھا۔ وہ سب "اثبات واجب الوجود" میں لکھ چکا ہوں۔ اور یہ کتاب اسی کا دوسرا حصہ سمجھنا چاہیئے اسلئے میں نے اس بحث کو تحصیل حاصل سمجھکر یہاں نہیں دہرایا۔ اس میں میں نے صرف اسلام کی ان مخصوص باتوں کو لینے کی کوشش کی ہے جس میں اوسکی تعلیم دیگر ادیان عالم سے امتیاز رکھتی ہے اسی وجہ سے میں نے اس عام اخلاقی تعلیم پر بھی بحث نہیں کی۔ کیونکہ اخلاقی صفات حسنہ کی تاکید دنیا کے کم و بیش سارے بڑے بڑے مذہبوں میں پائی جاتی ہے۔ اور اسلام میں بھی اس کا ہونا مسلم ہے۔ غیر مذہبوں پر میں نے حتی الامکان اعتراض کرنے سے احتراز کیا ہے اور اگر کہیں ان کے مسائل کا ذکر کیا بھی ہے تو وہ صرف عقائد اسلام سے ان کا فرق دکھانے اور مقابلہ کرنے کے لئے۔ میں نے حتی المقدور ان مختلف فیہ مسائل کو بھی لیا ہے جن پر آجکل جدید و قدیم تعلیم کا معارضہ ہے۔ اور بقدر امکان ان اعتراضات کے بھی معقول جواب دئے ہیں جو معیان فلسفہ و سائنس کی طرف سے عقائد اسلام پر کیئے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں میں نے دلائل نقلی سے بہت کم استدلال کیا ہے۔ اور کلام پاک کی آیات اور بارگاہ رسالت کی ہدایات جہاں کہیں درج کی ہیں وہاں ان سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ میرا خود ساختہ اعتقاد یا تعلیم و تہذیب جدید کا پرتو نہیں ہے۔ بلکہ وہ اسلام کی

قانون مین نہ کوئی رورعایت ہے نہ کسی کی حق تلفی - صرف ایک حق پرستی شرط ہے اور کچھ نہیں - آجکل ہمکو تو یہ بات نہایت ہی بدیہی اور ظاہری معلوم ہوتی ہے - اور اب تو روشن خیال اور آزاد منش اہل سائنس وفلسفہ اس بات کے بڑے زور سے دعویدار ہیں کہ مذہبی معاملات میں بالکل آزادی ہونی چاہیئے مگر کوئی یہ بتائے کہ یہ تعلیم ہے کس کی؟ اور یہ روشن خیالی اُنھوں نے سیکھی کہاں سے؟ کیا دنیا بھر کا کوئی اور مذہب ایسی منصفانہ تعلیم کا دعویٰ کرسکتا ہے اور کیا کسی قوم کی تاریخ یہ شہادت دیسکتی ہے کہ اس میں اب سے تیرہ سو برس پہلے ایسی آزاد خیالی اور بے تعصبی کا نشان بھی تھا - ابھی تو ازمنۂ وسطےٰ کی آگ کو ٹھنڈا ہوئے اور محکمۂ احتساب کو ٹوٹے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا لاکھوں بیگناہ اسی تعصب کی آگ میں زندہ جلا دیئے گئے اور ہزاروں خاندان اسی مذہبی ہمدردی کی تلوار کی بھینٹ چڑھ گئے - فلسفے کی تاریخ کا ہر ایک صفحہ ایسے ہی خون ناحق کے چھینٹوں سے رنگین ہورہا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اگر اسلام کی بے تعصبی اور آزاد خیالی یونان کی مٹی ہوئی حکمت اور فلسفے کو دوبارہ زندہ نہ کرتی تو آج یورپ کا یہ عروج اور سائنس کی یہ ترقی نہ ہوتی جسپر وہ ہمہ دانی اور ہمہ گیری کے مدعی بنے ہوئے ہیں - اگر انصاف کیا جائے تو وہ بے تعصبی اور آزادی خیالات جسپر آج کل کی ترقی یافتہ قومیں اور تعلیم یافتہ جماعتیں ناز کررہی ہیں اور جس کی حقیقت کو فلسفے اور سائنس نے بہ مشکل اب سمجھا ہے وہ سب کچھ

تمہید

دنیا میں ہزاروں مذہب پیدا ہوئے بہت سے مٹ گئے اور ایسے مٹے کہ انکا نام و نشان تک نہیں رہا بہت سے پھلے پھولے اور ایسے پھیلے کہ انکے معتقدین کی تعداد اب بھی لاکھوں کروروں تک ہے۔ اور جو مذہب آیا وہ اپنے نئے نئے اصول و قواعد۔ اپنے الگ الگ ارکان و عقائد ساتھ لایا۔ مگر اس ایک دعوے میں ہمیشہ سب متفق اللفظ رہے کہ دنیا میں صرف ہم ہی ایک سچے ہیں اور سارے مذہب جھوٹے اور لچر ہیں۔ فقط ہمارے ہی پیرو رحمت ازلی اور نجات ابدی کے مستحق ہیں باقی تمام آدمی عذاب مقیم اور سزاے جاوید کے سزاوار ہیں ۱؎ وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ ط

لیکن یہ اسلام ہی کی شان تھی کہ جب آیا تو رحمتہ للعالمین بنکر آیا اور ساری دنیا کے لئے یہ جان بخش نوید لایا کہ ۲؎ بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ اور آتے ہی یہ اعلان عام کر دیا کہ ۳؎ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ اس حاوی اور عادلانہ

ترجمہ ۱؎ یہودی کہتے ہیں کہ نصرانی دعوی بے بنیاد ہے اور نصاری کہتے ہیں کہ یہودی قول لغو ہے۔

۲؎ بیشک جسنے اپنا منہ اللہ کی طرف پھیرا اور وہ ایمان والا ہوا۔ پس اس کا صلہ اللہ کے ذمے ہے

۳؎ جس کسی نے ایک ذرہ برابر بھلائی کی وہ اسے دیکھ لیگا اور جس کسی نے ذرہ بھر برائی کی وہ اسے دیکھ لیگا

کھکر ساکت ہو گئے۔ لیکن فی الواقع یہ وہی مقام عجز و قصور ہے جہاں معلم حقیقی نے ملائکہ کی زبانی یہ کہلوایا ہے کہ ۵؎ سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ؕ یعنی ایک حد تک ہمکو حقایق و ماہیت اشیا جاننے کی قابلیت عطا کی گئی ہے لیکن اس عقل ناقص اور علم قلیل سے اس مبداء اصلی کی ذات و صفات پر محیط ہونا عقلاً محال اور ناممکن ہے۔ اہل فلسفہ اور سائنس کو بھی آخر اپنی بے انتہا سعی و کوشش کے بعد بادل ناخواستہ جبراً و قہراً اپنی لاادریت اور ہیچمدانی کا اعتراف کرنا پڑا اور ہزار ہا سال کی تگ و دو اور سیکڑوں بھول بھلیوں میں ٹھوکریں کھانے کے بعد آخر وہ اس عقدہ لاینحل پر پہنچے اور پہنچکر ششدر رہگئے جسے اسلام نے ایک بات سے حل کر دیا تھا۔ بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنی کوتاہی فہم کے اعتراف میں بھی اپنے غرور عقل کو ملائے رکھا اور یہی غرور ان کے لئے حجاب اکبر بن گیا۔ بیدل نے خوب کہا ہے ؎

غرۂ دانش نہ گردی از فسون لفظ چند	ای زمعنی بیخبر علم حقائق دیگر است

اس طرح سائنس نے فوق الفطرت باتوں کی تردید کر کے دیوتاؤں کی معبودیت اور پیغمبروں کی الوہیت کا دعوی غلط کر دیا۔ اس کے مقابلہ میں دیکھیئے تو اسلام کے مخبر صادق ذوحی فداہٗ کا دعوی بشریت کتنا سچا اور دلربا معلوم ہوتا ہے۔ اسنے نہ مال و منال کی خواہش کی نہ جاہ و جلال کی

ترجمہ ۵؎ - تو پاک ہے۔ ہم کچھ نہیں جانتے بجز اسکے جو تو نے ہم کو بتایا ہے۔ بیشک تو ہی جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

اسی آفتاب عالمتاب کا پرتو ہے جو ساڑھے تیرہ سو برس پہلے غار حرا سے طلوع ہوا تھا اور جسکی شان یہ تھی کہ [51] جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا - اسے بھی جانے دیجئے اور یہ دیکھئے کہ اس میں سادگی کس قدر ہے نہ اس میں تثلیث کا لاینحل معمی ہے - نہ اس میں بے شمار دیوتاؤں اور معبودوں کی بھول بھلیاں ہے - نہ اسنے اپنے بانی کے لئے کوئی انوکھا اور غیر معمولی دعوی کیا ہے - نہ اسنے معجزوں اور شعبدوں پر اپنا مدار رکھا ہے - اس کا اصل اصول صرف یہ ہے کہ [52] وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ - (پارہ ۲ رکوع ۱۹) اور اسکے مخبر صادق کا دعوی فقط اتنا ہے کہ [53] إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ

آج فلسفہ فوق الفطرت باتوں کا انکار کرتا ہے اور خلاف عادت واقعات کو باطل سمجھتا ہے - مگر دیکھئیے کہ سائنس کے اس دعوی سے کس کی تائید اور کس کی تردید ہوتی ہے سائنس نے واقعات کائنات کو ایک سلک انتظام میں منسلک کیا اور یوں ان بیشمار دیوتاؤں کا وجود مٹ گیا جو ہر ایک قدرتی قوت میں کارفرما مانے گئے تھے اور ان کی جگہہ ایک قادر مطلق کا وجود قابل تسلیم ہو گیا - اور اگرچہ یہاں پہنچکر اہل فلسفہ کی آنکھیں اس نور مجسم سے خیرہ ہو گئیں اور وہ صرف لا ادری

ترجمہ [51] - سچ آیا اور جھوٹ مٹ گیا - بیشک جھوٹ مٹنے ہی والا تھا -

[52] - اور تمہارا معبود ایک ہی - اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور وہ بڑا مہربان اور بخشنے والا ہے

[53] - کہ بیشک میں بھی تمہاری طرح آدمی ہی ہوں - مجھ پر یہ وحی ہوئی ہے کہ تمہارا اللہ ایک ہے -

مذہبی کتابوں سے ان باتوں کا ثبوت دیں یا اپنی آغاز اسلام سے پہلے کی تاریخ میں ان کے عملاً موجود ہونے کی شہادت بہم پہنچائیں ان اصولی عقیدوں کو چھوڑ دیجئے۔ اور روزمرہ کی معمولی معمولی باتوں کو لیجئے۔ کیا عبادت کے لئے بلانے کے واسطے اذان سے بہتر کوئی صورت ہو سکتی ہے؟ کوئی ملحد بھی نہیں کہہ سکتا کہ ناقوس کا بے معنے شور اللہ اکبر اور حی الصلوٰۃ کی دلکش صدا کے مقابلے میں زیادہ دلچسپ ہے کیا کسی تمدن اور کسی قوم نے السلام علیکم سے زیادہ موزوں اور پر معنی خطاب ابتدائے مکالمت کے لئے وضع کیا ہے۔ سلام کا منشاء یہ ہے کہ دو ملنے والوں میں گفتگو کی ابتدا ہو جائے اور دونوں میں موانست اور محبت کا اظہار ہو۔ خیال کیجئے کہ ایک ملنے والا دوسرے کو اس سے زیادہ اور کیا دعا دے سکتا ہے۔ اس کے سامنے گڈ مارننگ اور گڈ ایوننگ کیسے مہمل اور لغو سلام معلوم ہوتے ہیں۔ غور کیجئے ایک شخص دوسرے سے ملتا ہے اور یوں کہکر گفتگو شروع کرتا ہے کہ "بڑی اچھی صبح ہے" یا "شام بہت اچھی ہے" آخر کوئی پوچھے کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ اس سے تو عرب جاہلیت کا سلام صبحک اللہ بالخیر ہی اچھا تھا کہ قائل کے قول کا مخاطب سے کچھ تعلق تو ہوتا تھا۔ شہنشاہ اکبر نے بڑی کوشش سے السلام علیکم اور وعلیکم السلام کی جگہہ "اللہ اکبر" اور "جل جلالہ" کو رواج دیا گو یہ کلمے بجائے خود نہایت بامعنے اور قابل احترام ہیں اور ان کو جو عزت اسلام نے دی ہے اس سے زیادہ اکبر کیا دیسکتا تھا۔

ہوس کی نہ ملک و دولت کو پسند کیا نہ شان و شوکت چاہی نہ فرشتہ
ہونیکا دعویٰ کیا نہ کلیم اور خلیل ہونے پر ناز کیا تھا تو صرف یہ کہا "کہ بندہ
بھی ہوں اس کا اور ایلچی بھی" کیا جو مذہب اسنے دنیا کے سامنے پیش
کیا وہ اپنی سادگی اور اعتدال پسندی کے لحاظ سے بہترین مذاہب نہ تھا
کیا وہ اپنی حکمت تامہ کی رو سے تمام فلسفے اور سائنس کا لب لباب تھا
بس کیا یہ کہنا کچھ بے جا ہے کہ ۵

مٹے کہ ناکردہ قرآں درست	کتبخانۂ ہفت ملت بشست

اس سے بھی قطع نظر کیجئے اور دیکھئے کہ اسلام نے مذہب کے اعمال کو
کس طرح معاملات زندگی سے وابستہ کیا ہے اور دین و دنیا کو کیسا ایک
دوسرے سے جکڑا ہے۔ اسکے اصول کے مطابق وہ افعال بھی جنکو اور
مذہبوں نے روحانی ترقی کا بالکل منافی ٹھہرایا ہے عین عبادت بن سکتے
ہیں۔ کیونکہ اسنے خدا کا تعلق دل سے رکھا ہے ہاتھ پاؤں سے نہیں
رکھا۔ اسنے بندوں کے حقوق کو اللہ کے حقوق پر مقدم
اور حسن معاشرت کو کثرت اطاعت پر مرجح کیا ہے یہ سچ ہے کہ اب
اور مذہب بھی اس ڈھنگ پر آنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر کب؟
جبکہ عقل سلیم نے جو اسلام کے نور سے روشن ہوئی ہے ان کی اصولی
غلطیاں ظاہر کر دی ہیں۔ اور جبکہ سائنس اور فلسفے نے جنکی چھان بین
سے کوئی فعل انسانی محفوظ نہیں ہے انکے عقائد کو ایک بے معنی پہیلی
ثابت کر دیا ہے۔ ہم تو انکے دعووں کو تب ہی مانینگے جب وہ اپنی پرانی

چھینک پر الحمد للہ کہنا کتنا مناسب اور پسندیدہ معلوم ہوتا ہے۔ طبی مسئلہ ہے کہ چھینک وہ طبعی حرکت ہے جو دماغ کی رطوبت زائد کو خارج کرنیکے لئے واقع ہوتی ہے - اور یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ چھینک کے بعد دماغ کیسا ہلکا اور طبیعت کیسی صاف معلوم ہوتی ہے۔ بانیٔ اسلام صلعم کی حکمت لدنی نے اس راز کو سمجھکر اس پر الحمد للہ کہنے کی ہدایت کی - اور سننے والیکو اس کے جواب میں یرحمک اللہ کہنے کا ارشاد فرمایا ہے - یہ ذرا ذرا سی باتیں ہیں اور وہ ظاہر پرست فلسفی جو دنیا کو دین سے اور مذہب کو معاملات سے بالکل الگ سمجھتے ہیں - شائد اس پر ہنسیں اور کہیں کہ ان باتوں کا مذہب سے تعلق ہی کیا ہے؟ لیکن اصل یہ ہے کہ وہ سرے سے مذہب کا مفہوم ہی نہیں سمجھے مذہب کسی قومی اور توانا طاقت کو رام کرنے یا کسی زبردست اور لاپروا دیوتا کو رجھانے کے منتروں اور افسونوں کا نام نہیں ہے - بلکہ یہ اس طرز معاشرت اور اصول معاملت کا نام ہے جس سے ہم اپنے ابنائے نوع کے ساتھ مل جل کر آرام و آسائش سے زندگی بسر کرسکتے ہیں اور جس سے ہمکو وہ روحانی ترقی حاصل ہوسکتی ہے جو ہماری حیات دنیوی کا اصل منشا ہے اسلیئے ظاہر ہے کہ جب تک مذہب کا تعلق ہماری روزمرہ کی زندگی کے ہر ایک کام سے نہو گا - تب تک وہ اپنے اس حقیقی مدعا کو پورا نہیں کرسکتا یہی وجہ ہے کہ اسلام کسی مقررہ طریقہ عبادت اور ترتیل اوراد کا نام نہیں ہے بلکہ اسکا اثر پیدا ہونے سے مرنے تک سوتے جاگتے اُٹھتے بیٹھتے غرض ہر وقت

لیکن سلام کی بجائے تو ان کا استعمال بالکل بیہودہ ہی تھا۔ کیونکہ انسے قائل اور مخاطب کے حق میں نہ کوئی دعائے خیر نکلتی ہے نہ انکی باہمی محبت اور ملاقات کا اظہار ہوتا ہے اور اکبر نے توسرے سے ان کلمات کو انکے معنی کی خوبی کے اعتبار سے نہیں بلکہ اپنے نام اور لقب کے ساتھ مناسبت لفظی کے لحاظ سے پسند کیا تھا۔ ہمارے نزدیک ہندوستان کے مروجہ الفاظ بندگی۔ آداب۔ تسلیم۔ کورنش وغیرہ بھی ایسے ہی لغو اور مہمل ہیں اور عرب کے آزاد اور بے باک شاہانہ سلام ابیت اللعنہ[ا] کے مقابلے میں تو یہاں والوں کی بے حد پستی اور خوشامد پرستی پر دال ہیں مگر خیر اس سے ہمیں بحث نہیں۔

پھر اسلام کی اس رعایت حقوق کو دیکھیے کہ بوقت ملاقات السلام علیکم کہنا تو سنت ہے مگر اس کے جواب میں وعلیکم السلام کہنا فرض ہے اور ہدایت یہ کی گئی ہے کہ اس کے ساتھ "ورحمتہ اللہ وبرکاتہ" کی دعائے خیر اور بڑھا دی جائے ارشاد پاک ہے[۲] وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا اَوْ رُدُّوْهَا (ربع پ۵)

یہ رعایت حقوق اور ایثار اسلام نے ان ذرا ذرا سی باتوں سے لیکر دنیا کے اہم ترین معاملات میں یکساں مدنظر رکھا ہے۔

[ا] ۔ عرب جاہلیت میں بادشاہوں اور رئیسوں کو سلام کی بجائے اس فقرے سے مخاطب کرتے تھے کہ اس کے معنے ہیں تو قابل لعنت افعال سے بچے۔

ترجمہ [۲] ۔ اور جب تم کو کوئی سلام کیا جائے تو اس سے بہتر سلام کا جواب دو یا کم سے کم اتنا ہی جواب دو۔

تسلیم کیا کہ اپنے استاد کا شکریہ تک ادا کرنا بھول گئے اور ان باتوں کو
خود اپنی طرف سے پیش کرنے لگے۔ لیکن یہاں میں پوچھتا ہوں کہ اسلام
سے پہلے اِن میں یہ باتیں کہاں تھیں۔ حقیقت میں یہ امر اسلام کے
عین فطرت ہونے کی ایک اور بہت بڑی دلیل ہے۔ کیونکہ اس سے
ثابت ہوتا ہے کہ اسنے جو بات کہی وہ فطرت انسان کے اتنے مطابق
کہی کہ ہر شخص یہی سمجھنے لگا کہ یہ بات تو وہ ہمیشہ سے جانتا تھا۔ یہ ایک
عام بات ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم کوئی بات بھول جاتے ہیں اور
جب کوئی اور ہمیں وہ بات یاد دلا دیتا ہے تو ہمکو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہم
کبھی اسے بھولے ہی نہ تھے اور اسکی وجہ یہی ہوتی ہے کہ وہ بات حافظہ میں
محفوظ تو ہوتی ہے مگر کسی وجہ سے اسپر ایک طرح کا پردہ سا پڑ جاتا ہے
اور اس پردے کے اُٹھتے ہی یہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ جیسے وہ بات
ہمکو ہمیشہ سے یاد تھی۔ بعینہ یہ ہی کیفیت اسلام کے پیش کردہ اصول
کی بھی ہے کہ اب ساری دنیا انہی باتوں کو مانتی ہے۔ اور خوبی یہ ہے
کہ اسلام کی طرف سے نہیں بلکہ اپنی جانب سے ان کو پیش کرتی ہے۔
خیر یہ تو ایک سرسری اور اجمالی بحث تھی۔ آیندہ صفحات میں ہم اسلام
کے مختلف عقاید و اعمال کو الگ الگ لیکر دیکھیں گے کہ اسلام کیلئے
فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (۲۱-ع ۴) کا دعوی کہاں تک صحیح ہے ہمیں اس
بات کی ضرورت نہیں کہ ہم خواہ مخواہ کھینچ تان کر عقائد اسلام کو اصول
سائنس پر منطبق کریں۔ کیونکہ سائنس بہرحال ایک تغیر پذیر چیز ہے

اور ہر حال میں ہم پر کارگر رہتا ہے - ہمکو تو اور کوئی مذہب ایسا نہیں معلوم
ہوتا کہ جو یوں اپنے معتقدین کے ہر ایک کام میں ساری ہو - اور پھر بھی
نہ وہ ترک لذات کی تعلیم دے نہ ادائے وظائف بشریت میں مانع ہو۔
یہ اعتدال حقیقی جسے اسلام نے صراط مستقیم ٹھہرایا ہے اس مذہب
میں ہے جس نے ہر بات میں افراط تفریط کو اس خوبصورتی سے بچایا ہے
کہ غور کرنے والے کی عقل محو حیرت ہو جاتی ہے - طب اب خدا خدا کر کے
اس اصول تک پہنچی ہے کہ صحت جسمانی تب تک ممکن نہیں جب تک کہ
ہر ایک عضو بدن اپنے فرائض معینہ کو پورا نہ کرے - اگر کسی وجہ سے
کوئی عضو بھی بیکار رہا تو اس کا مضر اثر تمام جسم پر اور پھر جسم سے گزر کر
دل و دماغ پر پڑے گا - لیکن اسلام نے ایک رہبانیت کی ممانعت
کرنے سے یہ تمام مدعا حاصل کر لیا - اور اس کا دامن روما کی ویسٹل[ط] کنواریوں
مسیحت کے راہبوں اور ننوں اور ہندوستان کے جوگیوں اور سادہوؤں
کی دردناک اور خلاف فطرت ریاضیات شاقہ کے دھبوں سے
پاک رہا - اگر وہ مذہب بھی اس راز کو جانتے ہوتے یا فلسفہ اسے
سمجھتا اور سمجھا سکتا تو ہزاروں برس تک یہ باتیں کیوں ہوتیں - ہمار
اسلام نے ان بھیدوں کو کھول دیا - تو رفتہ رفتہ سب کی آنکھیں
کھل گئیں اور اونھوں نے ان اصولوں کو تسلیم کیا اور ایسا دل لجاں

ط ویسٹا روم قدیم کی ایک بہت بڑی دیبی تھی جسکے مندر پر ہمیشہ آگ جلتی رہتی تھی
اور اسکی حفاظت چھ عورتوں کے سپرد ہوتی تھی - جو عمر بھر با عصمت اور ناکتخدا رہنے کی قسم
کھاتی تھیں -

وہی معیار عقل اور میزان قیاس کے مطابق موزوں اور مناسب معلوم ہوتی ہے۔ صرف چشم حق بیں اور دل حق پسند چاہیے ۵

سر از حجاب تعصب اگر بروں آید — چہ جلوہ ہا کہ در اسلام می تواں کردن

اور مسائل اسلام کو ہم ہمیشہ کے لئے سچا اور صحیح سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر ہم اسلام کو فطرت انسان کے مطابق ثابت کر سکیں تو یقیناً سائنس کو خود بخود اسکی صداقت تسلیم کرنی پڑے گی کیونکہ سائنس فقط انسان کے دریافت کردہ قواعد قدرت و قوانین فطرت کا نام ہے۔

ان قوانین قدرت کو لیجئے۔ کسی مذہب نے انکی طرف اشارہ بھی کیا ؟ لیکن سچ تو یہ ہے کہ ان مذاہب کے ایسے عجائب پرست لوگ ان کی اہمیت اور ناقابل تغیر ہونے کی صفت کو سمجھ ہی کیا سکتے تھے جو ہر ایک ولی کی بوسیدہ ہڈیوں سے کسی خلاف عادت شعبدے کے طالب ہوتے تھے۔ اور ہر ایک بے معنی فقرے کو فوق الفطرت طاقتوں کے مطیع کرنے کا راز سمجھتے تھے۔ خود سائنس کو ان قانونوں کے اٹل اور انمنٹ ہونے کا علم کب اور کتنی مشکل سے ہوا اور فطرت کے نہایت ہی عام اور ابتدائی اصول اسنے کیسی ردوکد اور جانکاہی اور خونریزی کے بعد تحقیق کئے۔ حالانکہ اسلام نے شروع ہی سے پکار پکار کر کھدیا تھا کہ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا اور بہ آواز بلند اعلان کر دیا تھا کہ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ کوئی بتائے کہ سنت اللہ اور خلق اللہ اگر قوانین قدرت اور اصول فطرت ہی کا دوسرا اور زیادہ صحیح اور موزوں نام نہیں ہے تو کیا ہے ؟ سائینس اگر کر سکے تو اپنے قانون کا کوئی اور بتانے والا تجویز کر دے۔

غرض اول سے آخر تک اسلام کی جس بات پر غور کیا جائے

چاند - سورج - تارے - آگ - بجلی - پانی - ہوا - دریا - پہاڑ - جانور
درخت - غرض سب کچھ نعوذ باللہ خدا بن گئے اور اشرف المخلوقات
انسان نے گتے - بلی - سانپ اور چھپکلی جیسے حقیر اور ناپاک جانوروں
کے سامنے سر نیاز جھکا دیا - بہت سی قوموں نے ایک حاکم اور قادر
قوت کو تو مانا - مگر اوسکے پہچاننے میں غلطی کی - اہل روم و یونان نے
مشتری کو خدا سمجھا - اہل عرب نے چاند سورج اور تاروں کو خالق جانا -
بہت سی قوموں نے خدا کو بھی مانا مگر اس کے ساتھ انتظام عالم میں
اور بہت سے چھوٹے چھوٹے معبودوں کو بھی شریک خیال کیا - یہود
اور نصاری اس درجے سے بھی آگے بڑھے اور انکے مذہبوں نے انکو
خدائے واحد کے ماننے کی تعلیم دی مگر ان کے ظرف اس عظیم الشان تصور
کے متحمل نہ ہو سکے اور اونہوں نے اپنے پیغمبروں کو بھی اس ذات
بے ہمتا کا شریک سمجھا[۵] وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى
الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ اصل بات یہ تھی کہ وہ اپنی روحانی ترقی میں اس درجے تک پہنچے
ہی نہ تھے کہ ذات باری کے بے مثل و بے ہمتا ہونے کو سمجھ سکتے - انہوں
نے خدا کو ایک بہت بڑا اور اعلی درجے کا انسان تصور کیا اور اسے
تمام صفات انسانی سے متصف سمجھا - اس لئے انکے نزدیک اسکے
بیٹا بیٹی ہونا - یا اس کا برای العین نظر آنا کچھ دشوار اور خلاف قیاس
نہیں تھا حالانکہ یہ ان کی نہایت سخت غلطی تھی اور اسکی نسبت کلام
پاک نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ نہایت ہی بجا اور درست ہے -

---

۵ - اور یہود عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائیوں نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے -

حصۂ اوّل عقائد

توحید

عقائد اسلام میں سب سے زیادہ اہم بلکہ فی الواقع اسلام کا اصل اصول عقیدۂ توحید ہے۔ اس عقیدے سے اسلام کو وہ شان امتیاز حاصل ہے جو اور کسی مذہب میں نہیں۔ صرف اس ایک بات کو ہی اسلام نے تمام عقائد کا ماحصل اور نجات ابدی کا ذریعہ ٹھیرایا ہے۔ اسلام کا سچا وعدہ ہے کہ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَقَدْ دَخَلَ الْجَنَّةَ[۵۱] یہ درست ہے کہ ایک ذات واجب الوجود کا کچھ دھندلا سا تصور آغاز اسلام سے بہت پہلے مختلف ادیان عالم میں موجود تھا۔ مگر تمام قوموں میں اس تصور کے ساتھ اس کی ذات وصفات میں اتنا شرک کیا جاتا تھا کہ یہ اعتقاد ان مذہبوں کے لئے موجب فخر ہونے کی جگہ باعث ننگ بن گیا۔ اکثر لوگ تو اپنے مقامی اور قومی بتوں کی پرستش میں اتنے منہمک رہتے تھے کہ ان کو ایک خالق کل کا خیال ہی نہ آتا تھا۔ یہ لوگ ہر ایک قدرتی طاقت اور ہر ایک غیر معمولی واقعے کو کسی جداگانہ دیوتا کا مظہر سمجھتے تھے اور اونکو جس وقت جس قسم کی ضرورت پیش آتی تھی تو اس کے مناسب حال معبود کو منانے کی کوشش کرتے تھے۔ اسی کثرت پرستی کا نتیجہ تھا کہ آسمان اور زمین کی ہر ایک چھوٹی بڑی چیز

۵۱۔ جس نے کہا کہ ایک اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ جنت میں داخل ہو گیا۔

ایما اور منشا کا نتیجہ ہے جو کچھ ہوتا ہے اسی کے حکم اور ارادے سے ہوتا ہے اور وہ جو کچھ کرتا ہے اپنی حکمت اور مصلحت کے مطابق کرتا ہے وہ اس وقت تھا جبکہ یہ کچھ نہ تھا۔ اور اس وقت ہوگا جبکہ یہ کچھ نہو گا نہ وہ وقت میں مقید ہے نہ جگہہ میں محدود ہے۔ وہ خیر محض ہے اور کوئی بُرائی اس سے ظہور پذیر نہیں ہو سکتی۔ وہ قادر مطلق ہے اور کوئی شئے اُسکی نافرمانی نہیں کر سکتی وہ متصف ہے ان تمام بے شمار صفات حسنہ سے جنکو ہم جانتے ہیں اور جنکو ہم نہیں جانتے اور ہم اسکے متعلق نہایت ہی عجز و ادب سے صرف یہی عرض کر سکتے ہیں کہ سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم[۵۵] لیکن ہاں ہمارا یہ بھی اعتقاد ہے کہ وہ ایک ذات ہے۔ محض قوت نہیں ہے فعّال لما یرید ہے بیحس و بے ارادہ قانون نہیں ہے۔ وہ اصول جنکو سائنس نے قوانین قدرت کا لقب دیا ہے۔ ہمارے نزدیک صرف ان اشاروں کا نام ہے جو اس ذات واجب الوجود نے ہماری رہبری کے لئے اپنے طرز عمل کے متعلق ظاہر کئے ہیں اس لئے وہ ان قانونوں پر حاوی اور مسلط ہے ان کا پابند نہیں۔ بلکہ فی الواقع یہ کہنا بھی درست نہیں ہے۔ کیونکہ قانون تو اسی کے ارادے اور حکم کا نام ہے اور کچھ نہیں جو کچھ وہ چاہتا ہے وہی ہو جاتا ہے اور جس طرح وہ چاہتا ہے وہی قانون بن جاتا ہے۔

لیکن اس سے کیا فائدہ اگر میں عمر بھر لکھتا رہوں تب بھی اس غیر محدود ذات کا کوئی تصور نہ خود کر سکتا ہوں نہ کسی دوسرے کو سمجھا سکتا ہوں

[۵۵] ترجمہ۔ تو پاک ہے ہم کچھہ نہیں جانتے بجز اس کے جو تو نے ہم کو سکھایا ہے بیشک تو جاننے والا حکمت والا ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۔ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ۔ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۔ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۔ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ۔ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۔

یہی سبب تھا کہ کبھی وہ کہتے تھے کہ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً اور کبھی یہ دعوے کرتے تھے کہ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ۔ بزعم خود تو وہ بھی اپنے آپ کو موحد اور خدا پرست سمجھتے ہی ہیں مگر اب اسلام کی تعلیم کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات حقیقت میں حقیقت سے کتنی دور ہے ۔ اور ذات باری تعالیٰ انکے وہم و گمان سے کتنی بلند ہے ۔ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۔

اب دیکھیے کہ اسلام نے اس مسئلہ میں کیا کہا ہے ۔ اسلام کی تعلیم کے مطابق اللہ جل شانہ کی ذات ایسی واحد مطلق ہے کہ اسکے اسما و صفات تک شائبہ شرک سے پاک ہیں نہ اوسکی کوئی ابتدا ہے نہ کوئی انتہا ہے نہ وہ کسی کی اولاد ہے نہ کسی کا والد ہے نہ کوئی اسکی نظیر ہے نہ کوئی اس کا شریک ہے وہی تمام چیزوں کو اپنی قدرت کاملہ سے عدم سے وجود میں لایا ہے اور وہ ہی ان سب کو جب چاہے گا ہست سے نیست کر دیگا نہ وہ انتظام کائنات میں کسی کی مدد کا محتاج ہے نہ نظام عالم کے بنانے اور بگاڑنے میں اسے کسی کی اعانت کی ضرورت ہے ۔ حتیٰ کہ اسے خود بھی کچھ کام کرنے کی ضرورت نہیں ۔ کیونکہ سارا جہان محض اسکے

۵۳ ۔ ہم اللہ کی اولاد اور اسکے رشتہ دار ہیں ۔

اور آفتاب پرست قومیں اصولاً ان چیزوں کو مظہر انوار الٰہی سمجھتی ہیں اور ان کی عبادت کو بالواسطہ خدائے واحد کی عبادت ہی کہتی ہیں مگر دیکھیے عملاً ان کے عوام کا کیا عقیدہ ہے وہ سب آگ اور سورج ہی کو اپنا معبود خیال کرتے ہیں۔ اور انہی سے دستگیری اور حاجت روائی کی خواہش کرتے ہیں۔ مگر یہ اشتراک شانِ توحید کے کہاں شایاں ہے۔ غالب نے خوب کہا ہے ؎

رند ہزار شیوہ را طاعتِ حق گراں نبود	لیک صنم بسجدہ در ناصیہ مشترک نخواست

البتہ ایسے عالمگیر مذہب کی مختلف قوموں کے باہمی اتحاد کے لئے کسی ظاہری شعارِ مشترک کی بھی نہایت سخت ضرورت تھی اس مصلحت سے اسلام نے حرمِ محترم کو جو تاریخی زمانے کی ابتدا سے مقدس سمجھا جاتا تھا۔ اپنے معتقدین کے لئے نماز کا قبلہ اور حج کا مرکز بنا دیا ہے۔ تاکہ ان سب مسلمان اقوام عالم میں ایک اتحاد و اشتراک پیدا ہو جائے۔ مگر اسکے ساتھ ہی ساتھ صاف صاف یوں بھی کہہ دیا کہ۔ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ الخ[۱] اور یہ بھی اعلان کر دیا کہ اَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ۔[۲] اس لئے اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ؎

مقصود ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست	ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

شائبہ شرک سے بچنے میں اس سے زیادہ احتیاط اور کیا ہوگی۔ کہ خدا کے لئے جمع تعظیمی کا صیغہ تک بھی استعمال نہیں کیا جاتا۔

لیکن جب ان تمام باتوں کے باوجود بھی ہم دیکھتے ہیں کہ مخالفین مذاہب

[۱] مشرق اور مغرب کی طرف منہ پھیرنا کوئی نیکی نہیں ہے۔ بلکہ نیکی یہ ہے کہ اللہ اور روز قیامت کو مانا جائے۔ [۲] تم جدھر منہ کرو ادھر ہی اللہ ہے۔

بلکہ حقیقت میں اس کے تصور کی کوشش بھی تعلیم اسلام کے خلاف ہے
کیونکہ انسان محسوسات حواس ظاہری کے سوا اور کسی شئے کا تصور کر ہی
نہیں سکتا۔ اور خدا کا حواس ظاہری سے محسوس ہونا اسکی شان الوہیت
کے منافی ہے۔ اور ایسی کوشش آمیزش شرک سے مبرّا نہیں ہوسکتی
اسی مصلحت سے بانئے اسلام نے نماز جیسی عبادت میں بھی آنکھیں
بند کرنے کو منع فرمایا ہے۔ کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آدمی خدا کا تصور
کرے اور وہ تصور یقیناً زیادہ سے زیادہ ایک بڑے بادشاہ جلیل القدر
کا ہوسکتا ہے لیکن اول تو اس کو اس بادشاہ حقیقی سے کیا نسبت دوسرے
خدا کو بہ صورت انسان تصور کرنا بت پرستی کی ایک اعلیٰ صورت کے
سوا اور کیا ہے اور یہ دونوں باتیں ایسی تھیں۔ جنکو بانیٔ اسلام علیہ تحیتہ
والسلام کی حق پسند اور حق پرست طبیعت گوارا نہیں کرسکتی تھی۔ اس
ایک مثال سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اس مہلک غلطی سے کتنا صاف
بچا ہے جسے Anthropomorphism (انتھروپومارفزم۔ یعنی خدا
کا تصور بصورت انسان) کہتے ہیں اور جس سے ہر ایک مذہب اور ہر ایک
فلسفے نے ٹھوکر کھائی ہے۔ اور جس کی وجہ سے سائنس کو مذھب پر
ھنسنے کا موقع مل گیا ہے۔

اسی حکمت سے اسلام نے کسی چیز کو سامنے رکھکر عبادت کرنیکی
بھی اجازت نہیں دی یہاں تک کہ بت تراشی اور صورت نگاری تک
کی ممانعت فرما دی کیونکہ یہیں سے بت پرستی کی ابتدا ہوتی ہے آتش پرست

خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ وَعَلٰی سَمْعِہِمْ وَعَلٰٓی اَبْصَارِہِمْ غِشَاوَۃٌ[۹] حقیقت میں ایسے ناپاک اور مشرکانہ خیالات صرف انہی دماغوں میں پیدا ہو سکتے ہیں جنہوں نے تجسیمیت کے سوا اور کوئی سبق پڑھا ہی نہیں اور جن کی مادہ پرست طبیعتوں میں روحانی خیالات کو دخل ہی نہیں ہو الا کھ سمجھتے ہیں مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نے قرآن پاک کی کن آیات سے ایسے بیہودہ نتائج اخذ کئے ہیں اور اپنے کون سے بھائی بندوں پر مسلمان ہونے کا الزام لگایا ہے جو خدا کو کھوکھلا اور کچھ ٹھوس سمجھتے ہیں۔ معاذ اللہ کسی مسلمان کا تو یہ عقیدہ ہو نہیں سکتا اور نہ اللہ کی نسبت ایسا گمان کرنیوالے کو کوئی مسلمان مسلمان کہہ سکتا ہے یہ تو بلا شبہ درست ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی نسبت ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں کہ وہ دیکھتا اور سنتا ہے اسکے ہاتھ بقول کفار بندھے ہوئے نہیں ہیں۔ اسکی گرفت سخت ہے۔ وغیرہ۔ مگر کیا ان کے یہ معنے ہیں کہ نعوذ باللہ اللہ کی ہیل کی سی موٹی موٹی آنکھیں اور ہاتھی کے سے بڑے بڑے کان ہیں یا شکرے کے سے لمبے لمبے پنجے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص سمیع و بصیر وغیرہ کا یوں ترجمہ کرے تو وہ اپنی رسائی ذہن کو ظاہر کرے گا۔ مگر اس سے وہ اسلام کی پاک اور برگزیدہ تعلیم پر خاک نہیں ڈال سکتا[۱۰] یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاہِہِمْ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ (ربع ۱۱)

ترجمہ [۹] اللہ نے انکے دلوں اور کانوں پر بند لگا دئے ہیں اور انکی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں [۱۰] وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنی باتوں سے چھپائیں مگر اللہ اپنے نور کو پورا کرے گا۔ اگرچہ یہ بات کافروں کو ناپسند ہو۔

اسلام پر انتھروپومارفزم کا الزام لگانے سے باز نہیں آتے تو ہم اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ کہ تعصب نے انکی آنکھوں پر جہالت کی پٹی باندہی ہے صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ (وہ بہرے اور گونگے اور اندہے ہیں پس وہ باز نہ آئیں گے) اگر یہ غلط فہمی صرف عوام ہی میں ہوتی تب بھی کچھ کم تعجب خیز نہ ہوتی۔ لیکن عجیب بات تو یہ ہے کہ مدعیانِ علم تحقیق سب سے زیادہ اس غلطی میں مبتلا ہیں مشہور فاضل پروفیسر ڈریپر اپنی ایک مستند تصنیف میں قرآن مجید کے بابتہ لکھتا ہے "اس میں خدا کا تصور شخص بصورت انسان مجسم قرار دیا گیا ہے۔ وہ صرف ایک بہت بڑا شاندار آدمی ہے جو جنت میں رہتا ہے۔ اس لحاظ سے اگرچہ بعض آیات اس سے مستثنٰے بھی ہیں تاہم اول سے آخر تک تمام کلام مجید پڑھنے کے بعد قاری اس سے یہ اثر لیکر اٹھتا ہے۔ کہ اس سے اس کے دل میں نہایت ادنٰی درجے کے خیالات پیدا ہوگئے ہیں۔ اس سے یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ ایک مسلم فرقہ اس سے یہ مطلب نکالتا ہے کہ اللہ سر کی چوٹی سے سینہ تک ٹھوس اور سینہ کے نیچے کھوکھلا ہے۔ اس کے کالے گھونگروالے بال ہیں۔ اور وہ رات کے ہر ایک پہر سے پر شیر کی طرح گرجتا ہے۔"[۵]

نعوذ باللہ اس خرافات کو پڑھکر اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ

[۵] ماخوذ از ہسٹری آف انٹلکچوئیل ڈیویلپمنٹ آف یورپ مصنفہ پروفیسر ڈریپر جلد اول صفحہ ۳۲۲

غرک گئی نہ اسے مادے اور قوت کی اصلی حقیقت معلوم ہوئی نہ اس نے وقت اور جگہہ کا صحیح مفہوم سمجھا نہ اسکو زندگی کی ابتدا اور حیات کی ماہیت کا سراغ ملا۔ یہاں تک کہ وہ خود اپنے دماغ کی بہت سی مخفی طاقتوں اور پوشیدہ قابلیتوں کو جاننے سے بھی قاصر رہی اور اسے ان تمام مسئلوں کے جواب میں لا ادری کہکر ساکت ہونا پڑا۔

جب عقل کی نارسائی کی یہ حالت تھی تو کیونکر ممکن تھا کہ اس ذات عالی صفات کی کنہ کو پاتی جسکی شان یہ ہے کہ لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ[ف] اور جسکی قدرت کے کرشمے دیکھنے میں بھی دوربین کی تیز نظری خیرہ ہو جاتی ہے اور خوردبین کی ژرف نگاہی عاجز رہجاتی ہے۔ عرفی نے بالکل بجا کہا ہے ؎

حد کنہ تو بہ ادراک نہ شاید دانست	ویں سخن نیز بہ اندازۂ ادراک من است

لیکن بہرکیف اگرچہ فلسفہ اور سائنس اس ذات بیچوں کا عالم افروز جلوہ دیکھنے سے بے نصیب رہے۔ تاہم انہوں نے حقائق اشیاء اور نظام کائنات پر غور کر کے کچھ نتیجے نکالے ہیں۔ اور ان کا عقائد اسلام سے مقابلہ کرنا خالی از دلچسپی نہیں ہے۔

طبیعیات کا ایک نہایت ہی اہم اصول یہ ہے کہ بالطبع مادہ جب ساکن ہو تو بلا محرک حرکت نہیں کرتا اور اگر متحرک ہو تو بے مسکن ٹھیرتا نہیں اس خاصے کو انرشیا Inertia کہتے ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ مادے میں نہ ارادہ ہے نہ سمجھ اس لیے اس اصول کے مطابق لازم

ف ترجمہ۔ اسے آنکھیں نہیں پاتیں۔ اور وہ آنکھوں کو پالیتا ہے۔

اب دیکھیں کہ اس مسئلہ پر فلسفہ اور سائنس کیا کہتے ہیں اور وہ اپنی تمام چھان بین اور تگ و دو کے بعد کس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ مدتوں تک تو فلسفہ مادے اور قوت کی بھول بھلیوں ہی میں سرگرداں رہا۔ اور اس دنیا کو قدیم اور باقی سمجھتا رہا۔ پھر اس میں تغیر پیدا ہوا اور گو مادے اور قوت اب بھی ناقابل فنا سمجھے گئے مگر تحقیقات جدیدہ سے موجودہ نظام عالم کا حادث اور متغیر ہونا ثابت ہو گیا۔ اور ساتھ ہی اجسام مادی کی ماہیت اور صورت میں بھی بہت کچھ فرق ہو گیا۔ پہلے چار عنصر تھے پھر ستر بہتر ہو گئے۔ اسکے بعد پھر ان میں کمی بیشی ہونے لگی۔ اور انکی تعداد غیر معین رہی۔ اسی تجزی و تحلیل کی نئی نئی ترکیبوں نے وہ گرہیں کھولنی شروع کر دیں جن سے مختلف قسم کی چیزیں اپنی اپنی صورتوں پر قایم تھیں یہاں تک کہ آخر اکابر فلاسفہ کا یہ خیال ہو گیا کہ غالباً یہ تمام مادہ اور قوت اپنی گوناگونی اور رنگارنگی کے باوجود بھی ایک ہی حرکت کی مختلف کیفیتوں کا نام ہے۔ اس کے بعد سائنس نے سیاروں اور ستاروں کے مادے کی ماہیت معلوم کرنے کی کوشش کی اور تمام قیاسات عقلی سے یہی پایا گیا کہ مادہ ہر جگہ یکساں ہے اس عظیم الشان اتحاد کی تحقیق کے ساتھ ہی مسئلہ ارتقا نے آفتاب اور ماہتاب سے لیکر نباتات حیوانات اور انسان تک کی پیدائش کا راز حل کرنے کا دعویٰ کیا اور فلسفیوں نے اسے بہت پسند کیا۔ غرض یہ سب کچھ ہوا اور سچ یہ ہے کہ بہت کچھ ہوا۔ لیکن ایک حد معین تک پہنچکر عقل انسانی

کی قابلیت بالفعل یا بالقوۃ موجود ہے - اسکے مقابلہ میں دوسری طرف
پانی کی ایک ایک بوند ہزاروں لاکھوں جاندار جراثیم سے آباد ایک دنیا ہے
اور مادے کا ایک ایک ذرہ بے حد وحساب متحرک برقی نقطوں سے
بھرا ہوا ایک عالم ہے سائنس تو یہ کرشمے دکھا کر خاموش ہو جاتی ہے
مگر ہم یہ پوچھتے ہیں کہ کیا خالق مطلق کی حیرت انگیز صناعی کے عجیب وغریب
انکشافات کے بعد بھی کسی کو یہ کہنے کی جرأت ہو سکتی ہے کہ خدا والد
یا مولود ہو سکتا ہے - یا اوسکی ذات کا تصور انسان کی عقل وادراک
میں آسکتا ہے یا اوسکی صفات میں کوئی غیر شریک ہو سکتا ہے -
اسلام کو ان معلومات کی ضرورت نہ تھی اس نے ان کے سان وگمان
سے بھی سیکڑوں برس پہلے بالاجمال ان کی طرف اشارہ کر دیا تھا او
فرما دیا تھا کہ [1] إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَ
النَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ
اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ
بَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ
بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝

غرض اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سائنس کے مکاشفات جدید
اگرچہ براہ راست خدا کی بابت ساکت اور خاموش ہیں لیکن بالواسطہ
ایک طرف تو وہ عظمت وجبروت کبریائی دکھا کر اسکی ذات وصفات
کو لوث شرک سے منزہ اور علائق ابویت وولدیت سے ارفع ثابت

[1] - بیشک آسمان اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے اختلاف میں اور جہازوں میں جو لوگوں کے فائدے کی چیزیں لیکر سمندر میں چلتے ہیں اور بارش میں جسے اللہ آسمان سے اتارتا ہے ... اور اس سے زمین کو مردگی کے بعد زندہ کرتا ہے - اور اسمیں ہر قسم کے جانور پھیلاتا ہے - اور ہواؤں کے پھیرنے میں اور بادلوں میں جو زمین اور آسمان میں گھرے ہوئے ہیں - سمجھنے والوں کے لئے اللہ کی نشانیاں ہیں -

آثار مادی کا کوئی نہ کوئی خالق ہونا ضروری ہے۔ اور خود اشیاء مادی کا وجود باری تعالیٰ کا مستلزم ہے ۵

دل گواہست کہ در پردہ دل آرائے ہست
ہستیٔ قطرہ دلیل است کہ دریائے ہست

اگرچہ سائنس کو اس مسئلے سے کچھ سروکار نہیں رہتا۔ کیونکہ بحث واجب الوجود ماوراے طبیعیات میں سے ہے اور وہ سائنس کی حد سے باہر ہے لیکن پھر بھی اس کے تحقیق کردہ اصول کے موافق نتیجہ یہی نکلتا ہے۔ اور وہی دلیل پیدا ہوتی ہے۔ جو اسلام نے تیرہ سو برس پہلے پیش کی تھی۔ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط۔ (کیا اللہ کے ہونے میں بھی کچھ شک ہے جس نے آسمان اور زمین بنائے)

سائنس کی جدید تحقیقات نے جو یکسانی اور ہم رنگی تمام اشیائے ارضی اور اجرام سماوی میں ثابت کی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ صرف اس زمین کا ہی نہیں بلکہ تمام کائنات مرئی و غیر مرئی اور اشیائے معلومہ و نامعلومہ کا خالق اور مالک ایک ہی ہے لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا یہی عجیب و غریب ارتباط و انتظام اس امر کا بھی ثبوت دیتا ہے کہ مختلف آثار قدرت جدا جدا دیوتاؤں کے وجود پر دال نہیں ہیں بلکہ ایک ہی ذات قادر کی حکمت بالغہ کا مظہر ہیں۔

سائنس کے نئے نئے انکشافات نے عجائبات عالم کو پہلے سے صد چند کر دیا ہے۔ آجکل ایک طرف تو اندھیری رات میں ٹمٹماتا ہوا ہر ایک تارا ہمارے آفتاب کی طرح دنیا کے ایک مجموعے کا مرکز سمجھا جاتا ہے جنمیں سے ہر ایک میں آثار حیات کے قائم رکھنے

۵ اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتا تو وہ سب بگڑ جاتے۔

تصدیق رسالت

اقرار توحید کے ساتھ ہی تصدیق رسالت بھی اسلام کا لازمی جزو ہے۔ اور کلمہ شہادت میں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (اللہ کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں) کے ساتھ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ (اور محمد اسکے رسول ہیں) بھی کہنا مسلمانوں کے لئے ضروری امر ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے تصدیق رسالت کے بغیر بھی نیکو کاروں کو بخش دے کیونکہ اسلام نے اور مذہبوں کی طرح غفران کا دروازہ غیر مسلموں پر بند نہیں کیا ہے بلکہ تمام موحدین عالم کو مژدۂ نجات دیا ہے۔ لیکن مسلمان وہی ہے جو خدا کے وحدت کے ساتھ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت کا بھی قائل ہو اور یہ قید ہے بھی نہایت ہی قرین انصاف اور مطابق فطرت۔ کیونکہ یوں تو اُس رحمۃ للعالمین کا وجود باجود تمام نوع انسان کے لئے باعث فخر و ناز اور موجب شرف و امتیاز ہے۔ لیکن خاص کر مسلمانوں پر تو انکے احسانات و انعامات کا کوئی شمار و حساب ہی نہیں۔ ہم کو تو اللہ کے نام سے نشست و برخاست کے آداب تک سب کچھ اسی مخبر صادق نے سکھایا۔ اور دین و دنیا کی بھلائی اور بہتری کا سچا طریقہ اسی رہبر کامل نے دکھایا۔ آنحضرت سے پہلے عرب ہی نہیں بلکہ تمام اقوام عالم کی جو کچھ حالت تھی وہ محتاج بیان

کرتے ہیں اور دوسری طرف اسکی بے مثل حکمت اور بے بدل قوانین
کی مثالیں بتا کر اس کی ان صفات کی زبان حال سے تصدیق کرتے
ہیں جنسے اسلام نے اسے متصف کیا ہے۔ کیا دنیا کا کوئی مذہب
اپنے خدا کی شان میں اس سے زیادہ سچے اور پاکیزہ الفاظ پیش
کرسکتا ہے جو اسلام نے سکھائے ہیں۔ هُوَ اللّٰهُ[لہ] الَّذِي لَا إِلٰهَ
إِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيمُ
هُوَ اللّٰهُ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ
الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحَانَ اللّٰهِ
عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ
الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰى يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَ
هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

لہ ترجمہ ۔ وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ حاضر و غائب کا جاننے والا۔ وہ بڑا مہربان رحم والا ہے۔ وہ اللہ ہے جسکے سوا کوئی معبود نہیں۔ سب کا بادشاہ ہے۔ نہایت پاک سلامتی والا امن دینے والا۔ نگہبان بڑی عزت والا۔ زبردست۔ اور بڑی عظمت والا ہے۔ وہ اللہ ان سب باتوں سے پاک ہے۔ جو لوگ اسمیں شریک کرتے ہیں۔ وہی اللہ ہے۔ پیدا کرنے والا بنانے والا۔ طرح طرح کی صورتیں دینے والا۔ جتنی عمدہ صفتیں ہیں سب اس کے لئے ہیں۔ اسکی پاکی بیان کرتی ہیں وہ تمام چیزیں جو آسمان اور زمین میں ہیں۔ اور وہ بڑی عزت والا۔ اور بڑی حکمت والا ہے۔

کس بات کی چاہی جاتی ہے - صرف اس بات کی کہ ہمنے توحید کا سبق آنجناب سے سیکھا - کیا یہ کچھ غلط ہے - کیا کوئی اسپر شبہ کر سکتا ہے - یہ تو ایک ایسی کھلی ہوئی بات ہے - جسے ہم مسلمان ہی نہیں بلکہ ساری دنیا جانتی ہے - لیکن کیسی عجیب بات ہے کہ ارسطو اور افلاطون کا نام تو ادب سے لیا جائے - بیکن اور ڈارون تو دنیا کے محسن سمجھے جائیں - لیکن بانئے اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کو رسول اللہ کہنے میں تامل ہو سبحان اللہ

آئینہ بہ بزم دلکشائے تو رسد	ہم شانہ بہ زلف مشکسائے تو رسد
ماخاک شویم و سر بہ منظور افتد	دل خوں شود و حنا بہ پائے تو رسد

آخر رسول کے معنی تو ایلچی اور پیغامبر ہی کے ہیں - اور اگر آنحضرت صلعم کا مقصد دنیا میں اللہ کا پیام پہنچانا نہیں تھا تو اور کیا تھا - اور اگر انہوں نے عمر بھر یہی فرض ادا نہیں کیا تو اور کیا کیا - ان کی زندگی کا ہر ایک کام ان کے اس دعوی کی تصدیق کرتا ہے کہ

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۵

(ع ۱۹ پ ۸)

اے پیغمبر تو لوگوں سے کہدے کہ بیشک میری نماز اور میری تمام عبادت اور میری زندگی اور میری موت سب اللہ ہی کیلئے ہے جو سب جہانوں کا پروردگار ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے اور میں اسکے فرمانبرداروں میں پہلا فرمانبردار ہوں -

البتہ اگر آپ ابن اللہ یا روح اللہ ہونے کا دعوے کرتے یا اپنے آپ کو کلیم اللہ اور خلیل اللہ کہنے کے لئے ارشاد فرماتے - تب بھی مسلمانوں کو تو

نہیں ہے دنیا بھر کی بُرائیاں زمانے بھر کے عیب ان میں علی وجہ کمال
پیدا ہو گئے تھے دلوں سے نیکی کا خیال اتنا اُڑ گیا تھا کہ بدی کا احساس
تک نہیں رہا تھا ایسے زمانے میں ایسی قوم کے سامنے جو اپنی سخت
دلی اور رسم پرستی میں سب سے بڑھی ہوئی تھی آنحضرت نے دعوت
حق شروع کی اور اپنی پاک اور سچی تعلیم کے برقی اثر سے چند ہی دن میں
اسے قعر مذلت سے اُٹھا کر اوجِ عزت پر پہنچا دیا اور ظالم ناحق شناس
اور ناخدا ترس بدویوں میں ہمدردی - رحمدلی - اتقا اور ایثار کی
روح پھونک دی - شبلی مرحوم نے سچ کہا ہے ؎

اسکی برکت تھی کہ صحرائے حجاز کی سموم ۔۔۔ بن گئی دہر میں جا کر چمن آرائے بہار
یہ اسی کا تھا نتیجہ کہ عرب کے بچے ۔۔۔ کھیلنے جاتے تھے ایوانِ کسریٰ میں شکار
یہ اسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے رہزن ۔۔۔ فاش کرنے لگے جبریلِ امیں کے اسرار

کیا یہ اسی کا فیضانِ تعلیم نہیں ہے کہ ہم آج دنیا کے سارے مذہبوں
پر برتری کا دعویٰ کرتے ہیں اور تمام فلسفوں کو پوچ سمجھتے ہیں تو پھر کیا
ان سب احسانوں کا اتنا بھی عوض نہ ہو کہ ہم آنجناب کی رسالت کی
تصدیق تو کریں اور اون کو اللہ کا ایلچی تو سمجھیں - اگر کفرانِ نعمت کوئی
بُرائی ہے تو یقیناً اس سے بڑھ کر اور کوئی گناہ نہیں ہو سکتا کہ ہم اس
ذات بابرکات کے احسان مند نہ ہوں جس نے ہم کو نعمہائے لازوال
سے مالا مال کر دیا - اور اس معلم اسرارِ ازلی کو بھلا دیں جس سے ہم علوم
دین و دنیا سے نہال ہو گئے - اور پھر یہ بھی تو دیکھیئے کہ ہم سے تصدیق

دلدادہ بن گئے ،،

کوئی ان مدعیانِ خرد سے یہ تو پوچھے کہ ظہورِ اسلام سے پہلے یہودیوں اور نسطوریوں کا اثر کہاں گیا تھا۔ کیا تب عرب لوگ ناپید تھے یا یہودیوں اور مسیحیوں نے اپنے مذہب کی اشاعت میں کوئی بات اُٹھا رکھی تھی یا ان میں باہمی میل جول اور ربط ضبط نہ تھا۔ یہ بھی نہ سہی۔ فتوحات اسلام سے پہلے وہ معلم نسطوری اور راہنما یہودی خود کیا کر رہے تھے۔ اُنہوں نے خود اس علم و فن کی تدوین و اشاعت کیوں نہ کی جس میں اُنہوں نے اپنے نووارد شاگردوں کو یگانۂ روزگار بنا دیا۔ متعصب اور وحشی بدویوں کی طبیعت کو تو یک بیک اُنہوں نے ایسا بدل دیا کہ وہی لوگ جو آج قدیم کتابوں سے حمام گرم کر رہے تھے کل ہی علم و فضل کے حامی اور دلدادہ بن گئے مگر اپنی پہلی حکمراں طاقتوں پر جو ابھی کی ہم مذہب اور ہم قوم تھیں اُنہوں نے اپنی اس کیمیائی قوت اور اکسیری اثر کو کیوں نہ آزمایا۔ اور کیوں صدیوں تک ان کے ظلم و ستم کے زیر مشق رہے۔ اِن کور باطنوں کو یہ بھی نہیں نظر آتا کہ یہودیوں اور نسطوریوں کے ساتھ ایسا حسن سلوک مرعی رکھنا۔ ان کو ہر قسم کی علمی اور سیاسی ترقی کے موقع دینا۔ اور ان کے علوم و فنون سے فائدہ اُٹھانا۔ یہ باتیں خود ہی اسلام کی کتنی بے تعصبی روشن خیالی اور علم دوستی کی دلیل ہیں۔ ہاں اگر وہ مسلمان اسلام کو چھوڑ کر ان لوگوں سے ایسے برتاؤ کرتے۔ تب البتہ ڈریپر اور اس کے ہمصفیہ لوگوں کی رائے کچھ قرین قیاس ہو سکتی تھی شائد اِن کے نزدیک

نہیں لیکن خیر اور اقوام کو اس میں کسی قدر چوں وچرا کی گنجائش ممکن تھی لیکن اس کور باطنی اور حق ناشناسی کا تو کچھ علاج ہی نہیں کہ سرے سے اسلام کو بھی حضرت محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم نہ کہا جائے۔ بلکہ اسے یہودی قسیسوں اور نسطوری راہبوں کے اثرات کا نتیجہ سمجھا جائے مشہور پروفیسر ڈریپر جس پر مسیحیت کے مقابلہ میں اسلام کی حمایت کا اتہام لگایا جاتا ہے۔ اپنی کتاب "The Intellectus Europe development of" (یعنی یورپ کی دماغی ترقی کی تاریخ) میں یوں گہر افشانی کرتا ہے مسلمانوں کے اُستاد اور راہنما نسطوری اور یہودی تھے جب عربوں نے مصر لیا تو انکا طرز عمل متعصب وحشیوں کا سا تھا اور اسکی بنا پر بعض لوگوں کا یہ الزام انپر عاید ہوتا ہے کہ انھوں نے سکندریہ کے حمام گرم کرنے کے لئے وہاں کے قدیم کتبخانہ کو جلا دیا۔ لیکن اپنے نئے مفتوحہ ملکوں میں رہائش پذیر ہوتے ہی ان میں ایک عجیب وغریب تغیر نمایاں ہوگیا۔ اور یک بیک وہ علم کے پرجوش حامی اور سرگرم طالب بن گئے۔

عرب کی طاقت دو سمتوں میں بڑھی اور دو مختلف اثروں سے متاثر ہوئی ایشیا میں نسطوری راہبوں سے اور افریقہ میں یہودیوں سے اسکی مٹ بھیڑ ہوئی اور یہ دونوں فرقے بظاہر اسی قسم کے عقائد کی وجہ سے بزنطائن سلطنت کے تختۂ مشق ستم رہے تھے۔ جنکو اب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تلوار نے منوالیا۔ یہ عقیدہ مشترک مسئلۂ توحید تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ غرض یوں ایشیا میں نسطوریوں اور افریقہ میں یہودیوں سے مل کر عرب علم کے سیچے

اور تعلیم تفسیر (روحی خدا) پر چھوڑ دی گئی - اور اعمال و آداب کا تو کیا ذکر -
... ارشاد کیا کہ

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ الخ

اے مسلمانو - تمہارے واسطے اللہ کے رسول کا عمدہ نمونہ موجود تھا -

اور یوں اس شخص کا اسلام (مگر اس کا مذہب تو اس پاک اور مقدس نام کا مستحق نہیں ہے) نہایت ہی ناقص اور ناتمام رہے گا - جو اقرار توحید کے ساتھ تصدیق رسالت کی ضرورت کا معتقد نہو - اسلام کی منصف مزاجی اور حق پسندی کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے - کہ اس نے اپنے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ہی انبیائے سالقین کی عزت و احترام کی بھی تلقین کی اور ان کی رسالت کے اقرار کو جزو ایمان ٹھہرایا - کیونکہ ارشاد باری یہ ہے کہ

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝

تم کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو نازل کیا گیا ہماری طرف اور جو اتارا گیا حضرت ابراہیم پر اور اسمعیل اور اسحق اور یعقوب اور اولاد یعقوب پر اور جو اترا موسیٰ اور عیسیٰ اور اور پیغمبروں پر ان کے پروردگار کی طرف سے ہم ان میں سے کسی میں تفرقہ نہیں کرتے - اور ہم اس ایک خدا کے ماننے والے ہیں -

اس حکم میں صرف وہی معدودے چند پیغمبر شامل نہیں جنکا ذکر کلام مجید میں

اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ كَانُوا بِالصِّيْنِ ۵	تحصیل علم کی کوشش کرو خواہ وہ ملک چین ہی میں کیوں نہ ہو۔

بھی نعوذ باللہ کسی نسطوری راھب یا یہودی قسیس کا قول ہوگا۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ط	اللہ تعالیٰ نے انکے دلوں پر مہر لگا دی اور انکے کانوں اور آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔

بہرحال ہمارے نزدیک تو اس سے زیادہ کوئی بات خلاف فطرت ہو نہیں سکتی کہ تصدیق رسالت میں پس و پیش کیا جائے ۵

احمد مرسل کہ خرد خاک اوست		ہر دو جہاں بستۂ فتراک اوست
اے تن تو پاک تر از جان پاک		روح تو پروردۂ روحی فداک

اظہار امتنان اور اعتراف احسان مندی کے علاوہ بھی تصدیق رسالت کئی وجہوں سے ضروری ہے حقیقت میں احادیث و سنن نبوی کے بغیر اسلام کی تعلیم ادھوری اور ناتمام رہجاتی ہے۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ کلام مجید کے اتمام نعمت اور تکمیل دین ہونے میں کوئی خامی باقی تھی۔ جسے حدیثوں نے پورا کیا۔ حاشا و کلا کلام مجید تو ہر طرح کامل اور مکمل ہے۔ لیکن اس کے بعض مقامات کی توضیح اور تشریح کے لئے افعال و اقوال نبوی کے مطالعے کی ضرورت پڑتی ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں تو ہر ایک بات کی تاکید او تکرار بھی اسکی اہمیت کی مناسبت سے کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ نماز کے ارکان کی تعدیل و ترتیب زکوۃ کے نصاب کی تعین اور مناسک حج کی تلقین بھی کلام اللہ کی اسی زندہ

معترض یہ کہے کہ سرے سے کسی شخص کا اللہ کی طرف سے مبعوث ہونا بھی ممکن ہے یا نہیں۔ ہم کو تو اس میں کوئی بات خلاف قیاس معلوم نہیں ہوتی۔ اور نہ ہمارے نزدیک سائنس اور فلسفے کو اسپر کوئی اعتراض کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہم وحی کو ایک رمز الٰہی سمجھتے ہیں۔ اور اس بارے میں سائنس کی لاعلمی اس کی حرف گیری میں مانع ہے۔ سائنس کا دائرہ معلومات مادیات تک محدود ہے۔ اور اسکی آگے اسکی رسائی نہیں۔ اسی لئے مسئلہ رسالت بھی اسکی حرف گیری اور نکتہ چینی سے محفوظ اور معلومہ اصول فطرت کی دسترس سے بالا ہے۔ لیکن یہ تو ہم دیکھتے ہی ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے معاملات زندگی میں مخلوق کی رہبری اور دستگیری کے لئے بعض آدمیوں کو ایسے عجیب وغریب دماغ اور ایسی موشگاف اور نکتہ رس عقل عطا فرمائی ہے۔ کہ انہوں نے عالم اسباب کے بہت سے ایسے سربستہ راز کھولدیے ہیں جنکا انکشاف کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ چنانچہ علوم طبیعیات کی حیرت انگیز ترقی۔ اور قدرتی طاقتوں کے کارآمد اور فرماں بردار بنانے کے تعجب خیز آلات اس بات کے شاہد ہیں۔ تو کیا یہ بات کچھ خلاف قیاس ہے کہ وہ ہماری روحانی ترقی اور باطنی اصلاح کے لئے کوئی موزوں اور مناسب قابلیتوں کا آدمی پیدا کرے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جب اس شخص کا منشا ہی یہ ہوگا کہ وہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلائے تو ضرور ہے کہ اس میں کوئی ایسی خاص قابلیت ہو کہ اللہ تعالےٰ

نام بنام آیا ہے ۔ بلکہ ان کے علاوہ اور سب پیشوایان ملل سابقہ بھی بحکم مِنْهُم مَّن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ (انہیں وہ پیغمبر بھی شامل ہیں جنکا ذکر ہمنے تجھسے نہیں کیا) اسی زمرے میں داخل ہیں ۔ اور یہ تو ارشاد باری ہی ہے کہ

اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ	کوئی قوم ایسی نہیں ہے جسمیں کوئی ڈرانے والا نبی نہ آیا ہو ۔

معقول پسند اصحاب فرمائیں کہ اسلام کا یہ طرز عمل کتنا پسندیدہ اور مطابق فطرت ہے اور اس کے باوجود بھی اسپر وحشیانہ تعصب کا الزام کہاں تک حق بجانب ہے ۔ کیا بزرگان سلف کا یہ احترام بھی مسلمانوں نے نصرانیوں اور یہودیوں سے ہی سیکھا تھا ۔ اسلام نے تو اپنے بانی اور ہادی کے لئے بھی ناقابل خطا ہونے کا وہ دعوے نہیں کیا جو مسیحیت اپنے ہاں کے ہر ایک اسقف روم کے لئے ایک مدت مدید تک اپنے پیرووں سے بزور آتش و شمشیر منواتی رہی ۔ مسیحیت کے سوا اکثر اور مذاہب عالم نے بھی اپنے بانیوں کے لئے بشریت سے بالا ہونیکا دعوٰی کیا ہے ۔ اور انکے علما نے بھی اپنے آپ کو خالق اور مخلوق میں واسطہ بنا کر اپنے لئے خاص حقوق ٹھہرائے ہیں اور فرائض مذہبی کو اپنے واسطے جاہ طلبی اور نام آوری کا ذریعہ بنایا ہے ۔ اسلام نے تو جب کہا یہ ہی کہا ۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ	محمد بھی پیغمبر ہی ہیں ۔ انسے پہلے اور بھی پیغمبر گزرے ہیں ۔

آخر میں صرف ایک بات اور باقی ہے ۔ ممکن ہے کہ کوئی

ایمان بالقدر

خدا کی شان ہے کہ وہ عقیدہ جو ہر درد کی دوا اور ہر مرض کی شفا تھا جو ہر مصیبت میں وجہ تسلی اور ہر تکلیف میں باعث تسکین ہوتا۔ وہی عقیدہ ہماری کج فہمی اور نادانی سے اتنا مشکل اور مبہم ہوگیا کہ ساری دنیا نے ہمارے قومی تنزل اور انحطاط کا سبب اسی کو ٹھہرایا اور ہم خود بھی اپنی پست ہمتی اور دوں طبعی کے نتیجوں کا الزام اسی کے سر تھوپنے لگے ؎

بہ من چنداں گناہ از بیگناہی می نہد نسبت	کہ من ہم در گمان افتادہ پندارم گنہگارم

عقیدۂ تقدیر بالاجمال یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہوا ہے جو کچھ ہوتا ہے اور جو کچھ ہوگا سب اللہ تعالےٰ کے علم اور حکم سے ہو رہا ہے۔ وہ شروع ہی سے ہر ایک بات کی بابت فیصلہ کر چکا ہے کہ یہ اس طرح ظہور پذیر ہوگی۔ اور ہر شخص کے لیئے مقرر کر چکا ہے کہ اوسکو یہ یہ حالات و واقعات پیش آئیں گے۔

جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا هُوَ كَائِنٌ (جو کچھ ہونیوالا تھا اوس پر قلم چل گیا) اس بنا پر حافظ نے کہا ہے ؎

دیدمش خرم و خنداں قدح بادہ بدست	و ندراں آئینہ صد گونہ تماشا میکرد
گفتم این جام جہاں بیں بتو کے داد حکیم	گفت آنروز کہ ایں گنبد مینا می کرد

یہاں تک کہ اعمال کی نیکی اور بدی اور آدمی کا دوزخی یا جنتی تک

براہ راست اپنے احکام اور اپنے ارادوں کو اوسکے دل میں القا کر سکے - اور وہ بھی اپنی طبیعت کو ماسوائے اللہ سے یکسو کر کے پورے اطمینان سے انوار آلہی کا پرتو لے سکے - اور اس کا حال لعینہ بیدل کے اس قول کے مطابق ہو ؎

آئینہ ما روے ترا عکس پذیر است
رنگے نہ نمایم کہ تو آنرا نہ نمائی

اور پابند ہیں۔ اور نہ یہ مستنبط ہوتا ہے کہ ہمارے اعمال و افعال کی جوابدہی ہم سے ساقط ہو جاتی ہے بمسئلہ تقدیر کا یہ مفہوم لینا نہایت سخت غلطی ہے۔ اور اس عقیدے پر جو کچھ حرف گیری کی گئی ہے۔ وہ اسکے اسی غلط مفہوم کے لحاظ سے کی گئی ہے۔

بات یہ ہے کہ انسان نہ تو بالکل آزاد اور مختار ہے کہ جو چاہے کرے اور جس طرح چاہے رہے۔ اور نہ بالکل مقید اور مجبور ہے کہ وہ ہر ایک بات میں معذور سمجھا جائے اور اس سے کسی قسم کی بازپرس ہی نہ ہو۔ خارجی حالات اور بیرونی واقعات پر تو اسکا اثر کچھ ہے ہی نہیں۔ لیکن خود اپنے اوپر بھی اسے نہایت ہی محدود اور مشروط اختیار ہے۔ جس طرح اسکی زندگی اور موت اوسکے قبضے میں نہیں۔ اسی طرح اسکی بیماری اور تندرستی۔ دولتمندی اور ناداری۔ دانائی۔ اور بیوقوفی۔ رنج اور خوشی۔ غرض کوئی بات بھی اس کے اختیار کی نہیں ہے۔ اسے کوشش کے لئے ایک بہت ہی تنگ اور مختصر سا میدان دیا گیا ہے جس کے آگے اوسکی تگ و دو بیکار اور اسکی دوڑ دھوپ لاحاصل ہے۔ شاید کہا جائے کہ۔ نہیں۔ بیماری اور تندرستی اصول حفظان صحت اور تدابیر طبی کی پابندی پر موقوف ہے۔ دولت مندی اور ناداری محنت اور ہوشیاری پر مبنی ہے۔ دانائی اور بیوقوفی تحصیل علم و فن کے شوق اور غور و فکر کا نتیجہ ہے اور رنج اور خوشی دل و دماغ کی خود ساختہ کیفیات کا نام ہے۔ اور یوں حقیقت میں یہ سب اور اسی طرح کی اور بہت سی باتیں انسان کے

ہونا بھی مقدر ہو چکا ہے۔ اور چونکہ اللہ کے حکم ناگزیر ہیں۔ اس لئے مقدرات سے سرتابی اور انحراف ممکن نہیں ہے۔ اسی واسطے عمر خیام کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ؎

اے آنکہ مرا ز خاک برداشتۂ		از لطف و عطائے خویش افراشتۂ
بگزر ز سر جرم من و خردہ مگیر		می رویم از آں ساں کہ تو ام کاشتۂ

یہی سبب تھا کہ عام طور پر مسلمانوں نے اس عقیدہ کو سہل انگاری اور غفلت شعاری کا حیلہ بنا لیا۔ اور اغیار نے اسے سعی و کشش کا منافی اور ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنے کا مرادف سمجھ لیا۔ اور تدبیر اور تقدیر کو ایک دوسرے کی ضد ٹھہرایا حالانکہ یہ سر تا سر غلط فہمی اور کجروائی ہے بے شک ہمارا انکا عقیدہ ہے کہ مشیت ایزدی کے بغیر کوئی چھوٹی سی چھوٹی بات نہیں ہو سکتی۔ ع

اے کہ بے حکم تو برگے ہم نہ جنبد بر درخت

ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ ابتدائے آفرینش سے بھی پہلے اس کا علم ازل سے ابد تک تمام حالات و واقعات معلومہ و غیر معلومہ پر حاوی اور محیط تھا۔

لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَا اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَا اَكْبَرُ اِلَّا فِي كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۔	آسمانوں اور زمینوں میں کوئی ذرہ بھر بلکہ اس سے بھی چھوٹی یا بڑی چیز اس پر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ بلکہ سب کچھ کتاب مبین میں موجود ہے۔

لیکن پھر بھی اس سے نہ تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم اپنے ہر ایک کام میں مجبور

آدم سے اس وقت تک گزر چکے ہیں - یہ بات ہر فرد و بشر کے حق میں درست ہے کہ وہ وہی بن سکتا ہے جو اوسکے ماں - باپ - حسب نسب - اعزا - و اقربا تعلیم و تربیت اور موافقت وقت نے اسے بنا دیا ہے - کوئی شخص اپنی قومیت نہیں بدل سکتا - کوئی آدمی اپنی خوشی سے کسی خاندان میں پیدا نہیں ہوا - کسی انسان نے اپنے قبیلے کا نام اور کام خود مقرر نہیں کیا - جو بے بسی اصل و نسل بدلنے میں ہے وہی بیچارگی اِن حالات کے تغیر میں بھی ہے جو اس شخص کا رتبہ اور درجہ مقرر کرنے والے ہیں - سچ یہ ہے کہ یہاں انسان بالکل ہی ناچار اور بے اختیار ہے - ریت کا ایک ذرہ ہے کہ ہوائیں اسے جدھر چاہتی ہیں اُڑا ے لئے جاتی ہیں - گھاس کا ایک پتہ ہے کہ بحر مواج کی لہریں اِدہر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر بہائے لئے پھرتی ہیں - مدبر اور مقنن - ادیب اور فلسفی سب اپنی پیدائش سے پہلے کے واقعات کے ممنون ہیں - اپنے زمانے کے رسم و رواج اور حالات و خیالات کے احسان مند ہی نہیں بلکہ خود اپنی طاقتوں کی ترقی اور تکمیل کے لئے کسی اہم واقعے یا زبردست حادثے کے بھی محتاج ہیں - جب تک یہ سامان نہوں تب تک ان کی تمام مادرزاد قوتیں بھی ملکر کچھ نہیں کرسکتیں -

ہم اس بحث پر بیجا زور مبالغہ آمیز اور طول دینا نہیں چاہتے مگر یہ بات کہ ہر فرد بشر مختلف واقعات کا آوردہ اور اپنے سے زیادہ

حیطۂ اختیار میں ہیں۔ مگر ہم اسکو تسلیم نہیں کر سکتے۔ اس لئے نہیں کہ ہم تقدیر کے معتقد ہیں بلکہ اس واسطے کہ سائنس کے مکاشفات جدید کے اصل اصول یعنی مسئلہ ارتقا کی تعلیم یہی ہے۔ چنانچہ امریکہ کا ایک مشہور فاضل پروفیسر رڈپاتھ اپنی کتاب تاریخ عالم کے پہلے حصے میں اس مسئلے کی توضیح کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "قوانین قدرت کے راز کھلتے جاتے ہیں اور اب انسان مسبب الاسباب ہونے کی بجائے اسباب کا آوردہ اور خود حکمران طاقت ہونے کی جگہ اور طاقتوں کا پیدا کردہ سمجھا جانے لگا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اسکی قوت فاعلہ میں کچھ کمی ہو گئی ہے۔ یا وہ فاعل مختار نہیں رہا ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ وہ خود گزشتہ اور موجودہ حالات کا سبب نہیں ہے۔ بلکہ ان حالات اور کیفیات کا نتیجہ ہے۔ جو اسکی ہستی سے صدیوں پہلے سے کارفرما تھے ان تمام طاقتوں نے متفق اور متحد ہو کر ہر فرد بشر کو وہ بنا دیا جو کچھ کہ وہ ہے اگرچہ ایک خاص حد تک اوسکی ذہنی اور دماغی طاقتیں اسی کے قبضے میں ہیں اور وہ خود فاعل مختار ہے۔ اگرچہ ایک درجے تک کہا جا سکتا ہے کہ اس کے قوائی پر اس کے ارادہ کے سوا اور کسی بالائی قوت کا اثر نہیں اور اس کو اپنے حالات و خیالات پر اختیار ہے۔ مگر اصل یہ ہے کہ ہر ایک آدمی ایک زمانے کا نتیجہ اور ایک عمر کا خلاصہ ہوتا ہے وہ صرف ایک ماں باپ کا بچہ نہیں ہے بلکہ ان تمام آدمیوں کا بیٹا ہے۔ جو اس کے خاندان میں ابتدائے

ناگوار تھا اس لئے ہمنے پہلے اسی کو لیا۔ مگر تصویر کا ایک اور رُخ
بھی ہے۔ اور ہم یوں مجبور بنکر معذور اور مغفور نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ
اگرچہ ہم اپنے گردوپیش کے اسباب سے وابستہ اور اپنے آس پاس
کے حالات کے محکوم ہیں۔ لیکن پھر بھی ایک حد تک ہم کو ان پر متصرف
ہونے اور ان کو مفید مطلب بنانے کی قابلیت دی گئی ہے اور اپنے
طرز عمل کو ہر حال میں اپنے مقدور بھر نیک اور پسندیدہ بنانے کی
ہدایت کی گئی ہے۔ اسکی بابت ہم سے بازپرس ہوگی۔ اور اسی کے
ہم جوابدہ ہیں۔ بلاشبہ ممکن ہے کہ ایک شخص تدابیر طبی کی پوری نگہداشت
کے باوجود بھی اپنی صحت کو قائم نہ رکھ سکے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں
آتا کہ وہ بیماری سے بے قرار ہو کر خدا کو بھی بھول جائے۔ یا کوئی شخص
پوری محنت اور کوشش کے بعد بھی مفلس ہی رہے۔ مگر یہ کیا ضرور
ہے کہ وہ چوری بھی کرنے لگے۔ انسان کے مقابلہ میں جانور بالکل مجبور
ہیں وہ محض اپنی جبلت کے مطیع اور اپنی طبیعت کے فرمانبردار ہیں نہ وہ
اپنی موروثی عادتوں سے انحراف کر سکتے ہیں نہ اپنے آس پاس کے
اسباب پر متصرف ہو سکتے ہیں۔ اسی لئے وہ ہر قسم کی جوابدہی سے
بری اور ہر طرح کی بازپرس سے آزاد ہیں۔ اسکے برخلاف انسان
ایک حد تک مختار ہے اور اس کے آگے مجبور۔ اور اس سے جو کچھ
مواخذہ ہے وہ اسی حد تک ہے جہاں تک اس کا اختیار ہے
کسی نے خوب کہا ہے ؎

زبردست اور قدیمی طاقتوں کا پیدا کردہ ہے۔ اتنی بدیہی اور ظاہری ہے۔ کہ اسکے لئے دلیل اور ثبوت کی ضرورت نہیں۔"

مسئلہ ارتقا کا مدار اصول توریث پر ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ انسان اپنی طبیعت اور خصوصیات اپنے آبا و اجداد سے ورثے میں پاتا ہے اور جس طرح وہ اپنے نسب کو نہیں بدل سکتا۔ اسی طرح ان موروثی خصوصیتوں کو بھی نہیں مٹا سکتا۔ اور تعلیم و تربیت وغیرہ کا جو کچھ اثر ہوتا ہے وہ ان طبعی خصائص کا تابع اور محکوم ہوتا ہے یہ اصول انسان کی صورت اور سیرت اور تمام جسمانی اور دماغی اور اخلاقی کیفیتوں اور قابلیتوں پر حاوی ہے اور کسی کو کسی طرح اس سے مفر نہیں۔

اب بتائیے کہ وہ قدرت و اختیار جس پر انسان کو ناز تھا کیا ہوا وہ امر بجا زاور فاعل مختار ہونے کا دعویٰ کہاں گیا۔ واقعی خدا کی قدرت ہے کہ وہ عقیدہ جو اسلام نے تیرہ سو برس پہلے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ اور جس پر نیچر کے روشن خیال فلسفی ہنستے تھے۔ اور اسلام کو نام دھرتے تھے۔ اب سائنس اپنی ساری تگاپو کے بعد اسی نتیجے تک پہنچا اور اسکے سامنے تمام منکرین اور ملحدین کے سر جھک گئے۔ اور سب کو بادل ناخواستہ اپنی مجبوری تسلیم کرنی پڑی۔

لیکن یہ تو اس عقیدے کا ایک پہلو تھا۔ ہمنے اپنی مجبوری کو تو دیکھ لیا اور چونکہ انسانی طبیعت کو اپنی بیچارگی کا تسلیم کرنا ہی بہت

اب دیکھئے کہ مطلب کیا صاف ہوگیا - اللہ کے بے شمار احکام میں سے ایک حکم جو ہمکو کسی قدر معلوم ہوا ہے وہ ہے جس سے مختلف اجسام ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں (کشش) اور جسکے مطابق ہر ایک چیز زمین کی طرف گرتی ہے (کشش ثقل) اور ایک حکم وہ ہے جس سے مادہ حرارت سے پھیلتا اور برودت سے سکڑتا ہے - چنانچہ انہی دونوں حکموں کے مطابق ہوا چلتی ہے اور پتے ہلتے ہیں - انہی کے مطابق کشتیاں پانی پر تیرتی ہیں - پانی بادل بنکر برستا ہے اور زمین اور تمام نظام ثوابت وسیارات تھما ہوا ہے - یہی نہیں بلکہ جب کشتیاں ڈوب جاتی ہیں - جب پانی نہیں برستا - اور جب اور اسی قسم کے کام نہیں ہوتے - تب بھی سب کچھ انہی احکام الٰہی کی تعمیل اور اطاعت ہوتی ہے - اس لئے کلام مجید میں ان تمام واقعات کو اللہ کی نشانیاں اور اللہ کے حکم سے تعبیر کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے انہی مثالوں کو پیش کرکے اپنے بندوں کو عبرت دلائی ہے اور فرمایا ہے -

أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ۝ أَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ ۝ لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ ۝ أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ۝ أَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنشِئُونَ ۝

تم اس پانی کو دیکھو جس کو تم پیتے ہو کیا تم نے اسے بادل سے اُتارا یا ہم نے اگر ہماری مشیت ہوتی تو وہ کھاری ہو جاتا - تو تم شکر کیوں نہیں کرتے تم اس آگ کو دیکھو جسے تم سلگاتے ہو - تم نے اس کا درخت لگایا یا ہم نے ؟

یہ تو مادی دنیا کی مثالیں تھیں لیکن اللہ تعالیٰ کے حکم جس طرح یہاں

از فکر معاش گہ پریشان شدہ	گاہے زغم معاد حیران شدہ
ایں ہر دو باختیار تو نیست وے	مشکل ہمہ اینست کہ انسان شدہ

خیر یہ انسان کے مجبور اور مختار ہونے کا مسئلہ تو طے ہوا مگر اصل اعتراض تو یہ تھا کہ جو کچھ ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے حکم اور اسکے علم سے ہوتا ہے گویا ہم پر جو کچھ مصیبت پڑتی ہو یا ہم سے جو کچھ برائی سرزد ہوتی ہے وہ اللہ نے نعوذ باللہ جان بوجھ کر ہمارے سر ڈالی ہے۔ بیشک۔ لیکن ذرا غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ اعتراض بالکل بیجا ہے۔ بلا شبہ ہمارا عقیدہ ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ مگر اس کا مطلب کیا؟ اور خدا کے حکم کے کیا معنی؟ ظاہر ہے کہ وہ ہماری طرح نہ تو ہر ایک کام اپنے ہاتھ سے کرتا ہے۔ نہ ہمارے رئیسوں کی طرح ہر ایک بات کے واسطے اپنے موکلوں کے نام حکم جاری کرتا ہے اسکی شان ان دونوں باتوں سے ارفع اور اعلیٰ ہے۔ تو پھر آخر یہ کیونکر کہا جاتا ہے کہ پتہ بھی ہلتا ہے تو اسکے حکم سے ہلتا ہے۔ جبکہ نہ یہ امر قابل تسلیم ہے کہ وہ دنیا بھر کے درختوں اور پودوں کے ہر ہر پتے کو اپنے ہاتوں سے ہلاتا ہے۔ نہ یہ کہ وہ ان میں سے ہر ایک کے لئے کوئی جدا جدا اور خاص خاص حکم نافذ کرتا ہے ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ خدا کے حکم وہ قوانین قدرت ہیں جو تمام کائنات میں ہمیشہ سے جاری وساری ہیں اور جنکی بابت لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا (تو اللہ کے قواعد میں تغیر نہ پائیگا) کا ارشاد ہو چکا ہے اگرچہ سائنس نے انکی اس صفت کو ابھی دریافت کیا ہے

إِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ إِمَّا	بیشک ہمنے انسان کو سیدھا راستہ بتادیا
شَاكِرًا وَّإِمَّا كَفُوْرًا ۝	اب خواہ وہ شکر بجالائے یا ناشکری کرے

یہ بھی ایک بدیہی بات ہے کہ یہ ازلی اور دائمی قانون کبھی آپ اپنی تنسیخ نہیں کرسکتے۔ اسلئے گویا برائی ان قوانین قدرت کی خلاف ورزی کا نام ہے اور یہ کبھی کسی حال میں اللہ کے حکم سے ہوتی ممکن ہی نہیں ہے اسی بنا پر ارشاد ہوا ہے کہ

مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ	تم کو جو کچھ بھلائی پہنچتی ہے۔ وہ اللہ کی طرف
وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ	سے ہوتی ہے اور جو برائی پہنچتی ہے وہ خود تمہارے
فَمِنْ نَّفْسِكَ۔	نفس کی طرف سے ہوتی ہے۔

دنیا میں صرف انسان ہی کو جہاں انکے جاننے اور سمجھنے کی قابلیت عطا کی گئی ہے وہیں انکے ماننے یا انسے سرتابی کرنے کی طاقت بھی دیگئی ہے۔ اور یہ طاقت وہی قوت ارادی اور حرکت خود اختیاری ہے جس کا راز نَفَخْتُ مِنْ رُّوْحِيْ اور قُلِ الرُّوْحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّيْ کے پردے میں چھپا ہوا ہے۔ اسی طاقت کی وجہ سے وہ اس محدود دائرہ میں فاعل مختار ہے اور اپنے اسی اختیار کی نسبت سے وہ سزا جزا کا مستحق اور عذاب وثواب کا سزاوار ہے۔ جن باتوں پر اسے اختیار نہیں دیا گیا۔ انکا اسے ذمہ دار بھی نہیں بنایا گیا۔ اور جو نتیجے اس کے افعال ارادی پر مترتب نہیں ہوتے۔ انکی بابت اس سے بازپرس بھی نہیں کیجاتی چنانچہ۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا	اللہ کسی کو اسکی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

جاری ہیں اسی طرح اخلاقی اور روحانی امور میں بھی نافذ ہیں اور ساری دنیا کا انتظام اور تمام کائنات کا کام انہی کے مطابق ہوتا ہے - اور ذرہ برابر ان سے تجاوز اور انحراف ممکن نہیں - یہی مطلب ہے اس قول کا کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کے حکم سے ہوتا ہے - اور یقیناً اس میں شائبہ شبہ کی ذرا بھی گنجائش نہیں -

اللہ کا مزید لطف یہ ہے کہ اس نے ہماری ضرورتوں کے مطابق ہم کو مختلف مناسب ذرایع سے اپنے ان احکام کی اطلاع دیدی ہے جن کا ہم سے تعلق ہے - چنانچہ مادی اور جسمانی احکام کا علم حکما کی تفتیش اور تحقیق سے ہوتا ہے - اور اخلاقی اور روحانی احکام کی اطلاع انبیا کی تعلیم و تلقین سے ہوتی ہے - اور ان دونوں شقوں میں تناسب کا بھی اتنا خیال رکھا گیا ہے کہ جو باتیں زیادہ ضروری تھیں وہ بتلائی بھی پہلے گئیں - اور پھر جوں جوں حصول علم کی قابلیت بڑھتی گئی اسی قدر تعلیم بھی اعلیٰ ہوتی گئی یہاں تک کہ اخلاقی و روحانی ترقی کے احکام اس دن مکمل ہو گئے جس دن یہ ارشاد ہوا کہ

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًاط	آج ہم نے تمہارے مذہب کو تمہارے لئے مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا - اور تمہارے لئے مذہب اسلام کو پسند کیا -

بہر حال یوں اس نے اپنی مشیت سے ہم کو آگاہ کر دیا اور اسی کی بابتہ ارشاد ہوا کہ

سے ہر ایک کی کامیابی یا ناکامی کی بابت حکم لگا سکتا ہے - بلکہ یہ بھی بتا سکتا ہے کہ کون کون لڑکے کس کس درجے پر کامیاب ہونگے اور نہایت قرین قیاس ہے کہ امتحان سے اسکی اس پیشین گوئی کی تصدیق ہو جائے - اس صورت میں کہا جا سکتا ہے کہ مدرس کو امتحان کا نتیجہ پہلے سے معلوم تھا - لیکن کیا اس بنا پر کسی لڑکے کی ناکامی کا الزام اسپر لگایا جا سکتا ہے - اسنے سب کو یکسان تعلیم دی - سب کے ساتھ برابر محنت کی مگر ہر ایک نے اپنے اپنے ظرف کے موافق اسے یاد رکھا اور اپنے اپنے شوق کے مطابق اس سے فائدہ اُٹھایا - اور گو مدرس انکی بابت پہلے سے ہی سمجھ چکا تھا - مگر نتیجے میں اس کا کچھ دخل نہ تھا - بعینہ یہی صورت اللہ تعالیٰ کے علم کی بھی ہے اس نے ہم کو گویا ایک مکان میں چھوڑ دیا ہے جس میں ہر طرف دروازے اور راستے ہیں ان میں سے کوئی راستہ جیکر کا ہے - کوئی قریب کا - کوئی باغ میں جا نکلا ہے - کوئی دریا کی طرف - کوئی جنگل کی جانب - کوئی ایسا ہے کہ ہر پھر کر وہیں آجاتا ہے کوئی ایسا ہے کہ کچھ دور جا کر بند ہو گیا ہے اور آگے راستہ نہیں ہے - اب یہاں سوال یہ ہے کہ ؎

آواز دراز شش جہت می آید	آیا بکدام راہ مے باید رفت

ہم کو ان راستوں کی یہ تمام کیفیتیں بھی سمجھا دی گئی ہیں اور ہر ایک سمت کی دشواریاں اور آسانیاں بھی بتا دی گئی ہیں - اب ہم کو اختیار ہے کہ جس راستے سے چاہیں جائیں - اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۔	اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بار نہیں اٹھاتا

اللہ تعالیٰ کے سچے اور قطعی وعدے اس بات کے کافی ضامن ہیں۔

اب اس شق کو لیجیے کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کے علم سے ہوتا ہے۔ بلاشبہ اس کا علم ازلی اور ابدی ہے اور گزشتہ یا آیندہ کی کوئی بات اس سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔

یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۔	اللہ جانتا ہے جو کچھ انکے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے۔

مگر اس سے اللہ پر ہمکو جان بوجھ کر بلاؤں میں ڈالنے کا اتہام عائد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ علم اور چیز ہے اور مجبور کرنا دوسری چیز ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ ہم سے یہ فعل ظہور میں آنے والے ہیں مگر اس نے ہم کو ان افعال کے ارتکاب پر مجبور نہیں کیا ہے۔ اور ہم کو ایک حد تک بااختیار کر دیا ہے کہ

فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ	پس جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے ناشکرگزاری کرے

اسکی توضیح ایک مثال سے اچھی طرح ہو سکتی ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک مدرس کے پاس دس لڑکے پڑھتے ہیں۔ وہ ایک سال تک برابر ان کو محنت سے پڑھاتا ہے اور اپنے مقدور بھر ان کی اصلاح اور تعلیم میں کوئی بات اٹھا نہیں رکھتا۔ سال کے آخر میں ان کا امتحان ہوتا ہے لیکن اس مدرس کو امتحان سے پہلے ہی ہر ایک لڑکے کی قابلیت اور لیاقت کا حال معلوم ہے اور وہ اپنے سال بھر کے تجربے

نیک و بد کا امتیاز ہے - نہ کسی کو ایک دوسرے پر تفوق ہے - اسی لیئے نہ وہ کسی بات کے جواب دہ ہیں - نہ کسی امر کے مکلف لیکن انسان کے لیئے اللہ کی مشیت یوں نہ تھی اسلیئے اسنے ہم کو تھوڑا سا اختیار دیکر نیک اور بد کی بھول بھلیوں میں ڈال دیا - اب ہم خواہ اس امتحان میں کامیابی کے صلے کو پائیں یا نہ پائیں - مگر ہم کو یہ سوال کرنیکا کچھ حق نہیں ہے کہ ایسا کیوں کیا گیا ۵

گل را چہ مجال ست کہ پرسد ز کلال	از بہر چہ سازی و چرا می شکنی

یہ تو مسئلہ جبر و اختیار کی تشریح تھی - اب صرف ایمان بالقدر کی ضرورت کا مختصر بیان کرنا باقی ہے - کہا جا سکتا ہے کہ سرے سے عقیدۂ تقدیر ماننے کی ضرورت ہی کیا ہے - جبکہ اس کے سمجھنے میں اتنی دشواریاں اور غلط فہمیاں ہوتی ہیں - میرے خیال میں تو اسکا ماننا ہر پہلو سے نہایت ضروری ہے - سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اسکو ترک کرنے سے اللہ کے حکم اور علم کے حاوی اور محیط ہونے کا انکار لازم آتا ہے - کیونکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں عقیدۂ تقدیر یہ ہی ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ کے حکم سے ہوتا ہے اور اسے شروع سے ہر ایک ہونیوالی بات کا پورا علم ہے - دوسری بات یہ ہے کہ دنیا کی مصیبتوں اور تکلیفوں میں جس قدر تسکین اور تقویت اس عقیدے سے ہوتی ہے اتنی اور کسی طرح ممکن نہیں ہے - اس سے تو انکار ہو ہی نہیں سکتا کہ انسان پیدا ہونے سے مرنے تک ہر وقت طرح طرح کی آفات و آلام کا نشانہ ہے -

صرف اتنی بات ہے کہ جس طرح معلم کو اپنے تجربے سے اپنے شاگردوں کی
قابلیت کا اندازہ ہے اور واقعات اسکی تصدیق کرتے ہیں۔ اسی طرح
اللہ تعالےٰ کا کامل علم اس بات کو جانتا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اس گھر کے
کونسے راستے سے نکلے گا۔ گو اس کا یہ علم کسی طرح ہمارے اس اختیار میں
خارج اور مخل نہیں ہے۔ جو ہم کو راستوں کے انتخاب کرنے میں دیا گیا ہے
بعینہ جس طرح معلم کی واقفیت سے طلبہ کے پرچہ ہائے امتحان پر
کچھ اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔

یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ قیاس مع الفارق ہے کیونکہ معلم
اور اللہ تعالےٰ میں مماثلت تام نہیں ہے۔ معلم اپنے شاگردوں کو صرف
پڑھا دیتا ہے مگر ان کی سمجھ ان کے ذہن ان کے حافظے کو بہتر بنانا اسکے
امکان میں نہیں ہے۔ اس کے برخلاف اللہ تعالےٰ اگر چاہتا تو سب کو
یکساں اچھا اور نیک اور خوش نصیب بنا سکتا تھا۔ جس سے کسی
کو راستہ کی تلاش اور برائی بھلائی میں انتخاب کی حاجت ہی نہ پڑتی۔
بلاشبہ خدا کی قدرت سے یہ بات کچھ بعید نہ تھی۔

فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ۔	اگر وہ چاہتا تو سب کو راہ راست دکھا دیتا

اس کے لئے ایسا جہان بنانا کیا مشکل تھا جہاں سب نکوکار ہی ہوتے۔
یا جہاں سب ایسے برابر کے ہوتے کہ کسی کو ایک دوسرے کی خدمت نہ کرنی
پڑتی۔ لیکن ہم تو کہتے ہیں کہ اس نے ایسے جہان بھی بنائے ہیں۔ ملائکہ
کو نہ سہی حیوانات ہی لیجئے کیا ان کی دنیا ایسی نہیں ہے جس میں یہ

مرد حق ہیں کہ بلا را ز خدا می بیند	تیغ را بر سر خود بال ہما می بیند

لیکن یہاں ایک اور بات بھی سمجھ لینی چاہیئے عقیدۂ تقدیر صرف ان باتوں کے متعلق صبر و تسلیم کی تعلیم دیتا ہے جو گزر چکی ہوں۔ یا جو اختیار انسانی کے محدود دائرے سے خارج ہوں۔ آیندہ ہونے والے کاموں کو یا ان باتوں کو جنمیں ہماری سعی و تدبیر کارگر ہو سکتی ہو محض تقدیر پر چھوڑ دینا اور ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنا تعلیم اسلام کے بالکل منافی ہے۔ بے شک جو کچھ ہوتا ہے وہ ہوگا۔ اور تقدیر کا لکھا مٹ نہیں سکتا۔ مگر ہم کو کیا معلوم کہ کیا ہونا ہے؟ یا تقدیر میں کیا لکھا ہے؟ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے حتی الامکان ہر ایک کام میں پوری کوشش کریں اور پھر نتیجے کو تقدیر پر چھوڑ دیں اپنے مقدور بھر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی پوری نگہداشت کریں اور ہر قسم کی برائیوں سے بچیں اور پھر اللہ کے رحم و کرم پر بھروسہ کر کے اپنی خطاؤں اور لغزشوں کی معافی کے لئے دست بدعا ہوں۔

رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ	اے پروردگار ہمارے گناہوں کو بخشدے اور ہماری بُرائیوں کو چھپالے اور ہمارا نیکوں کے ساتھ انجام کر

کلام مجید شاہد ہے کہ اسلام نے ہرگز اس عقیدے کی تعلیم نہیں دی کہ ہم محض تقدیر پر بھروسہ کر کے کاروبار دنیا میں کوشش نہ کریں یا امور دینی میں غور و فکر سے کام نہ لیں حاشا ۵

گفت پیغمبر بہ آواز بلند	بر توکل زانوئے اشتر بہ بند

اگر اسلام کی تعلیم کا یہ مطلب ہوتا کہ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا اور انسانی سعی

خواہ وہ آفتیں خود اسکی یا اسکے ابنائے نوع کی غلطیوں اور بے عنوانیوں کا نتیجہ ہو یا احکام آلہی کی نافرمانی اور اصول فطرت سے روگردانی کا خمیازہ ہوں یا اور کسی سبب سے ہوں۔ لیکن بہر حال انکا ہونا یقینی ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ عقل جو ہمارے تمام کاموں کی منتظم اور ہمارے دماغ کی بادشاہ ہے سخت مصیبتوں میں ہمارا ساتھ چھوڑ کر الگ ہو جاتی ہے اور اگر وہ ہو بھی تو اس وقت اسکے مشورے کو سننا اور اوسپر کاربند ہونا دشوار ہوتا ہے ایسے وقت میں فلسفے کے دل آویز مسائل اور سائنس کے حیرت انگیز مکاشفات دل کو بہلانے اور طبیعت کو سنبھالنے میں بیکار ثابت ہوتے ہیں اور صرف مذہب ہی کا اثر ہے جو صبر و تسلیم کی تلقین کرکے تسلی اور تسکین دیسکتا ہے ایسی حالت میں جبکہ آدمی اپنی انتہائی کوشش کے بعد بھی ناکام رہا ہو۔ یہ عقیدہ کس قدر ہمت افزا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ ایک ایسی دانا اور مہربان ذات کے حکم سے ہوتا ہے جس کا ہر ایک کام ہماری بھبودی اور بہتری کے لئے ہے۔ اور جو ہم پر خود ہم سے بھی زیادہ شفیق ہے۔ یوں صبر کرنے کو تو سب ہی کرتے ہیں اور نہ کریں تو کریں کیا۔ بقول بیدل ؎

نکشش رو دریم از حکم قضا در کشتی دریم	چہ پروا آتش از جبین جبین بوریا دارد

مگر دنیا بھر کی تقریروں اور منطقی دلیلوں سے بھی وہ دلی تسکین اور قلبی اطمینان نصیب نہیں ہوتا جو اس عقیدے سے ہوتا ہے۔ سچ ہے ؎

اعتقادِ حشر و نشر

حیات بعد الموت کا مسئلہ اور روزِ قیامت حشر و نشر اور سزا و جزا کا عقیدہ ہمیشہ سے ہر مذہب نے کسی نہ کسی صورت میں شرو تسلیم کیا ہے اور حقیقت میں کسی مذہب کو اس سے چارہ ہی نہ تھا - کیونکہ تمام مسائل و اصول مذہبی کی بنیاد ہی اس عقیدے پر قایم ہے - اور یہی عقیدہ فلسفے اور مذہب میں مایہ النزاع رہا ہے - فلاسفۂ متقدمین نے بالعموم یہ رائے ظاہر کی کہ

مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ط	بس ہماری یہی دنیا کی چند روزہ زندگانی ہے - جو پیدا ہونے سے شروع ہوتی ہے - اور مرتے وقت ختم ہوجاتی ہے - اسکے بعد کچھ بھی نہیں نہ سزا و جزا ہے نہ عذاب و ثواب ہے - ورنہ ہم کو پھر پیدا ہونا ہے

مرے پیچھے ہمارے جسم کے اجزاء متفرق ہوکر فضائے کائنات میں منتشر ہوجاتے ہیں - اور یہ سلسلۂ آمد و رفت ہمیشہ سے یونہی ہے اور ہمیشہ یونہی چلا جائیگا - اس کے برعکس مذہب کا شروع سے یہ عقیدہ رہا کہ ہم میں جسم کے سوا روح بھی ہے - جو جسم پر حکمراں اور اس سے کام لینے والی ہے اور موت محض ایک ظاہری انقلاب ہے جس سے روح جسم سے آزاد ہوجاتی ہے اور جس کے بعد جسم مٹ جاتا ہے اور روح باقی رہتی ہے - یہاں تک تو تقریباً تمام مذہب متفق ہیں - بلکہ ایک طرح فلسفۂ جدید جو مادہ کے

وتدبیر بالکل فضول ہے تو سب سے پہلے تو خود کلام مجید کا نزول اور انبیا علیہم السلام کی بعثت کا مدعا زائل ہو جاتا۔ کلام مجید میں ہر جگہ غیر مسلموں کو اسی بات پر ملامت کی ہے۔ کہ وہ ہر ایک نصیحت کی بات پر یہی جواب دیتے ہیں کہ "وہ ہمنے تو اپنے بزرگوں کو یہی کرتے پایا۔ اور ہم بھی انہی کی پیروی کرتے ہیں" اور ہمیشہ ان کے اس قول کے جواب میں عقل سے کام لینے کی ہدایت ہوئی ہے۔ کیونکر ممکن ہے کہ جو مذہب اس قدر معقول پسند ہو۔ وہ آن کر سب سے پہلے یہی اعلان کرے کہ "جو ہونا تھا ہو چکا اب اس میں تمہاری تگ و دو بیکار ہے نہ تم کو معاش کے لئے ہاتھ پاؤں ہلانیکی ضرورت ہے نہ معاد کے واسطے غور و فکر کرنے کی حاجت" سبحان اللہ ھذا بھتان عظیم ط

بلاشبہ اللہ نے اکثر جگہ اپنے آپ کو ہر فعل کا فاعل حقیقی ٹھہرایا ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان کا اختیار (خواہ وہ کتنا ہی محدود کیوں نہو) بھی سلب کر لیا گیا۔ اور اوسکی کجرویوں اور غلط کاریوں کا الزام بھی خدا پر عائد ہو گیا۔ نہیں اگر ایسا ہوتا تو مذھبوں اور قانونوں کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ اور انسان بھی جانوروں کی طرح غیر مکلف ہی رہتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام علتوں اور سببوں کا سلسلہ اللہ ہی پر جا کر تھمتا ہے۔ اور جو کچھہ ہوتا ہے وہ اسی کے ان حاوی اور دائمی احکام کے مطابق ہوتا ہے۔ جو ذرے سے لیکر آفتاب تک اور کیڑے سے لیکر انسان تک ہر ایک شئے میں کار فرما ہیں۔

مسئلہ تناسخ کی بابت میں یہاں کچھ زیادہ کہنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ اول تو میں اسکی مختلف تاویلوں اور تشریحوں سے واقف ہی نہیں ہوں دوسرے یہاں ایک ایسی اہم اور اصولی بحث کو چھیڑنے کا موقعہ بھی نہیں ہے۔ البتہ بادی النظر میں اسکی بابت یہ خیال آتا ہے کہ روح کے اس تغیر اجسام کے صرف دو ہی مدعا ہو سکتے ہیں۔ یا تو یہ کہ وہ اس طرح اپنے مدارج ارتقائی طے کرے۔ یا یہ کہ یہ لوٹ پھیر اسکی ایک زندگی کے اعمال کا خمیازہ ہو۔ مگر ہمارے خیال میں تو تناسخ سے ان دونوں میں سے کوئی مقصد بھی حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگر اس سے پہلا مدعا مطلوب ہے تو قرین قیاس یہ ہے کہ روح کی ہر ایک آئندہ زندگی پہلی زندگی سے زیادہ اعلیٰ اور ارفع ہو۔ ورنہ وہ ترقی کیونکر کر سکتی ہے۔ لیکن مسئلہ تناسخ کے مطابق روح انسانی اپنی حیات دنیوی کو پورا کرنے کے بعد حیوانات۔ نباتات بلکہ جمادات تک کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ حالانکہ بظاہر تمام آثار حیات میں انسانی زندگی سب سے زیادہ اعلیٰ ہے۔ اسلئے چاہیئے کہ روح جمادات۔ نباتات اور حیوانات کی تدریجی صورتیں اختیار کرنے کے بعد سب کے آخر میں انسانی قالب میں آئے۔ اور اس کے بعد پھر اسے عالم ظاہری کی کوئی صورت اختیار کرنی نہ پڑے۔ کیونکہ یہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی روح انسان کے رتبہ تک پہنچکر پھر کتے۔ بلی۔ یا کنکر۔ پتھر کی صورت لے۔ اور اس رجعت قہقری کو بھی اس کی ترقی ہی کہا جائے۔ یہ تو صریح ترقی معکوس ہو گئی۔ حالانکہ اصول ارتقا میں ایسا الٹا

ساتھ قوت کی بھی بقا کا قائل ہے۔ اسکی تائید کرتا ہے۔ مگر اسکے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ روح اس حالت میں کیا کرتی ہے۔ اور کہاں رہتی ہے۔ اس مسئلے سے فلسفے کو کچھ بحث نہیں ہے۔ اور مختلف مذہبوں نے اس کا جواب مختلف طور سے دیا ہے۔ بعض تو تناسخ کے قائل ہیں اور بعض سزا و جزا کے قائلین تناسخ کا تو یہ خیال ہے کہ روح ایک جسم سے نکلنے کے بعد اپنی اس زندگی کی اعمال کی پاداش میں کسی دوسرے جسم میں حلول کر کے پھر دنیا میں آتی ہے۔ اور یہ دور یونہی قائم رہتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر وہ سارے گناہوں سے پاک اور تمام آلودگیوں سے صاف ہوجائے۔ اس وقت وہ اپنے مبدا اصلی میں ملکر ہمیشہ کے لئے آلام زندگی اور قید جسم سے آزاد ہوجاتی ہے۔ اسکے برخلاف معتقدین سزا و جزا یہ سمجھتے ہیں کہ روح کو یوں پے در پے مختلف صورتیں بدلنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ موت کے بعد اپنے اعمال کے مطابق عذاب و ثواب کی مستحق ہوتی ہے۔ اور اپنے گناہوں کی سزا پاکر آخر وہاں چلی جاتی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے مہیا کی ہے۔ اور جہاں اسے ابدی اطمینان اور دائمی فارغ البالی نصیب ہوتی ہے۔

یَا اَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَ ادْخُلِیْ جَنَّتِیْ۔	اے روح مطمئن تو اپنے رب کی طرف چل ایسی حالت میں کہ تو اس سے راضی ہو اور وہ تجھ سے خوشنود ہو لیس تو میرے بندوں میں شامل اور میری جنت میں داخل ہو۔

اور کوئی فائدہ اس اُلٹ پھیر سے نہیں ہوگا۔ اور میں حقیقت میں اس میں معذور بھی ہوں گا۔ کیونکہ سچ تو یہ ہے کہ جب تک ہمارے پہلو میں یہی دل تڑپ رہا ہے۔ اور جب تک ہماری رگوں میں یہی خون دوڑ رہا ہے۔ تب تک ہمارے احساسات اور ہماری خواہشات کی نوعیت اور اصلیت کا بدل جانا محال ہے۔ اور ایک بار نہیں اگر ہم ہزار بار اس دنیا میں آئیں۔ اور یہی طاقتیں اور یہی قابلیتیں لیکر آئیں تو ہم بعینہ وہ ہی کام کریں جو اب کرتے ہیں۔ اور ہمارے افعال و اعمال میں ذرا بھی فرق نہ ہو۔

وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ	اگر وہ لوگ یعنی گنہگار پھر دنیا میں لوٹا دیئے جائیں تو وہ ہی کام کریں جن سے وہ روکے گئے تھے

اور آخر یہ ہو بھی کیونکر سکتا ہے۔ حالت تو یہ ہے کہ دنیا ہی میں طبیب ہم سے ایک احتیاط کے لئے کہتا ہے۔ ہم خود بھی جانتے ہیں کہ اس کے برخلاف کرنے سے نقصان ہوتا ہے۔ بارہا کے تجربے نے بھی اسی احتیاط کا سبق پڑھا رکھا ہے۔ مگر پھر بھی جب موقعہ آتا ہے تو طبیعت نہیں مانتی اور بے احتیاطی ہو ہی جاتی ہے۔ غرض یوں ہم دیکھتے ہیں کہ روح کے تغیر اجسام کی جو دو غرضیں ہو سکتی ہیں۔ مسئلہ تناسخ اِن دونوں میں سے ایک غرض کو بھی پورا نہیں کرتا۔ اسلئے یہ لوٹ پھیر اور تقلب ہیئت نہ تو قرین قیاس ہے۔ نہ قرین انصاف۔

بہرحال مسئلہ بقائے روح اور پاداش اعمال پر تو تمام ادیان عالم

اور ایسی بازگشت کہیں نہیں ہے۔

لیکن اگر کہا جائے کہ روح کا یہ تنزل اس کے اعمال سابقہ کی پاداش میں ہوتا ہے تو سزا کے لئے جرم سے آگاہ کرنا بھی لازم ہے۔ کوئی اخلاقی یا سیاسی قانون بلا اطلاعِ جرم سزا کو جائز نہیں ٹھہراتا۔ اور جہاں کہیں اس کے برخلاف ہوتا ہے تو وہ سزا خواہ کتنی ہی بجا کیوں نہو۔ پھر بھی منصفانہ نہیں کہی جا سکتی۔ اور یہ تو یقینی بات ہے کہ ایسی سزا سے اصلاح اور ترمیم کا مدعا کبھی حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ جب مجرم کو یہی خبر نہیں ہوتی کہ وہ کس قصور کا خمیازہ بھگت رہا ہے۔ تو پھر وہ اس قصور کے دوبارہ مرتکب ہونے سے کیونکر محترز رہ سکتا ہے۔ اور یوں سزا کا اصلی منشا فوت ہو جاتا ہے۔ اور وہ ایک مشفقانہ تادیب ہونے کی بجائے فقط ایک منتقمانہ تعذیب بنجاتی ہے۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر تناسخ روح کے لئے اعمال سابقہ کی سزا ہے تو وہ ایسی سزا ہے کہ جس سے تکلیف دہی کے سوا قطعًا اور کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں نے مانا کہ میری موجودہ زندگی میرے گزشتہ اعمال کی پاداش ہے۔ مگر اب چونکہ میں ان گزشتہ اعمال سے لاعلم اور اپنی سابقہ زندگی کے حالات سے بیخبر ہوں۔ اس لئے میں گزشتہ کے تجربے سے کچھ بھی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا اور اگر میری اس زندگی کے افعال کی سزا میں آیندہ میری روح اس سے بھی کوئی بدتر صورت اختیار کرے تب بھی بجز اس کے کہ مجھ کو اور زیادہ رنج و محنت کی زندگی بسر کرنی پڑے

ہاں یہ ممکن ہے کہ اسکے قانون رحمت و رافت کے مطابق ایک زمانے کے بعد گناہوں کا تکلیف دہ اثر خود ہی اپنی آگ میں جل کر روح کو اپنی آلودگیوں سے پاک کر دے۔ اور یوں عذاب جہنم ہی ان کے لئے عطائے جنت کا سبب بنجائے۔

ہمارے خیال میں اس بارے میں اسلام کا عقیدہ یہی ہے۔ اور یہی آتش دوزخ اور کوثر جنت اور میزان عدل اور صراط مستقیم وغیرہ سب کا ماحصل اور خلاصہ ہے۔ البتہ اسلام نے شرک کو اتنا بڑا گناہ قرار دیا ہے کہ مشرک شخص کو عذاب سے نجات کی کوئی امید نہیں دلائی گئی۔ مگر ہمکو اسکی بابت بھی کچھ رائے زنی کی اجازت نہیں ہے۔ یہ اللہ اور اوس کے بندوں کا معاملہ ہے اور اس میں ہم دخل دینے والے کون؟ اسی لئے۔ ارشاد ہوا ہے کہ

وَکَفٰی بِرَبِّکَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِیْرًا بَصِیْرًا	اور تیرا پروردگار خود ہی اپنے بندوں کے گناہوں کو اچھی طرح جانتا اور دیکھتا ہے

اس بارے میں عقائد اسلام پر بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اسلام کی دوزخ اور جنت میں مادیت کا رنگ بہت غالب ہے۔ اور اس میں ایک طرف تو جنت کے عیش و عشرت کے سامان اور دوسری طرف دوزخ کی تکلیف اور تعذیب کے اسباب کو ایسی تشریح و تفصیل سے بیان کیا ہے کہ اس سے انکے بالکل مادی اور جسمانی ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔ حالانکہ زیادہ قرین قیاس یہ ہے۔ کہ چونکہ مرنے کے

متفق ہیں۔ یہاں ہمکو صرف یہ دیکھنا ہے کہ اس بارے میں معتقدات اسلام کتنے معقول اور کس حد تک قابل قبول ہیں۔ اسلام کا حیات بعد الموت کے بابت یہ عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد ایک وقت مقررہ پر سب آدمی دوبارہ زندہ ہوکر اللہ کی بارگاہ میں اپنے اعمال وافعال کی سزا وجزا پانے کے لئے حاضر ہونگے۔ وہاں نہایت انصاف سے انکی نیکیوں اور بدیوں کا موازنہ ہونے کے بعد ان کو جنت یا دوزخ میں جگہ دیجائے گی۔ ظاہر ہے کہ عقل تو اس معاملے میں نارسا ہے ہی۔ مگر پھر بھی اتنا ضرور سمجھ میں آتا ہے۔ کہ اگر روح کوئی غیر فانی چیز ہے تو لازمی بات یہ ہے کہ بوقت مرگ جب وہ جسم سے علیحدہ ہو تو تمام نیک وبد اثرات لیکر جائے جو اثنائے زندگی میں بوساطت جسم اسپر پڑے ہیں۔ اور انہی کے مطابق وہ تکلیف یا آرام میں رہے۔ نہیں بلکہ گویا یوں کہیئے کہ خود اسکے وہ اثرات ہی اس کے لئے جنت یا دوزخ بنجائیں۔ اور پھر چونکہ روح تغیر پذیر نہیں ہے اسلیئے اسکی یہ کیفیات جو اسی کے اعمال سابقہ کا نتیجہ ہیں۔ اس کے لئے راحت جاوید یا عذاب مقیم ہوں۔ یہی مطلب ہے اس ارشاد ربانی کا کہ

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَاءَ فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ	جسنے اچھے کام کئے تو اپنے نفس کے لئے اور جسنے برے کام کئے تو اسی پر انکا وبال ہے۔ اور بیشک تیرا پروردگار اپنے بندوں پر زیادتی کرنے والا نہیں ہے۔

تمام عبارتوں کے لفظی معنی لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے قرآن مجید کا مطلب سمجھنے میں ایسی فاش غلطیاں کی ہیں جو ایک ناواقف سے ناواقف اور تنگ خیال سے تنگ خیال ایشیائی بھی نہیں کرسکتا۔ چنانچہ جو غلطی انھوں نے تصور باری تعالیٰ میں کی تھی وہی غلطی دوزخ اور جنت کے تصور میں بھی ہوئی ہے۔ اور اسی غلط فہمی کی بناپر وہ اعتراض پیدا ہوتا ہے جو ہمنے بالاجمال اوپر بیان کیا۔

حقیقت الامر یہ ہے کہ حشر ونشر کی بابت کلام مجید میں جو فرمایا گیا ہے اس سے یہ کہیں بھی ثابت نہیں ہوتا کہ مرنے کے بعد جو کچھ سزا وجزا دیجائے گی وہ ہمارے اس موجودہ مادی جسم کو دیجائے گی جسم کا سرے سے کسی جگہہ ذکر ہی نہیں ہے۔ جو کچھ ہوگا وہ ہم پر ہوگا اور یہ "ہم" جو کچھ بھی ہو اس دنیا میں بھی جسم مادی سے الگ اور اسکے سوا کوئی اور چیز ہے۔ یہاں بھی جب میں اپنے لئے "میں" کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو اگرچہ یہ آواز میری زبان اور میرے منہ سے نکلتی ہے مگر پھر بھی اس سے میری مراد میری زبان یا منہ یا سر یا سینہ یا ہاتھ یا پاؤں نہیں ہوتی۔ بیدل نے خوب کہا ہے ؎

من و ما راست تا ید از من و ما		ساز اورا ترانہ ایم ہمہ

یہ سب اعضا اس لفظ کے مفہوم میں شامل ہوتے ہیں۔ مگر پھر بھی وہ چیز جو اپنے آپ کو "میں" کہتی ہے۔ ان سب سے علیحدہ ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس سے ہر ایک کام کا مواخذہ اور ہر ایک چیز کی بازپرس

بعد یہ جسم مادی فنا ہوکر اپنے اجزاے اصلی میں منتشر ہو جاتا ہے اور فقط
روح باقی رہجاتی ہے۔ اسلئے چاہیئے یہ کہ حیات بعد الموت صرف
روح ہی کے لیئے ہو۔ اور جو کچھہ سزا و جزا ہو وہ بھی اسی کے واسطے ہو۔
اور اسی وجہ سے اس میں مادی اور جسمانی رنگ کی بجائے۔ روحانی کیفیت
زیادہ ہو۔ لیکن اسلامی جنت و دوزخ میں اس کے بالکل برعکس صورت
پائی جاتی ہے۔ بلا شبہ اگر ان آیات قرآنی کے بالکل لفظی معنی لیئے
جائیں۔ جو اس بارے میں نازل ہوئی ہیں تو یہ اعتراض ایک حد
تک ضرور وارد ہوتا ہے۔ لیکن ایسے لفظی معنی صرف وہی شخص لے
سکتا ہے جس نے کبھی کلام میں استعارے اور تشبیہ کا نام ہی نہ سنا
ہو۔ اور اگر ہر جگہہ کلام پاک کا ایسا ہی ترجمہ کیا جائے۔ تو ایک جنت
اور دوزخ ہی کیا۔ سب ہی چیزیں یہاں تک کہ خود اللہ تعالے
کی ذات بھی مجسم اور مادی قرار دیجائے۔ حالانکہ یقیناً یہ عقیدہ اسلامی
تعلیم کے بالکل منافی ہے۔ اور جگہہ جگہہ خود کلام مجید ہی سے اس قسم
کے خیالات تجسیمیت کی تردید ہو جاتی ہے۔ یہی غلطی ہے جس سے
پروفیسر ڈریپر اور اور فلاسفۂ مغرب نے خدائے اسلام کی نسبت
ایسا لچر اور مہمل تصور کیا ہے کہ نعوذ باللہ "اس کا بالائی نصف حصہ مثل انسان
اور باقی نصف حصہ کہو کہلا کر یا وہ شیر کیطرح گرجتا ہے"۔ بات یہ ہے کہ یورپین
زبانوں میں السنۂ مشرقی کے برخلاف عام طور پر مجاز اور کنایہ کا
استعمال اتنا کم ہے کہ گویا ہے ہی نہیں۔ اسلئے وہاں والے

ظاہری کے مطابق ہوں - ورنہ اگر ایسا نہ ہوگا تو وہ بات سامع کے دل میں نہیں اُترے گی اور اس سے وہ نتیجہ پیدا نہیں ہوگا - جو اس کا اصلی مدعا اور منشاء ہے - اسی رازِ فطرت کو پیش نظر رکھکر کلام مجید میں اتقا کی ترغیب اور جنت کی تعریف اس پیرائے میں کی گئی ہے - کہ

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَاۗءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۭ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ

(ع آل عمران)

لوگوں کو دُنیا کی مرغوب چیزیں مثلاً عورتیں اور بیٹے اور سونے چاندی کے بڑے بڑے ڈھیر اور عمدہ عمدہ گھوڑے اور مویشی اور کھیت پسند اور مرغوب ہوتے ہیں - یہ تو دنیا کی زندگی کے چند روزہ فائدے ہیں - اور اللہ کے پاس عمدہ ٹھکانا ہے - اے پیغمبر تو ان سے کہہ کہ کیا میں تم کو ان عارضی فائدوں سے بہتر چیزیں بتاؤں - ان لوگوں کے لئے جو پرہیزگار ہیں ان کے پروردگار کے ہاں بہشت کے باغ ہیں جن میں نہریں بہتی ہیں - ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور پاک صاف بی بیاں ہیں اور سب سے بڑھکر یہ کہ اللہ کی خوشنودی ہے - اور اللہ اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے -

یہاں پہلے یہ بتایا گیا کہ علی العموم انسانی طبیعت ان ان چیزوں کی طرف میلان رکھتی ہے - اور پھر کہدیا کہ نیکی کا بدلہ یہ ہے - کہ اللہ تعالیٰ ان کو

ہوگی - اور جو کچھ عذاب و ثواب ہوگا - وہ ظاہر ہے کہ اس کی حالت اور کیفیت کے مناسب اور مطابق ہوگا - اور یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کیا حالت اور کیا کیفیت ہوگی - لیکن ہم پوچھتے ہیں - کہ اس کا اظہار ہمارے موجودہ الفاظ و عبارات کے سوا اور کیونکر ہو سکتا تھا - ہماری ساری کیفیات ذہنی اور تصورات دماغی کا ماخذ فقط ہمارے پانچ حواس ظاہری ہیں - بیرونی دنیا کے اثرات ان پانچ راستوں سے داخل ہوکر ہمارے دماغ میں پہنچتے ہیں - انہی پر ہمارے تمام احساسات کا دارومدار ہے - انہی کی روشنی میں ہم دنیا بھر کے حالات و واقعات کی بابت رائے زنی کرتے ہیں - اور انکی وساطت بغیر ہم قطعاً کسی کیفیت کو نہ سمجھ سکتے ہیں نہ اس کا تصور کر سکتے ہیں - اس لئے ضرور ہے کہ خواہ کیسی ہی اعلیٰ درجہ کی روحانی حالت کا بیان کیوں نہ کریں - ہمکو اپنے انہی روزمرہ کے ظاہری واقعات کے پیرایے میں ان کو ادا کرنا پڑے گا - کیونکہ ہمارے پاس رنج و راحت کے اظہار کے لئے ان کے سوا اور کوئی لفظ ہی نہیں ہیں - جو ہم کو ہمارے موجودہ دنیوی تجربات نے سکھائے ہیں - صرف اسی وجہ سے نہیں کہ ہمارے پاس اسکے سوا اور کوئی اسلوب بیان نہیں ہے - بلکہ اس لئے کہ ہم سرے سے ان مادی اور جسمانی تاثرات کے سوا اور کسی طرح کے احساسات کا تصور ہی نہیں کر سکتے - اس لئے لازم ہے کہ عام طور پر سزا و جزا کا جو ذکر ہو - اسکو دل نشین کرنے کیلئے ایسے الفاظ میں بیان کیا جائے - جو ہمارے موجودہ احساسات

دل کے بہلانیکو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے	جانتے خوب ہیں جنت کی حقیقت لیکن

جنت اور دوزخ کے وجود واقعی سے انکار کرنا تو عقیدۂ اسلام کے بالکل برخلاف اور نص صریح سے صاف انحراف ہے۔ اسلئے ہر ایک مسلمان کا یہ پکا اعتقاد ہونا چاہیے کہ جنت اور دوزخ کی بابت جو وعدے وعید آئے ہیں وہ سب سچے اور یقینی ہیں۔ اور ان کے وجود میں ذرا بھی شک نہیں۔ لیکن ہاں یہ تعین آسان نہیں ہے کہ ہم کس چیز کو واقعی اور کس کو خیالی کہتے ہیں۔ ہمارے روزمرہ کے تجربے ہی ہم کو بتاتے ہیں کہ بہت سی باتیں ہوتی ہیں کہ ہم ان کو بالکل واقعی اور یقینی سمجھتے ہیں۔ مگر حقیقت میں ہمارے ذہن کے سوا ان کا اور کہیں وجود خارجی نہیں ہوتا۔ مثلاً بخار کی حالت میں ہم بہت سی صورتیں دیکھتے ہیں جن کو ہم یقیناً مجسم اور موجود خیال کرتے ہیں۔ مگر فی الواقع ان کی کچھ ہستی نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف بہت سی چیزیں ہیں۔ کہ ہمارے حواس ظاہری ان کو بالکل محسوس نہیں کر سکتے۔ مگر پھر بھی قرائن سے انکا وجود ماننا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک ایتھر ہی کو لیجئے کہ آج ساری دنیائے سائنس فضائے کائنات کو اس سے پُر مانتی ہے مگر پھر بھی ہم اپنے نازک سے نازک اور طاقتور سے طاقتور آلات کی مدد سے بھی اسے کسی طرح محسوس نہیں کر سکتے۔ اسی لئے حقیقت میں خیالی اور واقعی چیزوں کی ایسی جامع اور مانع تعریف کرنا نہایت ہی مشکل ہے۔ جس سے ان دونوں قسموں کی چیزیں ایک دوسرے

مرنے کے بعد بھی اسی قسم کی زیادہ عمدہ اور پسندیدہ نعمتیں عطا کردے گا۔ گو ان سب سے زیادہ مرغوب و محبوب بات اللہ کی خوشنودی اور رضامندی ہوگی جو اہل جنت کو حاصل ہوگی۔

اسی مصلحت سے قرآن مجید میں جنت اور دوزخ کی تعریف میں زیادہ تر ایسی باتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن سے فوراً سننے والے کے دل میں رغبت یا خوف پیدا ہو مگر ان تمام باتوں کے باوجود بھی جنت کی سب سے بڑی نعمت جو بتائی گئی ہے۔ وہ یہی ہے کہ اہل جنت کو اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا۔ جسکے مقابلے میں جنت کی تمام خوشیاں ہیچ اور بے وقعت ہوجائیں گی۔ اور اہل دوزخ دیدار پروردگار سے بے نصیب رہینگے اور یہ محرومی تمام عذابوں اور تکلیفوں سے زیادہ سخت اور جاں کاہ ہوگی۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ۔	اس روز بہت سے بشاش چہرے ہوں گے۔ جو اپنے اللہ کو دیکھ رہے ہونگے اور بہت سے چہرے اس روز بدرونق اور بگڑے ہونگے اور یہ خیال کرتے ہوں گے کہ ان کے ساتھ ایسی سختی کیجائے گی جو ان کی کمر توڑ دے گی۔

مذکورۂ بالا تقریر سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ جنت اور دوزخ کا وجود حقیقی اور واقعی نہیں۔ بلکہ محض وہمی اور خیالی ہے۔ جیسے کہ غالب مرحوم نے کہا ہے کہ ؎

اصل معاملے پر کیا اثر پڑتا ہے - اور روح کی حالت میں کیا فرق پیدا ہوتا ہے - آپ کا جی چاہے تو آپ اسے واقعی اور حقیقی نہ مانیئے - وہمی اور خیالی ہی کہیئے لیکن پھر اس سے نتیجہ کیا ؟ کیا لفظوں کی الٹ پھیر سے رنج وراحت کی نوعیت بدل جائے گی - یا روح اعمال کی جوابدہی سے بچ جائے گی - حاشا - اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ - وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ط

پس جس کسی نے ذرہ بھر نیکی کی ہے - وہ اسے دیکھ لیگا اور جس کسی نے ذرہ بھر بدی کی ہے وہ بھی اسے دیکھ لے گا -

غرض یوں ہم دیکھتے ہیں کہ دوزخ اور جنت خواہ مادی اور جسمانی ہوں یا خیالی اور روحانی - دونوں حالتوں میں عذاب وثواب کی نوعیت وہی رہتی ہے - لیکن ہاں اگر مذہب ان کو دنیا کے سامنے محض خیالی ہونے کی حیثیت سے پیش کرتا - اور انکا بیان ایک محض گمان بے وجود کے طور پر کیا جاتا - تو ظاہر ہے کہ عام طور پر اس کا کیا اثر ہوتا - اور لوگ ان کے بیم ورجا سے کہاں تک بدی سے نفرت اور نیکی کی طرف رغبت کرتے - اس کے جواب میں ہمکو کوئی قیاس پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے - کیونکہ ہم آج کل دوزخ اور جنت کے وجود خارجی کے انکار کے نتائج برائے العین دیکھ رہے ہین - آج کل مذہب کی طرف سے علی العموم جو لاپروائی اور بے اعتنائی کیجاتی ہے - اسکی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ حیات بعد الموت کا خیال دلوں سے مٹتا جاتا ہے - اور عذاب و

سے بالکل ممتاز ہو جائیں - اب ذرا دیر کے لئے مان لیجئے کہ دوزخ
کا وجود خارجی نہ ہو - اور وہ محض ایک خیالی چیز ہو - تب بھی اس خیال
سے اُس روح کو کیا تسکین ہوتی ہے - جو اگرچہ حقیقت میں کسی قسم کی
آگ میں نہیں جلتی مگر جسکے اندر حسرت مافات کا ایک ایسا شعلہ بھڑک رہا
ہے - جو اسکو سراپا جلائے دیتا ہے - دوزخ کی مثال ہی لینی کیا ضرور
ہے - دنیا ہی میں دیکھیئے کہ ایک شخص اپنے حریف کے مسابقت
کے احتمال سے رشک وحسد کی آگ میں جلا جاتا ہے - تو اگرچہ لغوی
معنوں میں کوئی آگ اسے نہیں جلاتی - نہیں - بلکہ ممکن ہے کہ سرے
سے اس کا وہ رشک وحسد ہی بیجا اور مسابقت کا احتمال ہی بے بنیاد
ہو - پھر بھی اس شخص کو محض اپنے خیال سے جو کچھ تکلیف ہو رہی ہے -
کیا کوئی اسے بے اصل اور غیر واقعی کہہ سکتا ہے - حالانکہ حقیقت میں
نہ اسکی کچھ اصل ہے نہ کوئی بنا ہے - اسی طرح اگر ایک غریب الوطن
شخص خواب میں اپنے آپ کو اپنے چھوٹے ہوئے وطن میں اپنے
احباب کے ساتھ پاتا ہے تو اسے جو خوشی اپنے گھر پہنچنے اور اپنے بچھڑے
ہوئے دوستوں سے ملنے کی ہوتی ہے - اگرچہ وہ کسی طرح بھی حقیقی نہیں
کہی جا سکتی - مگر پھر بھی اس حالتِ خواب میں وہ شخص اتنا ہی مسرور
ہوتا ہے - گویا سچ مچ بلائے غربت سے یکبارگی نجات پا گیا ہو - اب
بتائیے کہ اگر بفرض دوزخ کی تکلیف اور جنت کی راحت بخار کی
سرسامی کیفیت اور خواب کی مسرت ہی طرح ہو تب بھی اس سے

ہوش ہی باقی نہیں رہا- اور اسکی یادداشت سے اوسکے افعال گزشتہ کا خیال ہی مٹ گیا - تو پھر اس کا اپنی پہلی زندگی سے علاقہ ہی کیا رہا- اور اس کے دوبارہ زندہ کیئے جانے کا مطلب ہی کیا ہوا- زندگی او بقا کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ اس میں وہ انانیت باقی رہے -جو اپنے آپکو "میں" کہکر دنیا بھر سے ممیز وممتاز کرلیتی ہے - لیکن اگر یہ نہ ہو تو پھر یہ کہنا کہ "روح موت کے بعد بھی باقی رہتی ہے" بالکل مہمل اور بے معنے ہے -یوں تو جسم ظاہری بھی باقی رہتا ہے - کیونکہ سائنس کے قول کے مطابق مادہ صرف صورت بدلتا ہے - مٹتا نہیں - مگر کیا اس بنا پر کوئی یہ بھی کہسکتا ہے - کہ زید- عمر- بکر بھی باقی رہتے ہیں - ہرگز نہیں اس لئے لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے - کہ اگر سزا و جزائے عاقبت اور حشر و نشر و قیامت فی الواقع کوئی چیز ہیں - تو مرنے کے بعد بھی روح کو اپنے گزرے ہوئے حالات اور موجودہ زمانے میں گزرنے والے واقعات سے پوری واقفیت ہو یعنی اس میں وہ تمام دماغی طاقتیں باقی رہیں جن سے ہم اپنی زندگی میں معاملات پر غور و فکر کرسکتے ہیں - اسلام کا عقیدہ تو اس بارے میں یہی ہے - مگر اکثر اہل فلسفہ کو اس کے ماننے میں تامل ہوتا ہے - اور انکے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ -	کیا ہم جب مرجائینگے اور خاک ہو جائیں گے تو پھر دوبارہ زندہ ہونگے یہ تو بڑی دور کا لوٹنا ہے

ظاہر ہے کہ اس سوال کا مبنی بر تجربہ جواب تو آج تک نہ کسی نے دیا ہے

تو اب آخرت محض ایک خیالی ڈھکوسلا سمجھا جانے لگا ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج کل اکثر لوگ غالب کے ہمنوا ہو کر زبان حال سے یہ کہتے ہیں کہ

خود غلط بود آنچہ بیجا خوف محشر داشتم	کیں ہماں شور لسیت کاندر زلسیت در سر داشتم
تا چہ سنجم دوزخ و کوثر کہ من نیز آں چنیں	آتشے در سینہ و آبے بہ ساغر داشتم

اس لئے ذرا بھی شک نہیں کہ مذہب اسلام نے جنت و دوزخ کا ذکر جس تصریح اور جس طرز سے کیا ہے۔ اپنے مدعا کے لئے نہایت ہی بجا اور مناسب ہے۔ اور یقیناً اسکے سوا اور کوئی اسلوب بیان اس غرض کو اتنی اچھی طرح پورا کر ہی نہیں سکتا تھا۔

بہر کیف اب ہم کو عذاب و ثواب اخروی کے خیالی اور واقعی ہونے کی بحث کو تو زیادہ طول دینے کی حاجت نہیں۔ کیونکہ ہم دیکھ ہی چکے ہیں کہ ہم اپنے ان الفاظ کے مفہوم کے لحاظ سے اسے جو چاہیں کہیں۔ نتیجہ ہر حال میں یکساں ہے۔ البتہ اگر آپ یہ کہیں کہ "جس طرح مرنے کے بعد جسم مادی اپنے اجزاے اصلی میں تحلیل ہو کر ملجاتا ہے۔ ویسے ہی روح بھی اپنے ابتدائی ماخذ میں ملکر مٹ جاتی ہے اور قطرے کا دریا میں ملجانے کے بعد کوئی جداگانہ وجود نہیں رہتا۔ ویسے ہی ارواح انسانی میں بھی مرنے کے بعد بھی جسم کی انفرادی کیفیت باقی نہیں رہتی" تو ہم اسے تسلیم نہ کریں گے۔ یہ خیال حیات بعد الموت کے بالکل منافی اور عقیدۂ حشر و نشر کے بالکل مخالف ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ جب مرنے کے بعد روح کو اپنے احوال سابقہ کا کچھ

ضعیف الاعتقادی اور وہم پرستی کے ملزم قرار نہیں دیئے جا سکتے اور انہوں نے کافی تحقیق و تدقیق کے بغیر اس خلاف قیاس دعوی کو نہ مانا ہو گا۔ بہر حال ہم ان اقوال کے اس روحانی مبداء کو خواہ مانیں یا نہ مانیں لیکن ان کا عقائد اسلامی سے مقابلہ کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

امریکہ کا ایک مشہور اور مستند مصنف ڈاکٹر پیبلز ایم اے۔ ایم ڈی۔ اپنی ایک کتاب "ماہیت روحانیت" میں لکھتا ہے۔ "روحانیت نے صرف آیندہ زندگی کا ہی قطعی ثبوت نہیں دیا۔ بلکہ اسنے روحوں کے باہمی تعلقات کے قواعد و مصالح بھی بتائے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انسان آئندہ دنیا میں ایسے ہی مضبوط اور پائیدار اجسام میں داخل ہوتے ہیں۔ جیسے یہاں۔ البتہ ان کے وہ جسم زیادہ لطیف ہوتے ہیں۔ وہاں مسرت کے مختلف مدارج ہیں۔ حافظہ ایک ایسا کیڑا ہے جسے موت نہیں۔ عالم ظلمت (جحیم) کے ادنی درجوں میں بیحد سخت دماغی کوفت اور تکلیف ہے لیکن پھر بھی اللہ نے کوئی دوزخ نہیں بنائی۔ وہ نہ یہاں کسی شخص کا ہاتھ جلاتا ہے نہ وہاں کسی روح کو راندہ جہنم کرتا ہے۔ آدمی خود ہی اپنی دوزخ بناتے ہیں اور جو بوتے ہیں اس کا پھل کاٹتے ہیں[۵]" بعینہ یہی مضمون ہے جو جابجا کلام پاک میں مختلف صورتوں سے بیان

[۵] ملاحظہ ہو ڈاکٹر پیبلز کی کتاب موسومہ What is spiritualism طبع پنجم صفحہ ۱۲

نہ کوئی دیکھ سکتا ہے۔ لیکن عقلی اور قیاسی جواب وہی ہے۔ جو کلام پاک نے جابجا دیا ہے۔

اَوَلَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۔ بَلٰی وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ ؕ	کیا وہ ذات جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ ان جیسے آدمیوں کو دوبارہ پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے۔ بیشک وہ بڑا پیدا کرنیوالا اور جاننے والا ہے۔

مگر اس نہایت معقول جواب سے عقل پرست لوگوں کی تشفی نہیں ہوتی اور ان کو پھر بھی اسمیں تذبذب ہی رہتا ہے۔ ان کے دلوں کو پھیرنا تو اس مقلب القلوب ہی کا کام ہے۔ مگر میں یہاں استشہاد اً نہیں بلکہ صرف برسبیل تذکرہ اس بحث کے متعلق ان فلاسفہ مغرب کے چند قول نقل کرتا ہوں جن کو انکے عملی تجارب نے بقاے روح کا قائل اور روحانیت جدیدہ کا حامی بنا دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قول مختلف روحوں نے عالم برزخ سے آکر ان لوگوں کے ہاتھ اور قلم سے لکھوائے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان اقوال کو ایک غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے اور انہی نے ان فضلائے یورپ کے خیالات میں بھی وہ حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ کہ وہ سخت مادہ پرستی سے پھر کر اس قدر روحانیت کے دلدادہ بن گئے ہیں۔ اگرچہ ان اقوال کا یہ فوق العادت ماخذ آسانی سے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن پھر بھی یہ تو ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے اس کو تسلیم کیا ہے۔ وہ بھی

قایم کرنے کی تاکید کرتے ہوئے کہتی ہے۔ کہ "میں تمہیں ابھی سے بتا دوں
کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ جب ایک دفعہ یہ سلسلہ قایم ہو جائیگا۔ اور
جب ہر شخص اپنے گزرے ہوئے عزیزوں اور دوستوں کی روحوں سے
گفتگو کر سکے گا۔ تو فوراً . . . . "

یہاں مسٹر سٹیڈ نے اپنے ذہن میں اپنے خیال کے مطابق اس
فقرے کو یوں پورا کر دیا کہ "سب لوگ دوزخ سے انکار کرنے لگیں گے"
جولیا نے اس ذہنی قیاس کی تردید کی اور لکھا کہ "نہیں تم نے غلط سمجھا
اس سلسلہ کا فوری نتیجہ یہ نہیں ہوگا۔ کہ دوزخ کے متعلق پرانے
عقائد بدل جائیں گے۔ کیونکہ وہ تو بدلے ہی جا چکے ہیں۔ اب لوگ
آگ کی دوزخ کو مانتے ہی کب ہیں۔ نہیں۔ بلکہ وہ اس کے ساتھ
اصلی دوزخ کے وجود سے بھی انکار کرنے لگے ہیں۔ اور یہ سلسلۂ مراسلت
اس اصلی دوزخ کو نہایت صاف طور پر ثابت کر دیگا۔"[۵۱]

ایک اور خط میں جولیا یوں لکھتی ہے "اب جہاں میں نے یہ
کہا ہے کہ نو وارد روح کے استقبال کے لئے فرشتے آتے ہیں تو مجھے
یہ کہہ دینا چاہیئے تھا کہ کبھی کبھی فرشتے آتے ہیں۔ ہمیشہ نہیں۔ کبھی
کوئی نہیں آتا۔ اور کبھی اس سے بھی بدتر صورت ہوتی ہے (تم مجھے
جو کچھ میں چاہوں اور جس طرح چاہوں لکھنے دو۔ اعتراضات کو دخل

بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۴۔ جاری بھی رہا اور اسے بند ہوئے پانچ چھ سال سے زیادہ نہیں ہوئے

۵۱۔ ملاحظہ ہو کتاب "آفٹر ڈیتھ" طبع جدید صفحہ ۰۷۔

کیا گیا ہے ۔ چنانچہ ایک جگہہ ارشاد ہوا ہے کہ

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَّلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۔	پس آج کسی پر ذرا زیادتی نہوگی اور تم کو صرف انہی کاموں کا بدلہ دیا جائیگا جو تم کرتے تھے

ذرا آگے چلکر گنہگاروں کو مخاطب فرماکر یوں ارشاد ہوا ہے کہ

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِىْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۔ ط	یہی وہ دوزخ ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا ۔ آج تم اسے اس چیز سے بھڑکاؤ جس سے تم ناشکری کرتے تھے ۔ یعنی اپنے گناہوں اور اپنی بدکاریوں سے ۔

اسی بنا پر اور بھی کئی جگہہ خود اہل دوزخ ہی کو دوزخ کا ایندھن بھی کہا گیا ہے ۔ جس سے صاف یہی مراد ہے کہ خود انکے اعمال وافعال ناکردنی ہی ان کے لئے آتش سوزاں بنجائیں گے ۔

اسی طرح جو مضامین مشہور جنرلسٹ مسٹر[۵۱] سٹیڈ کی قلم سے "جولیا" کی روح نے لکھوائے ہیں ۔ ان میں جگہہ جگہہ یہی ذکر رہا ہے ۔ چنانچہ ایک خط میں جولیا عالم ظاہر اور عالم برزخ میں سلسلہ[۵۲] مراسلت

۵۱ میں نے مسٹر سٹیڈ کا مختصر خیال اور ان خطوں کی سرسری کیفیت ایک دوسرے باب "طعام اہل اسلام" کے ضمن میں بیان کی ہے ۔ یہ خطوط ومضامین ایک کتاب کی صورت میں "آفٹر ڈیتھ" کے نام سے کئی بار شایع اور اکثر زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں ۔

۵۲ ۔ شائد اکثر اصحاب کو یہ معلوم نہ ہو کہ یہ سلسلہ مراسلت قایم ہوگیا ۔ مسٹر سٹیڈ نے اس کا نام Gulia's Burean رکھا تھا ۔ اور یہ سلسلہ تقریبًا تین برس تک

جولیا کا یہ قول جو اس نے اپنے مضامین میں کئی جگہ دہرایا ہے - اسلامی عقائد کا ایک دھندلا سا پرتو ہے - جیسے اسکے تجربے نے ثابت کر دیا ہے - اس قول کی تصدیق اس سے پہلے اور اس کے بعد بہت سی از غیبی تحریروں کے ذریعے سے ہوئی ہے[۵۱] - جہاں تک میرا خیال ہے اِن اقوال سے اور کسی مذہب کے عقائد کی اتنی تائید نہیں ہوتی - جس قدر ہمارے اعتقادات کی - اگرچہ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے اعتقادات شروع ہی سے ایسے معقول ہیں کہ ان کو کسی تائید مزید کی ضرورت ہی نہیں -

ایک خط میں جولیا ہمارے حواس ظاہری کی بابت لکھتی ہے کہ "رُوح جب تک جسم میں ہوتی ہے - تب تک بہت کم سنتی ہے اور اِن بے شمار اثرات کو مطلق نہیں دیکھ سکتی - جو اس کے چاروں طرف محیط ہیں - مرنے کے بعد سب سے پہلے اور سب سے زیادہ عجیب بات جو ہم کو معلوم ہوتی ہے - وہ یہ ہے کہ ہمارے حواس مادی ہماری سماعت و بصارت میں مدد دینے کے لئے نہیں ہیں بلکہ ہمکو سننے اور دیکھنے سے روکنے کے لئے ہیں - جب ہم دنیا میں آتے ہیں تو گویا ہمارے حواس پر پردے ڈال دیئے جاتے ہیں - تاکہ ہم اپنے گرد و پیش کی بہت سی حقیقتوں کو نہ سنیں - نہ دیکھیں نہ جانیں"

یوں بظاہر یہ قول بہت عجیب اور خلاف قیاس معلوم ہوتا ہے مگر دیکھئے کلام پاک نے ارشاد فرمایا ہے کہ

۵۱ - اسی کتاب کے صفحہ ۵۸ پر مسٹر سٹیڈ نے ایک نوٹ دیا ہے اور اس میں سائیکیکل ریسرچ

ندو اور مشکلات پیدا مت کرو) ممکن ہے کہ تم اس سے گھبراؤ - مگر پھر بھی یہ بالکل سچ ہے کہ لبعض اوقات عالم ظاہر سے آنے والی روح اپنے آپ کو نہایت سخت تاریکی میں پاتی ہے - جہاں وہ نہ کچھ دیکھ سکتی ہے نہ کسی شئے کو محسوس کر سکتی ہے بلکہ ایک نہایت خوفناک گم گشتگی وحشت اور سراسیمگی اسے ہر طرف سے گھیر لیتی ہے - یہی دوزخ ہے اور دوزخ کوئی افسانہ نہیں ہے - دوزخ ان لوگوں کا انتظار کر رہی ہے جنہوں نے اسے اپنے لئے بنایا ہے - لعینہ جیسے جنت ان آدمیوں کی منتظر ہے - جنہوں نے اسے اپنے لئے تیار کیا ہے۔[۱]

اس خط میں جنت اور دوزخ کی بابتہ جو کچھ کہا گیا ہے - وہ تو خیر ہے ہی - مگر اس کے علاوہ مرتے وقت روحوں کے پاس ملائکہ رحمت و عقاب کے آنیکی بابت جو لکھا ہے وہ غالباً غیر مسلم اصحاب کو بہت عجیب اور دور از کار معلوم ہوتا ہوگا - مگر مرنے کے بعد نکیرین کا آنا اور مردے سے سوال کرنا مسلمانوں کا عام عقیدہ ہے جسے سب جانتے اور مانتے ہیں - خود کلام پاک میں اس بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ -

وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ - (قٓ)	اور ہر ایک نفس اپنے اعمال کی جوابدہی کیلئے آئیگا اور اس کے ساتھ ایک ہنکانے والا اور گواہ ہوگا -

[۱] ملاحظہ ہو کتاب مذکور صفحہ ۱۲۴ - ۱۲۵ -

اسلام اور معجزات

اکثر مذہبوں نے اپنی بنا معجزات پر رکھی ہے اور اپنی صداقت کے ثبوت میں فوق الفطرت شہادتیں پیش کی ہیں۔ اور یوں شروع ہی سے ان میں اور فلسفے میں وجہ مخالفت پیدا ہوگئی ہے۔ بلاشبہ اسلام نے بھی انبیائے سابقین کے معجزوں کو تسلیم کیا ہے۔ اور جب تک انسان کو اپنے قصور عقل کا اعتراف اور اللہ کی قدرت کاملہ کا اقرار ہے۔ تب تک معجزات کے امکان سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس نے خود اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نہ کبھی معجزوں کا دعویٰ کیا اور نہ اپنی تصدیق خوارق عادت سے چاہی۔ اُس نے ہر ایک معاملے میں عقل کو حکم بنایا اور ہر ایک اصول کو فہم انسان کے معیار پر آزمایا۔ اُسکے مسائل کے مقابلے میں اُسکے مخالفین اپنے آبائی رسم ورواج اور اپنے قومی طرق عبادت کا عذر کرتے تھے اور یہی کہتے تھے

اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝	بیشک ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک خاص طریقے پر پایا اور ہم بھی انہی کی پیروی کرتے ہیں۔

لیکن اسلام نے اس عذر کا ہمیشہ یہ جواب دیا کہ

اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ	لیکن اگر ان کے بزرگ کچھ نہ سمجھتے ہوں اور راہ راست

لَقَدْ كُنْتَ فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ (ق)	بے شک تو اس سے غافل تھا پس آج ہمنے تجھسے تیرے پردے کو اُٹھا دیا پس تیری نظر بڑی تیز ہو گئی۔

بہر کیف میں نے پہلے ہی کہدیا ہے کہ یہ اقوال عقائد اسلام کے ثبوت میں پیش نہیں کئے ہیں۔ بلکہ صرف دونوں کا مقابلہ کرنے کے لئے میں نے ان کو یہاں بیان کیا ہے۔ اور خواہ ان کا ماخذ ادعائی صحیح ہو یا غلط۔ تاہم اِن سے آج کل کے فلاسفۂ مغرب کا عام رجحان خیال تو معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ تو اندازہ ہوتا ہے کہ اگر عقل سلیم کو کام میں لایا جائے۔ تو وہ کیونکر بہ خط مستقیم ہمکو عقائد اسلام تک پہنچا دیتی ہے۔ الحمد للہ کہ ہمکو خدا نے وہ نعمت بے زوال عطا فرمائی ہے کہ ہم ایسے ظنیات و قیاسات سے بے نیاز ہیں اور فیضی کے ہمنوا ہو کر کہہ سکتے ہیں ؎

اصحاب یقینیم گماں را نہ پسندیم	ارباب صوابیم خطا را نہ شناسیم
در کشف حقائق سبق آموز ضمیریم	ترتیب دلیل حکما را نہ شناسیم

بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۷ - سوسائٹی کی روئداد متعلقہ ماہ اپریل ۱۸۹۵ء کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "۲۱ جولائی ۱۸۷۱ء کو ایک معمول مسٹر سٹینٹن موزز کے ہاتھ سے سیموئیل ولبر فورس بشپ آف ونچسٹر کی روح نے حیات بعد الموت کے متعلق اپنے بہی تجربے بیان کئے تھے۔ جو جولیا نے لکھے ہیں۔"

بَشَرٌ اَدٰسُوْلًا ۔	ایک بندہ ہوں اور پیغام رساں ہوں ۔

کیا انصاف پسند طبیعتوں کے نزدیک یہی ایک بات اسلام کی صداقت اور اُسکے پیغمبر صلعم کی راستبازی کی قطعی دلیل نہیں ہے۔ اگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چاہتے تو اس زمانے کے آدمیوں کی نظروں میں فوق الفطرت طاقتوں کا اظہار اور درجۂ بشریت سے بالا ہونیکا دعوی انکے لئے کس قدر آسان تھا۔ ان کو اپنا بادشاہ بنانے کیلئے تو اہل مکہ خود ہی تیار تھے۔ اور انھوں نے ہجرت سے پہلے ہی آنجناب کو تبلیغ رسالت سے باز رکھنے کے لئے ہر قسم کی دنیوی نعمتوں کا لالچ دیا تھا۔ شیطان کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پہاڑ کی چوٹی پر لیجانا اور تمام دنیا کی بادشاہت پیش کرنا تو بہرحال ایک تصدیق طلب قصہ ہے۔ جسپر اہل فلسفہ جتنے اعتراض چاہیں کر سکتے ہیں مگر پیغمبر اسلام کا یہ واقعہ تو ایک تاریخی بات ہے جس سے منکرین اسلام کو بھی انکار نہیں ہے۔ لیکن نہیں۔ اسلام اتنا مطابق فطرت اور معقول پسند مذہب ہے کہ اس کے رسول نے کبھی کسی غیر معمولی طاقت کا دعویٰ کر کے اپنے آپ کو دوسروں سے ممتاز نہیں کیا۔ حالانکہ مخالفین کا یہ اعتراض جس کا جواب نہایت آسانی سے محض ایک زبانی دعوی سے ہو سکتا تھا۔ انسانی طبیعت کی فطری جاہ پسندی پر کتنا شاق ہوتا ہوگا۔ مگر ان سب محرکون کے باوجود بھی اُن کو اس کے سوا کچھ کہنے کی اجازت نہیں ملتی تھی کہ۔

شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ٥ | پڑہوں تو پھر؟ -

حالانکہ عقلاً اور انصافاً اس سے زیادہ معقول اور مسکت جواب کچھ نہیں ہوسکتا۔ لیکن اُس زمانے میں عوام خوارق عادت کے ایسے دلدادہ تھے کہ وہ عقائد کو میزانِ عقل میں تول ہی نہیں سکتے تھے۔ اور احکام مذہبی کی تصدیق کے لئے فوق الفطرت شہادتیں چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی اس نہایت ہی معقول اور منصفانہ جواب سے تسکین نہیں ہوتی تھی - اور وہ پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بھی عجیب وغریب شعبدوں اور عقل فریب اور حیرت انگیز کرشموں کے طالب ہوتے تھے۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًا اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ (رکوع ۹ - پ ۱۵)

اور وہ کہتے تھے کہ ہم تمپر ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ تم ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ نہ نکالو یا تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ نہ ہو۔ جسمیں تم نہریں جاری کردو یا ہم پر آسمان کا ٹکڑا نہ لا گراو - جیسا کہ تم کہا کرتے ہو - یا اللہ اور فرشتوں کو ہمارے سامنے نہ لا کھڑا کرو - یا تمہارا کوئی سونے کا مکان نہ ہو - یا تم آسمان پر نہ چڑہ جاؤ -

مگر بارگاہ رسالت سے اس کا جواب بھی یہی ملتا تھا کہ -

سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا | میرا پروردگار پاک ہے - میں کیا ہوں بجز اسکے کہ

سمجھ سکتے۔ اور آدمی بھی ایسے جنکو اپنے علم و فضل پر بڑا غرور ہے
مذہب مسیحیت کا ایک بڑا سرگرم حامی ڈاکٹر ولیم پیلی Dr.William Poley [1]
اپنی ایک کتاب "تصدیق مسیحیت" میں اپنے مذہب کو اسلام پر
فضیلت دیتے ہوئے پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام پر بھی اعتراض
کرتا ہے۔ اور لکھتا ہے "محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم) نے اپنے
جھوٹے دعوے کا مدار معجزوں پر یعنی کسی ایسی فوق الفطرت قوت پر نہیں
رکھا جس کی اور لوگ بھی دیکھ کر تصدیق کر سکتے قرآن مجید میں محمد (صلی اللہ
علیہ وسلم) نے اپنے معجزے دکھانے کی قابلیت سے اکثر جگہہ صاف
انکار کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اور میرے خیال میں ان کا یہ انکار اسبات کا
ثبوت ہے کہ ان کے لئے ایسا کرنا ممکن ہی نہ تھا ورنہ یقیناً وہ فوق الفطرت
شہادت کی قیمت اور وقعت سے بے خبر نہ تھے۔ اس لئے لازمی
نتیجہ یہ ہی نکلتا ہے کہ نہ وہ اللہ کی طرف سے مبعوث کئے گئے تھے
اور نہ ان میں کوئی ربانی طاقت موجود تھی" ہم خوشی سے اس الزام
کو تسلیم کئے لیتے ہیں کہ فی الواقع پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام
معجزے دکھانے پر قادر نہ تھے۔ مگر اس سے فاضل مصنف نے جو
نتیجہ نکالا ہے۔ اس کے متعلق اپنی کچھہ رائے ظاہر کرنے سے پہلے ہم
معجزات کے متعلق ایک اور مشہور اور مستند یوروپین فاضل ڈاکٹر ہینس
کی رائے بھی لکھنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے " دنیا میں مذہبی مسائل کے

[1] ماخوذ از Evidences of Cheristianity

قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ ۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤى اِلَیَّ (ع ۴ پ ۷)	میں تو تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں۔ اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں میں تو اسی پر چلتا ہوں جو مجھ پر وحی کیجاتی ہے۔

وہ عجائب پرست لوگ اس پر اعتبار نہیں کر سکتے تھے۔ اور ان کو تعجب ہوتا تھا کہ کسی معمولی آدمی پر وحی کیونکر آسکتی ہے۔ اس کے لئے تو کوئی فرشتہ ہونا چاہیئے۔

اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا۔	کیا اللہ نے آدمی کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔

مگر اسلام اس کا کتنا معقول جواب دیتا ہے کہ اگر دنیا میں فرشتے رہتے ہوتے تو اللہ پیغمبری کے لئے بھی فرشتوں ہی کو مامور کرتا مگر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ آدمیوں کی رہبری کے لئے کوئی غیر جنس کی مخلوق بھیجتا۔

قُلْ لَّوْ كَانَ فِی الْاَرْضِ مَلٰٓىِٕكَةٌ یَّمْشُوْنَ مُطْمَىِٕنِّیْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا۔ (ع ۱۰۔ پ ۱۵)	تو کہہ دے کہ اگر زمین پر فرشتے بہ اطمینان چلتے پھرتے ہوتے تو ہم ان پر آسمان سے فرشتے ہی کو رسول بنا کر بھیجتے۔

اول تو یہ بات ہوتی ہی خلاف فطرت اور اگر ایسا ہوتا بھی تو پھر انسان کا اشرف المخلوقات ہونے کا دعوے کہاں رہتا۔ لیکن اس زمانے کے لوگوں میں تو اس باریک نکتے تک پہنچنے کی قابلیت ہی نہ تھی نہیں۔ اس زمانے کی کیا قید ہے اب بھی بہت سے آدمی اسکو نہیں

واقعہ ہے جسے معدودے چند آدمی ہی دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے لیے پھر
اسکی ضرورت ہے کہ آدمیوں کے قول اور روایت کا اعتبار کیا جائے
اور یوں اللہ کی بجائے انسان پر ایمان لایا جائے۔ ان وجوہ سے کسی
مذہب کی تصدیق کے لئے معجزات کی شہادت پیش کرنے سے
اسکی صداقت کی بجائے اس کے جھوٹے اور بے بنیاد ہونے کا احتمال
ہوتا ہے کیونکہ سچ کو ایسے شہادتوں کی ضرورت نہیں ہے"۔ ان
اعتراضات کا جواب ڈاکٹر پیلی دیں تو دیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنے
مذہب کی صداقت کو معجزات ہی پر مبنی رکھا ہے۔ لیکن جہاں تک
میرا خیال ہے انہوں نے یہ تکلیف گوارا نہیں فرمائی حالانکہ یہ اعتراض
خود انہی کے ایک ہموطن اور ہم قوم کے کئے ہوئے ہیں جو انکی تصنیف
سے بہت پہلے شائع ہو چکے تھے بہرحال ہمکو تو یہ اعتراض خدا لگتے معلوم
ہوتے ہیں اور ہم اسی اصول کے مطابق مذہب اسلام کی صداقت کا
دعویٰ کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ہی ایک ایسا مذہب ہے
جس نے اپنا مدار معجزات اور خلاف فطرت واقعات پر نہیں رکھا
سچ ہے سچ کو ایسی شہادتوں کی ضرورت نہیں ہے۔

لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اسلام نے اپنی تصدیق
کے لیے کوئی ثبوت پیش کیا بھی ہے یا نہیں۔ بے شک کیا ہے۔
اور بڑا زبردست ثبوت پیش کیا ہے۔ مگر وہ کوئی عارضی اور ناپائیدار
کرشمہ نہیں ہے جسے کسی نے دیکھا اور کسی نے نہیں دیکھا۔ بلکہ

منوانے کے لئے جتنی قسم کی تصدیقیں وضع کی گئی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ عجیب اور ناقابل اعتبار وہ ہیں جن کو معجزات کہتے ہیں خواہ وہ کیسی ہی کامیابی سے کیوں نہ دکھائے گئے ہوں۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ کیونکہ اول تو جہاں کسی عقیدے کے منوانے کے لئے شعبدہ بازی کی ضرورت ہو (اور معجزہ بہرحال ایک طرح مداری کا کھیل ہی ہے) تو خود یہی بات اس عقیدے کی کمزوری اور خامی کی دلیل ہے۔ دوسرے یہ امر اللہ تعالیٰ کی شان سے۔ بالکل بعید ہے۔ کہ وہ لوگوں کو متحیر کرنے کے لئے شعبدہ بازی اور کرشمہ سازی پر اُتر آئے۔ تیسرے یہ تصدیق بھی نہایت ہی عجیب اور مشتبہ قسم کی ہوگی۔ کیونکہ یہ خود اس معجزے پر مبنی نہیں ہوگی۔ بلکہ اس کا مدار معجزے کی روایت کرنے والے کی راستبازی پر ہوگا۔ جو کہتا ہے کہ میں نے ایسا واقعہ ہوتے ہوئے دیکھا۔ اور یوں اگر وہ معجزے سچ بھی ہوں تب بھی ان کے تسلیم کئے جانے کی اتنی ہی امید ہے۔ جتنی اس صورت میں جبکہ وہ بالکل جھوٹ ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔ غرض جس پہلو سے معجزات پر غور کریں۔ نتیجہ یہ ہی نکلتا ہے کہ ان کا وقوع خلاف قیاس اور ان کا وجود غیر ضروری ہے۔ کیونکہ اگر وہ سچ بھی ہوں تو بھی ان سے کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلتا۔ معجزے کو تسلیم کرنے سے تو یہی بہت زیادہ آسان ہے کہ کسی اخلاقی اصول کو مان لیں جسکی تصدیق کسی خلاف فطرت شہادت کی محتاج نہیں۔ بہرحال معجزہ ایک عارضی اور ناپائیدار

أَسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔	تو کہدے کہ اگر تمہارا یہ دعوے سچ ہے تو تم اس جیسی ایک ہی سورت بنالاؤ اور اللہ کے
ع ۳ ۔ پ ۱۱ ۔	سوا جسے چاہو اپنی مدد کے لئے بلالو ۔

کہا جاتا ہے کہ یہ معجزہ قرآن مجید کی بے نظیر فصاحت و بلاغت میں ہے بلاشبہ یہ درست ہے اور اس میں کم سے کم کسی اہل زبان کو تو کبھی کچھ کلام نہیں ہوا ۔ یہاں تک کہ عرب جاہلیت کے امیر الشعرا امراؤالقیس کی بہن نے یہ کلام پاک دیکھکر اپنے بھائی کا بہترین قصیدہ جو سبعہ معلقہ کا گل سر سبد تھا دیوار کعبے سے اتار کر چاک کر ڈالا تھا ۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو جناب رسالت مآب کے قتل کی نیت سے جارہے تھے اپنے بھائی کی زبانی اسکی چند آیتیں سنکر مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے ۔ یہ سب کچھ صحیح ۔ مگر پھر بھی مخالفین کہہ سکتے ہیں کہ محض فصاحت و بلاغت کوئی ایسی صفت نہیں ہے جس کی بنا پر کوئی کتاب کلام اللہ کہی جا سکے ۔ اور بہر حال اگر یہی معیار صحیح مان لیا جائے تو ہر ایک قوم اور ہر ایک زبان میں بہت سے لوگ اس رتبۂ عالی کے مدعی ہو جائیں گے ۔ اور چونکہ ہر جگہ اسلوب بیان جداگانہ ہے ۔ اس لئے مختلف زبانوں کی کتابوں میں محاکمہ کرنا آسان نہ ہوگا ۔ اور یوں قرآن مجید کا اعجاز مسلمہ نہ رہے گا ۔ اور اسکی فضیلت معرض بحث میں پڑ جائے گی ۔ ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ اسلام کا کوئی دعوے ایسا نہیں ہے جس کیلئے

ایک دائمی اور مستقل معجزہ ہے جسے ہر شخص ہمیشہ دیکھ سکتا ہے۔ وہ کوئی نظر فریب اور تحیر خیز شعبدہ نہیں ہے۔ بلکہ نہایت مضبوط اور معقول شہادت ہے۔ آخر وہ ہے کیا۔

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ	بلکہ وہ کلام مجید ہے جو لوح محفوظ میں ہے

یہ وہ چیز ہے کہ جو سفینوں سے زیادہ سینوں میں اور صفحوں سے بڑھکر دلوں میں محفوظ ہے۔ اور جس کو انشاء اللہ قیامت تک ایک نقطے کے زیر و زبر ہونے کا ڈر نہیں ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (ع ا پ)	بیشک ہم نے اس ذکر کو اتارا ہے۔ اور تحقیق ہم اسکی حفاظت کرنے والے ہیں۔

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ دنیا کی اور کوئی کتاب بھی اتنے عرصہ تک اس قدر احتیاط اور اتنی حفاظت سے رکھی گئی ہے۔ فی الواقع جس نے ایسی شد و مد سے شروع ہی میں اسکی حفاظت کا ذمہ لیا تھا اسکو اس کے محفوظ رکھنے کا طریقہ بھی اچھی طرح معلوم تھا۔ اور آج ساری دنیا گواہ ہے کہ یہ وعدہ صادقہ کیسی خوش اسلوبی سے پورا ہو رہا ہے۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسلام کے اس ایک اکیلے مگر دائمی اور ابدی معجزہ میں وہ کونسی بات ہے۔ جس کی بناء پر یہ عام چیلنج دیا گیا ہے۔ کہ

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۔ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ	کیا وہ کہتے ہیں کہ اس کلام مجید کو پیغمبر نے خود بنا لیا ہے۔

کے لیئے انسانی ارادے کی محتاج نہیں ہے۔ وہ ہر ایک زمانے میں ہر ایک قوم کو یکساں نصیحت کرتی رہی ہے۔ اور وہی انسان کو اللہ کی بابت وہ تمام باتیں بتاتی ہے۔ جن کے جاننے کی اسے ضرورت ہے۔ (یہ بالکل سچ ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس راز قدرت کو اسلام کے سوا اور کسی نے سمجھا اور قرآن مجید کے سوا اور کسی نے سمجھایا؟) اگر ہم اوسکی قدرت کاملہ پر غور کرنا چاہیں تو وسعت مخلوقات ہمارے سامنے ہے۔ اگر ہم اوسکی حکمت بالغہ کا مطالعہ کرنا چاہیں تو نظام عالم کا حسن انتظام ہمارے پیش نظر ہے۔ اگر ہم اس کے جود بے نہایت کو دیکھنا چاہیں تو اس کثرت اور فراوانی کو دیکھ سکتے ہیں جس سے اسنے زمین کے خزانوں کو مالا مال کیا ہے۔ اگر ہم اس کے الطاف بے پایاں کا تصور کرنا چاہیں۔ تو اس انعام و احسان پر قیاس کر سکتے ہیں۔ جو ناشکر نعمتوں اور ناشکر گزاروں کو بھی محروم نہیں رکھتا۔ غرض ہم اگر خدا کو جاننا چاہیں۔ تو ہم صفحۂ کائنات سے اس کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں" یہ ہے وہ معیار جو مذاہب عالم کی آزمائش کے لئے ایک مذہب فلسفی نے پیش کیا ہے۔ اور کلام مجید کا اصلی اعجاز یہی ہے کہ وہ اسی کتاب کائنات کا خلاصہ اور اسی صفحۂ قدرت کا دیباچہ ہے اور یہ دعویٰ دنیا کی اور کوئی کتاب نہیں کر سکتی۔ اسنے اپنے پیغمبر سے معجزات صادر نہیں کرائے۔ اور اپنے اللہ کی طرف خلاف فطرت شعبدے منسوب نہیں کیئے بلکہ اس راز قدرت کو حل کیا کہ وہ ذات

کسی کو سچے دل سے غور کرنے کے بعد چون و چرا کرنے کی گنجایش ہو۔ اس لئے محض شفتگی الفاظ اور برجستگی عبارت کے علاوہ ہم کو کلام پاک کی اور صفتوں پر نظر ڈالنی چاہیئے۔

حقیقت میں قرآن مجید کا سب سے بڑا اعجاز اسکی وہ تعلیم ہے جو اپنی اخلاقی خوبیوں کے لحاظ سے عدیم المثال اور اپنے مطابق فطرت ہونے کی حیثیت سے یکتا ہے۔ مگر اس پر بحث کرنے سے پہلے ہم کو مذہبی اصول کے فطری اور معقول ہونے کا کوئی معیار قایم کر لینا چاہیئے۔ تاکہ اسی کے مطابق تعلیم قرآن کی عمدگی دیکھی جاسکے۔ یہ معیار ہم اپنی طرف سے پیش نہیں کرتے بلکہ پھر اسی مصنف کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جو میرے خیال میں اصول مذاہب کا سب سے زیادہ سخت اور معقول پسند نکتہ چین ہے اور جس کی رائے معجزات کی بابت ہم اوپر درج کر چکے ہیں۔ وہ کہتا ہے "اللہ[۱] کے کلام کے متعلق ہمارے سارے قیاسات صفحہ کائنات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ کائنات ہی ایک ایسی چیز ہے جس کی زبان انسانی بولیوں کے اختلاف اور گوناگونی کے باوجود ہر جگہہ یکساں ہے اور جسے ہر شخص پڑھ اور سمجھہ سکتا ہے۔ نہ اسکے گمنے کا ڈر ہے نہ اس میں جعل کا اندیشہ ہے۔ نہ اسکے نقل کا احتمال ہے۔ نہ اس میں تحریف کا امکان ہے۔ وہ اپنی اشاعت

---

[۱] ماخوذ از The age of Reason حصہ اول۔ مصنفہ ٹامس پین

فَبُهِتَ الَّذِیْ کَفَرَ	وہ ناشکرگزار شخص حیران ہوکر رہ گیا۔

اس لئے قرآن مجید میں معجزات پیش نہیں کیے گئے۔ بلکہ ان آیاتِ ربانی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو ہمیشہ ہر شخص کے سامنے موجود رہی ہیں مگر جن کی اہمیت پر اس پہلو سے اسلام کے سوا اور کسی مذہب نے توجہ نہیں دلائی۔ کیونکہ وہ ان کو اللہ کی نشانیاں سمجھے ہی نہیں۔ اور خلافِ فطرت شہادتوں ہی کی لاطائل جستجو میں رہے۔ یہاں قرآن مجید کے اس اعجاز کی فقط ایک مثال ہی کافی ہے ورنہ یوں تو اس میں اول سے آخر تک ہر جگہہ آیاتِ الٰہی کا ہی ذکر ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَاۤ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا وَجَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ وَمِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ (الروم ع ۲ پ ۲۱)	اور اوسکی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اسنے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر چند دن میں تم آدمی بنکر پھیلے اور پھرتے ہو۔ اور یہ بھی اسکی نشانی ہے کہ اسنے تمہارے لئے تمہاری جنس کی بی بیاں بنائیں تاکہ تم کو ان سے آرام ملے اور اسنے تم میں محبت اور ہمدردی پیدا کی۔ سوچنے والوں کے لئے اسمیں نشانیاں ہیں۔ اور اُس کی نشانیوں میں سے آسمان اور زمین کا بنانا اور تمہاری زبانوں اور آنکھوں میں اختلاف ہے اسمیں بھی جاننے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

جس کا حکم کائنات کی ہر ایک شئے میں کارفرما ہے جس کا پرتو ذرہ سے لیکر آفتاب تک میں نور افشاں ہے۔ جس کا اثر چونٹی سے لیکر انسان تک میں جلوہ افروز ہے۔ وہ ایک ہے۔ اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ اوس کے احکام یکساں ہیں۔ اور ان میں کبھی خلل نہیں آتا۔ دنیا کی ہر ایک چیز اس کی قدرت کی شاہد اور اسکی حکمت کی گواہ ہے۔ اور اوس کے ماننے اور اسپر ایمان لانے کے لیئے انھیں پیش پا افتادہ چیزوں پر غور کرنا کافی ہوتا ہے معجزات اور خوارق عادت تو اون کو پیش کرنے چاہئیں جو اس سے انکار کرتے ہوں اور اوس کے بجائے کسی اور خالق کو مانتے ہوں۔ اور یوں اسکے احکام اور قوانین قدرت کو توڑ کر اس سے بالا اور برتر کسی اور طاقت کا استدلال کرتے ہوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبانی نمرود سے یہ ہی کہا گیا ہے۔

فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ

یعنی ہمارا معبود تو وہ ہے جس کے حکم کے مطابق سورج روز مشرق سے نکلتا ہے اب اگر تجھے اس کارفرما قوت سے انکار اور انحراف ہے تو تو اس قانون کو بدلدے اور سورج کو مغرب سے نکالدے۔

ظاہر ہے کہ وہ اس کا کیا جواب دے سکتا تھا۔ وہ اس نکتہ کو سمجھنے کے بھی قابل نہ تھا۔ اور نتیجہ یہ ہی ہوا کہ۔

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ۔ (ق ع ۱ پارہ ۲۶)	اور اسمیں کہیں شگاف نہیں ہے۔ اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور اسمیں بھاری پہاڑ پلا دیئے اور اسمیں سے ہر قسم کی خوشنما چیزیں اگائیں جو ہر ایک توجہ کرنے والے بندے کے لئے ایک تماشا اور سبق ہیں۔

سبحان اللہ اس سے ڈریپر نے کتنا عمدہ اور معقول نتیجہ نکالا ہے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ کلام پاک کے ترجمے کو دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ اعمل کا مطالعہ تو اوسکو کہاں نصیب۔ تو شائد وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ علم ہیئت۔ یا طبقات الارض کا کوئی رسالہ پڑھ رہا ہے۔ مگر یہ اس کی صریح غلط فہمی تہی۔ مذہب اسلام اپنے اصول کی صداقت کے لئے۔ نجوم۔ طبقات الارض یا تشریح الابدان سے بے نیاز ہے اور کلام مجید ان متفرق مضامین کے منتشر مسائل کی کچکول نہیں ہے بلاشبہ اس میں جگہہ جگہہ ان واقعات کا ذکر ہے۔ مگر ان کے علمی مسائل ہونے کے لحاظ سے نہیں۔ کیونکہ سرے سے نزول قرآن کا یہ منشا ہی نہیں تھا کہ بادیہ نشینان عرب کو ان لایعنی اور غیر ضروری باتوں کی تعلیم دے۔ بلکہ اِن کا ذکر اس وجہ سے کیا گیا ہے۔ کہ مخاطب دیکھیں کہ وہ اپنے خالق حقیقی کی قدرتِ کاملہ اور حکمت بالغہ کی کیسی نمایاں نشانیاں اور کتنی روشن مثالیں ہیں۔ اور انکو دیکھ کر اپنے اور ان کے بنانے والے اللہ جل شانہ، کے سامنے

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک بات اللہ کی قدرت اور حکمت کا کامل معجزہ نہیں ہے۔ یا ان میں سے کوئی نشانی بھی بڑے سے بڑے فطرت پرست اور معقول پسند فلسفی کے مقرر کردہ معیار پر ٹھیک نہیں اُترتی۔ لیکن قرآن مجید کے اس اعجاز تک پہنچنے کے لئے کسی قدر عقل اور فکر کی ضرورت ہے ورنہ پروفیسر ڈریپر کے سے اکثر مدعیانِ علم وخرد کو تو کلام پاک کی انہی آیتوں پر ہنسی آتی ہے۔ حالانکہ اگر کچھ تمیز ہو تو ان کو اپنی سمجھ پر رونا چاہیئے۔ ڈریپر اپنی نادانی اور کم فہمی کا ایک جگہ یوں ثبوت دیتا ہے "مشکوک و مشتبہ باتیں تو قرآن میں بہت ہیں۔ مگر جن باتوں کی صحت کا اچھی طرح امتحان ہو سکتا ہے ان کے ذکر میں یہ بالکل ناقص ہے۔ اس کا علم ہیئت اصُول آفرینش اور تشریح الابدان اتنا غلط اور مہمل ہے۔ کہ ہم کو ہنسی آتی ہے۔ وہ پرانے زمانے کی باتیں ہیں جبکہ علم انسانی بالکل ابتدائی حالت میں تھا۔ ہم سے یہ کہا گیا ہے کہ زمین پہاڑوں کے بوجھ سے اپنی جگہہ پر قائم ہے اور آسمان اسیر گنبد کی طرح محیط ہے اور پھر ہم سے یہ سوال کر کے ہم کو خدا کی قدرت اور حکمت کا قائل کیا جاتا ہے۔ کہ اگر ہو سکے تو ہم اس میں کوئی شگاف ڈھونڈ نکالیں" بیشک قرآن مجید کا یہ ہی ارشاد ہے۔

اَفَلَمْ يَنظُرُوٓا۟ إِلَى ٱلسَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ	کیا یہ لوگ اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھتے کہ
بَنَيْنَٰهَا وَزَيَّنَّٰهَا وَمَا لَهَا مِن فُرُوجٍ	ہم نے اسے کیسا بنایا اور کیسا آراستہ کیا اور

لئے مثالاً انہوں نے وہی چیزیں لیں۔ جو لوگوں کے سامنے رہتی تھیں اور ان کو اسی پیرائے میں بیان کیا۔ جس سے وہ لوگ مانوس تھے کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو وہ اصل بحث سے دور جا پڑتے۔ اور لوگ اللہ کی نشانیوں پر غور کرنے کی بجائے ان امور کی کیفیت اور ماہیت کے مباحثوں میں پڑ جاتے۔ ڈریپر کو اس قول پر ہنسی آتی ہے کہ پہاڑوں کو زمین کی میخوں اور آسمان کو گنبد سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اور اسکے بے درز ہونے کی طرف توجہ دلا کر خدا کی قدرت کا استدلال کیا گیا ہے۔ مگر ہم کو اسکی ہنسی پر تعجب ہوتا ہے کہ اسمیں ہنسی کی کون سی بات ہے اللہ کی قدرت کی اس سے زیادہ پسندیدہ مستقل اور دائمی مثال تو کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ کیا اب زمین کو گول مان لینے اور آسمان کو بصر سمجھ لینے سے اس میں کچھ ضعف آگیا۔ ہرگز نہیں البتہ یہ کہئے۔ کہ ان لوگوں میں آثار قدرت پر غور کرنے اور ان سے ان کے خالق حقیقی کا استشہاد کرنے کی قابلیت مٹ گئی۔ ورنہ وہ کبھی ایسا لچر اعتراض نہ کرتے۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا۔ (محمد ع ۳ پ ۲۶)	پس کیا وہ قرآن پاک پر غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔

انصاف کیجئے۔ آج کل سائینس کی عالمگیری کے زمانے میں بھی یہی حالت ہے کہ اگر ہم کو کسی سے صبح کی تعریف کرنی ہوگی تو یونہی کہیں گے کہ میاں دیکھو کیا سہانا سماں ہے۔ کیسا دلکش وقت ہے۔ آسمان

سر عجز و نیاز خم کریں - اس مدعا کے حاصل کرنے کے لئے اس امر کی مطلق ضرورت نہ تھی - کہ ان باتوں کی مشتبہ اور مختلف فیہ فلسفیانہ چھان بین کی جاتی - اور ان کی اصلی اور حقیقی ماہیت پر لکچر دئے جاتے - حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کام کے لئے مبعوث نہیں ہوئے تھے - بلکہ فی الواقع ان کے ایسا کرنے سے اصلی مطلب ہی فوت ہو جاتا۔ کیا آفتاب اور ماہتاب کی زندگی بخش شعاعیں اور رات دن کی پیاپے گردشیں اپنے صانع کے جاہ وجلال کے اظہار کے لئے اصول فیثاغورث اور نظام بطلیموس کی صحت اور صداقت کی محتاج ہیں - بلکہ حقیقت میں وہ شخص جو ان بحثوں کی الجھن میں نہیں پڑتا - بلکہ سادگی اور صاف دلی سے ان حیرت انگیز آثار قدرت پر غور کرتا ہے - اس کا انکے مطالعہ سے عرفان الٰہی تک پہنچنا اس شخص کی نسبت بہت زیادہ قرین قیاس ہے - جو فلسفیانہ طریقہ سے ان کی تفتیش کر کے اس عجیب و غریب طلسم کو محض کشش ثقل کا ایک کرشمہ سمجھ کر چھوڑ دیتا ہے اور جسکی نظر مادے اور قوت کی بھول بھلیوں کے آگے نہیں جاتی - ہم یہ نہیں کہتے کہ اس سلسلہ سے معاملات عالم کی تحقیق کچھ مفید نہیں ہے - نہیں - ہے اور ضرور ہے - مگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم - اس غرض سے نہیں آئے تھے اور کلام مجید اس مقصد کے لئے نازل نہیں ہوا تھا - وہ مخلوق کی خالق کی طرف رہنمائی کرنے لئے آئے تھے اور اسکے

وجہ سے مجھ سے بن نہیں پڑتا) تب وہ اس حالت سے زیادہ متاثر ہوتا۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ جن الفاظ میں ہمنے اس وقت کا نقشہ کھینچا ہے۔ وہ گو فلسفیانہ صداقت سے معرا ہوں، مگر اپنے اظہار مطالب کے لئے۔ بالکل کافی اور نہایت موزوں ہیں۔ اگر ان میں اس سے زیادہ علمی صحت کا لحاظ کیا جائے تو اصل مقصد ضائع ہو جائے۔ اور سننے والے کا دماغ صبح کے سہانے وقت کا مزہ لینے کی جگہہ علم مناظر اور ہیئت کی بحثوں کی طرف منتقل ہو جائے۔ بشرطیکہ وہ ان کو جانتا ہی ہو اور اگر کہیں وہ شخص بیچارہ ان علوم مغربی سے بے بہرہ ہوا تو وہ خاک بھی نہ سمجھے گا کہ اس ہرزہ سرائی کا کیا مطلب ہے۔

چونکہ بحث بہت اہم ہے۔ اسلئے توضیح کے واسطے ایک مثال اور لیجئے۔ فرض کیجئے کہ میں اپنے چھوٹے سے بچے کو میجک لینٹرن کے تماشے میں لے گیا۔ وہاں میں نے پردے پر ایک بہت خوشخط تحریر کا عکس دیکھ کر اس سے کہا کہ "میاں دیکھو کتنا عمدہ اور خوبصورت لکھا ہوا ہے۔ تم کو بھی ایسا ہی لکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے" یہاں میرا مطلب یہ کہنے سے فقط اس بچے کو خوشنویسی کی مشق کی ترغیب دلانا تھا۔ اور کچھہ نہیں۔ تو کیا اس صورت میں میرے اس قول سے یہ مستنبط ہو گا کہ یا تو میں نے اس بچے کو عمداً دھوکا دیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ حقیقت میں وہاں کچھہ لکھا ہوا نہیں ہے نہ اچھا نہ برا یا یہ کہ میں خود ہی میجک لینٹرن کے اصول اور پردے پر تحریر کا

پیلے پیلے بادل چھارہے ہیں۔ مشرق سے آفتاب نکلتا آتا ہے۔ اے لو دن نکل آیا سارے میں کیسی سفید روشنی ہوگئی۔ وغیرہ وغیرہ" میرے خیال میں اس عبارت پر کوئی یہ اعتراض نہیں کرسکتا۔ کہ یہ باتیں لغو اور غلط ہیں۔ یا یہ واقعات جھوٹے اور بے بنیاد ہیں۔ حالانکہ اگر سائنس کی عینک لگا کر دیکھا جائے تو ان میں سے کوئی بات بھی صحیح نہیں ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ آفتاب کا نکلنا غلط ہے۔ کیونکہ اس کا یہ ظاہری روزانہ سفر محض زمین کی گردش محوری کا نظر فریب نتیجہ ہے۔ یہ کہنا بھی ٹھیک نہیں کہ سورج کے نکلتے ہی دن ہوگیا۔ کیونکہ سورج جب نظر آنے لگتا ہے۔ تب بھی واقع میں وہاں موجود نہیں ہوتا بلکہ یہ صرف انعطاف نور[۵] کا دھوکا ہے۔ دن کی روشنی کو سفید کہنا بھی جائز نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ یہ سات مختلف رنگوں کا مجموعہ ہے۔ اور آسمان پر بادلوں کا ہونا تو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ آسمان کا وجود ہی نہیں ہے اور بادل ہوا میں ہوتے ہیں۔ یہ سب درست۔ ہم اسے تسلیم کرتے ہیں کہ ہمنے جو کچھ کہا غلط کہا۔ مگر صرف اتنا پوچھتے ہیں کہ سامع کے ذہن میں ہمارے ان فقرات نے صبح کی کیفیت کو زیادہ اچھی طرح منتقش کیا۔ یا اگر ہم تحقیقات سائینس کے لحاظ سے اس کی درستی کا پورا خیال رکھ کر اس مطلب کو ادا کرتے (جو میری لاعلمی کی

---

[۵] انعطاف نور Refraction یہ اصول ہے کہ جب روشنی کی شعاع جو بالکل سیدھی ہوتی ہے کسی رقیق اور لطیف مادے میں سے کسی زیادہ غلیظ اور کثیف مادے میں گزرتی ہے۔ تو اسمیں کجی آجاتی ہے

کا اتہام لگائے تو یہ خود اسکی غلطی اور نادانی ہے۔
اب دیکھیے کہ اگر کلام مجید میں۔ زمین کو ایک طرح کا فرش کہا اور پہاڑوں کو اسکی میخوں سے تشبیہ دی۔ تو کیا بُرا کہا۔ ہمارے خیال میں تو نہایت ہی اعلیٰ درجے کی تشبیہ ہے۔ ہم زمین پر رہتے سہتے ہیں۔ اُٹھتے بیٹھتے ہیں۔ چلتے پھرتے ہیں۔ بچپن میں اس پر کھیلتے ہیں۔ جوانی میں اسپر کام کرتے ہیں۔ بڑھاپے میں اسی پر آرام لیتے ہیں۔ اور مرنے کے بعد اسی میں چھپ جاتے ہیں۔ یہ باتیں تو بدیہی ہیں جو سب پر گزرتی ہیں اور سب کو پیش آتی ہیں۔ اس لئے زمین کو مہاد کہنا تو نہایت ہی مناسب اور موزوں ہے جس سے فوراً دماغ میں ان تمام باتوں کا تصور گزر جاتا ہے اور پھر اس کے ساتھ ہی اللہ تعالے کی قدرت کا خیال آجاتا ہے۔ اب اگر اس کی بجائے یہ کہا جاتا "کہ دیکھو ہم نے زمین کو گنبد بلکہ نارنگی کی طرح سے گول بنایا ہے کہ سارے فضائے محیط میں لڑھکتی اور چکر کھاتی پھرتی ہے۔ مگر سورج کی کشش اسے نہیں ٹھہرنے دیتی"، تو بلاشبہ یہ اشارہ بھی اظہار قدرت کے لئے کافی ہوتا۔ اور اس کے علاوہ تحقیقاتِ جدیدہ کو بھی اسپر نکتہ چینی کا موقعہ نہ ملتا۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس سے خاک نشینانِ عرب کیا سمجھتے جبکہ زمین کے گول ہونے کا خیال بھی دماغوں میں نہیں گزرتا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ابتک بھی آسانی سے یہ تصور نہیں ہو سکتا کہ اس گنبد کی دوسری جانب ہمارے مقابل کے آدمی کس طرح سر نیچا

عکس پڑھنے کے قواعد سے ناواقف تھا۔ ہمارے خیال میں یہ دونوں نتیجے نکالنے غلط ہیں۔ کیونکہ ممکن بلکہ قرین قیاس ہے کہ مجھے اچھی طرح سے معلوم ہو کہ دراصل پردے پر کچھ لکھا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک تحریر کا عکس ہے جو لالٹین کے ذریعے سے اسپر ڈالا جا رہا ہے۔ اور میں خواہ مخواہ اپنے بچے سے جھوٹ بولکر اسے دھوکا ہی دینا نہ چاہتا ہوں۔ بلکہ بات فقط اتنی ہو کہ مجھے محض خوشخطی کی ایک مثال دکھا کر اسے لکھنے کا شوق دلانا منظور ہے۔ اور چونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ بچہ ابھی میجک لینٹرن کے اصول اور عکس پڑنے کی پوری کیفیت سمجھنے کے قابل نہیں ہے اور اس سمجھانے سے اس کے دماغ میں الجھن اور پریشانی کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ بلکہ میرا اصلی مقصد (یعنی خوشنویسی کی تشویق) ہی جاتا رہے گا۔ اس لئے میں نے مزید تشریح اور تفصیل کی ضرورت نہ سمجھی۔ اور اس سے عکس وغیرہ کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس صورت میں میرا سکوت میری دروغ گوئی یا میری نادانی پر مبنی ہے۔ ہرگز نہیں۔ بعینہ یہی مثال قرآن مجید کی آیات کی ہے جن میں اللہ کی نشانیوں کی طرف اشارہ کرکے ان سے اللہ کی قدرت کو سوچنے اور سمجھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اصل منشا فقط خالق حقیقی کی طرف توجہ دلانا ہے۔ ان باتوں کو بتانا نہیں ہے۔ اور اگر کوئی شخص ان میں سے کسی بات کی ظاہری غلطی کی بنا پر کلام پاک پر غلط بیانی

فرش اور پہاڑوں کو اسکی میخیں کہا ہے - اسی طرح آگے چل کر آفتاب کو
سراج وہاج فرمایا ہے تو کیا اس سے یہ سمجھا جائے گا کہ کلام پاک نے ہم کو یہ بتایا
ہے کہ آفتاب ایک چھوٹا سا مٹی کا چراغ ہے - جس میں ہر روز کوئی فرشتہ
تیل ڈالتا ہے اور اسکی بتی جلاتا ہے یا یہ کوئی بھڑکتی ہوئی مشعل ہے جسے ایک
جن چاروں طرف لئے پھرتا ہے یا سے اس طرح کے اور کچھہ معنے پہنائے
جائیں تو کیا یہ درست ہوگا - ہرگز نہیں - قرآن مجید نے آفتاب کی اور
اُسکے نور کی ماہیت سے بحث ہی نہیں کی اور اسکی بابتہ فرمایا ہی نہیں کہ
آیا آفتاب کی روشنی اس کے آس پاس کے گیسوں کے جلنے کی وجہ سے
ہے (جن کے شعلے بعض وقت دو دو لاکھہ میل بلند ہو جاتے ہیں اور پھر
یہ گیس آیا ہائیڈروجن ہے یا ہیلیم ہے یا اور کوئی نامشخص گیس) یا اس کا سبب
اسکی وہ اندرونی اور طبعی حرارت ہے جس نے کرۂ آفتاب کو کورۂ نار اور چشمہ نور بنا
رکھا ہے اور پھر اس طبعی حرارت کی وجہ آیا تصادم شہب ہے یا کچھہ اور یا اس کا باعث
کوئی نامعلوم برقی کیفیت ہے جو اس میں کارفرما ہے یہ مختلف قیاسات
ہیں جو علماے سائنس نے نور آفتاب کی بابت پیش کئے ہیں مگر جن میں
محقق اور یقینی کوئی بھی نہیں ہے سب ظنیات ہی ہیں - حالانکہ

اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا | بیشک محض قیاس تحقیق سے بالکل بے نیاز نہیں ہے

اور یقیناً کلام پاک کی شان اس سے بہت ارفع ہے کہ وہ اپنے اصلی منشا
کو چھوڑ کر ایسی لغو اور فضول بحثوں میں پڑتا - اسنے جو کچھہ فرمایا ہے وہ ہر حال
میں جیسے پہلے درست تھا ویسے ہی اب بھی صحیح ہے - سورج جلسے تب

کئے ہوئے کھڑے ہیں۔ اور گر کیوں نہیں جاتے (ممتحن کے ڈر کے مارے لکھ دیں کہ سمجھ لیا تو دوسری بات ہے آپ اس کا تصور کرنے کی کوشش کیجئے تو آپ کو اس قول کی تصدیق ہو جائیگی) وہ فوراً اس مسئلے پر اُلجھنے لگتے اور یوں اس قول کا اصل مطلب فوت ہو جاتا اور نتیجہ کچھ بھی نہ نکلتا۔ مگر اس تشبیہ کی خوبی دیکھئے کہ اب گو زمین چپٹی نہیں رہی۔ گول ہو گئی۔ مگر پھر بھی جس حیثیت سے اسکو فرش کہا گیا ہے وہ حیثیت نہیں بدلی۔ وہ اب بھی ہمارا گہوارہ ہے۔ جس میں ہم پلتے ہیں وہ اب بھی ہمارا فرش ہے جسپر ہم رہتے ہیں۔ اب بھی فرش خاکی اسی طرح پھیلا ہوا ہے۔ اور لمبا چوڑا زمین ویسی ہی بچھی ہوئی ہے۔ اور جس طرح وہ پہلے خدا کی قدرت کی گواہی دیتی تھی ویسی ہی اب بھی دے رہی ہے اور ہمیشہ دیتی رہے گی۔

پھر اگر اس وسیع و عریض فرش کے لئے پہاڑوں کے میر فرش تجویز کئے گئے تو تشبیہ زیادہ تام ہو گئی۔ اور حسن بیان اور بڑھ گیا۔ ہاں اس سے یہ مطلب لینا کہ قرآن نے زمین کو فرش کی طرح چپٹا اور پہاڑوں کی وجہ سے اپنی جگہہ پر جما ہوا ہونا سکھایا ہے درست نہیں اگرچہ ہم یہاں اس بحث کو چھیڑ سکتے ہیں جو تحقیقات جدید نے پہاڑوں اور زلزلوں کے باہمی تعلق کی بابتہ کی ہے مگر نہیں ہم اس سے استدلال نہیں کریں گے۔ کیونکہ حقیقت میں کلام پاک کا یہ بیان ہی ہی بطور تشبیہ و استعارہ اور اس کے لفظی معنے لیکر ان کو خلاف واقعہ ثابت کرنا اور اس سے قرآن مجید کی تکذیب کرنا ہے ہی بالکل مہمل اور لغو۔ چنانچہ جس طرح زمین کو

وَزِينَةً وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ	گدھے پیدا کیے تاکہ تم اسپر سوار ہو اور وہ تمہارے لیے باعث زیبائش ہوں اور وہ ایسی چیزیں پیدا کرتا ہے جن کو تم نہیں جانتے

تو اس سے ہر شخص کا خیال جو کبھی گھوڑے خچر یا گدھے پر سوار ہوا ہے فوراً اللہ کے الطاف وعنایات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر ان کی بجائے بائیسکل۔ موٹر۔ ریل اور ہوائی جہازوں کا ذکر کیا جاتا تو وہ لوگ کیا سمجھتے جو ان کو جانتے ہی نہ تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے چند معروف مرکبوں کا ذکر فرما کر اور گوناگوں سواریوں کی طرف بالاجمال وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ کے اشارہ سے ارشاد۔ کر دیا۔ دیکھیے جولیس ورن[1] Jules Verne نے بعض ایسی چیزوں کا ذکر کیا جن کا وجود میں آجانا اس زمانہ میں ہی بالکل قرین قیاس تھا۔ چنانچہ چند ہی سال ہیں ان میں سے بعض عملی صورت میں آبھی گئیں مگر پھر بھی جولیس ورن کے ناول محض خیالی افسانے ہی رہے۔ اور نہ کسی نے ان کی واقعیت کی طرف خیال کیا۔ اور نہ ان کے مصنف کی مآل اندیشی اور غیب دانی کی تعریف کی۔ پس اگر کلام مجید بھی ڈریپر کی رائے کے مطابق آثار قدرت کے اظہار کے لیے۔ دنیا کے سامنے ایسی باتیں پیش کرتا۔ جو اس وقت کسی کے سان گمان میں بھی نہ تھیں (اور جنمیں اب بھی ہر طرح کا تغیر وتبدل ممکن ہے) تو خواہ اوسکی باتیں کتنی ہی صحیح اور سچی کیوں نہ ہوتیں مگر پھر بھی اس کا بیان ہمیشہ مہمل اور بے معنی رہتا اور اس سے دین ودنیا کا کوئی مطلب بھی حاصل نہ ہوتا۔ گر ایسا کرنے

[1] جولیس ورن فرانس کا باشندہ اور گذشتہ صدی کا ایک مشہور ناول نگار تھا

چمکتا تھا ویسے ہی اب بھی چمکتا ہے - اور خواہ مکاشفات جدید اس کی نوعیت اور ماہیت میں کتنے ہی تغیر و تبدل کیوں نہ کریں - مگر اس کے سراج وہاج ہونے میں کبھی کسی کو کچھ کلام نہ ہوگا - بعینہ اسی طرح آسمان کو بھی گنبد بے شگاف اور سقفِ محفوظ اور سبع شداد کہا گیا ہے - لیکن ان صفتوں سے اسکی اصلی ماہیت اور طبعی حقیقت کی تشریح اور تعلیم مدنظر نہیں ہے بلکہ فقط اوسکی وہ حالت جو نظروں کے سامنے ہے اور اسکی بابت وہ خیالات جو اس زمانے میں لوگوں کے دلوں میں تھے - سامنے رکھکر ان سے اللہ جل جلالہٗ کی صناعی اور کاریگری کی طرف متوجہ کرنا تھا - اور اس کے لئے اس کے سوا اور کوئی اسلوب بیان ممکن ہی نہ تھا - کیونکہ یقینی بات ہے کہ اگر یوں کہنے کی بجائے اسے محض حدِ بصر کہہ دیا جاتا تو عوام اس بات کا خیال بھی نہ کرتے اور خواص اصل مقصد کو چھوڑکر اوسکی تعریف پر بحث کرنے لگتے -

حقیقت میں اس غرض کے لئے فصاحت کا مقتضا - بلکہ گفتگو کا طریقہ ہی یہ ہے کہ صرف انہی باتوں کو لیا جائے جو سب میں معروف ہوں اور ان کو اسی طرح سے بیان کیا جائے - جو سب کو معلوم ہوتا کہ سننے والے اس سے متنبہ ہو سکیں - ورنہ جس بات کو وہ جانتے ہی نہ ہونگے اس سے سبق اور عبرت کیا حاصل کریں گے - کلام پاک نے اللہ کی رافت اور رحمت کے بیان میں ارشاد فرمایا کہ

اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَ	بیشک تمہارا پروردگار بڑا عنایت کرنے والا اور مہربان ہے - اور اس نے گھوڑے اور خچر اور

برخلاف مسیحی اور یہودی مذہبوں نے جو جو واقعات اور معجزات بیان کیے ہیں۔ ان کو اپنے مسلمہ معتقدات کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور انکی صحت پر اپنا مدار رکھا ہے اس لئے اگر ان کا بیان کردہ کوئی واقعہ جھوٹ اور کوئی معجزہ غلط ثابت ہوجائے تو پھر خود انکی صداقت مشتبہ ہوجاتی ہے۔ اور چونکہ اسلام کی تعلیم تو خود ہی اس قدر سادہ اور سہل تھی کہ اس کے لئے کسی خارجی شہادت اور بیرونی تائید کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اس لئے اسلام نے اپنے پیغمبر صلعم کے لئے شعبدہ باز کی حیثیت گوارا نہ کی اور اپنی تصدیق کے لئے اپنے آپ کو ہی البصورت کلام مجید پیش کیا جو انشاءاللہ قیام عالم تک ہمیشہ زندہ اور موجود رہے گا اور اہل بینش واصحاب دانش کو راہ حق کی ہدایت کرے گا۔ اور جو شخص غور وانصاف سے اس کا مطالعہ کرے گا وہ صدق دل سے کہہ دے گا کہ

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ | یہ وہ کتاب ہے جس میں کچھ شک وشبہ نہیں ہے

اس تقریر سے نہ تو میرا یہ مطلب ہے کہ انبیائے سابقین کے معجزات

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۴ — اور اور بہت سی ایسی ہی عجیب وغریب مشینوں کا ذکر کیا ہے جن میں سے بعض بن بھی گئی ہیں اور ممکن ہے کہ آیندہ زمانے میں بعض بن جائیں مگر نہ مصنف نے انکو واقعیت کے لحاظ سے بیان کیا ہے نہ کوئی ان کو اس حیثیت سے پڑھتا ہے اس کی تمام کتابوں کا انگریزی میں اور بعض مثلاً تسخیر القمر کا اردو میں بھی ترجمہ شائع ہوچکا ہے۔

ہو سکتا تھا یہ کسی مختلف فیہ اور تغیر پذیر مبحث کی کتاب نہیں ہے بلکہ اسلام کا دائمی اعجاز اور اللہ کا کلام پاک ہے۔

الٓمّٓ۔ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ۔ (ع ۱ پ ۲۱ لقمان)	یہ حکمت والی کتاب کی نشانیاں ہیں جو ہدایت اور رحمت ہے ان نکوکاروں کے لئے جو نماز پڑھتے ہیں۔ اور زکوۃ دیتے ہیں اور آخرت کا یقین رکھتے ہیں۔

بعینہ جس اصول پر قرآن مجید میں اللہ کی قدرت اور حکمت کی یہ نشانیاں بار بار بیان کی گئی ہیں اسی اصول پر انبیائے سابقین کے معجزات کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور اس سے اسلام کی طرف سے ان کی تصدیق اور تائید کرنی ملحوظ نہیں ہے۔ بلکہ صرف ان مشہور و معروف قصوں کی طرف جن کو اس زمانے میں سب جانتے اور مانتے تھے اشارہ کر کے ان سے اللہ کی کمال قدرت و حکمت دکھانا منظور ہے۔ اور کچھ نہیں اب اگر کسی طرح سے ان کی صحت مشتبہ ہو جائے تو اس سے اسلام کی صداقت پر ذرا بھی حرف نہیں آسکتا۔ کیونکہ اسلام نے تو پہلے ہی سے کسی قانون الٰہی میں مستثنیات اور مشتبہات کو جائز نہیں رکھا۔ اور یوں صرف ایسے ہی واقعات کا امکان باقی رہ گیا جو گو بظاہر اس وقت کی معلومات کے لحاظ سے اعجاز اور خارق عادت معلوم ہوں۔ مگر حقیقت میں کسی قانون قدرت کے ناسخ یا مبطل نہیں ہوں گے۔ اس

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۳۔ اس نے قصوں کے پیرائے میں ہوائی جہاز اور آبدوز کشتیوں

اور اور آدمیوں میں مابہ الامتیاز ہے۔ اسی کے ذریعے سے قرآن مجید آنجناب پر نازل ہوا ہے اور یہی ایک ایسا فوق الفطرت معجزہ ہے جسے اسلام نے۔ ایک واجب التسلیم مذہبی اعتقاد کی شان سے پیش کیا ہے اسکے متعلق ہم کو علانیہ اعتراف ہے۔ کہ ہماری عقل فہم وحی کی ماہیت کے ادراک سے قاصر ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ ہم ابھی تک اپنے دماغ میں کسی مضمون کے عام طور پر سوچنے اور سمجھنے کی اصلی حقیقت سے بھی آگاہ نہیں ہیں۔ میرا دماغ سوچ رہا ہے اور میرا ہاتھ اس غور و فکر کے نتیجے کو کاغذ پر مقررہ علامات و اشارات کے ذریعہ سے لکھتا جاتا ہے مگر میں قطعًا یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہمارے سر کا وہ چپچپا اور لیسدار مادہ جسے مغز یا بھیجا کہتے ہیں کس طرح ان غیر مرئی اور غیر محسوس خیالات کو محفوظ رکھتا ہے کیونکر ان کی ترتیب و تنسیق کرتا ہے اور کن ذریعوں سے ان سے نتائج اخذ کرتا ہے۔ کیا اس کی تشریح کے لیے اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ ہمارے دماغ کے مادی ذرات آپس میں بلیرڈ کی گولیوں کی طرح ٹکرا ٹکرا کر ہر قسم کی مضمون آفرینی کر لیتے ہیں۔ غالبًا نہیں اور اگر فرض کیجیے کہ ایسا ہو بھی تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیونکر ہوتا ہے۔ ہم کو تو غالب مرحوم کا ہمنوا ہو کر یہی کہنا پڑتا ہے کہ ؎

شور یست نوا ریزی تار نفسم را | پیدا انہ اے جنبش مضراب کجائی

تو پھر جب ہم ان نہایت ہی عام اور بیش پا افتادہ کیفیات دماغی کو بھی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے تو اس غیر معروف اور نہایت ہی شاذ و نادر

خواہ مخواہ غلط ہی ہوں۔ اور نہ یہ کہ ہمارے جناب سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کوئی ایسی فوق الفطرت طاقت نہ رکھتے تھے کہ اظہار معجزات پر قادر نہوں نہیں میرا مدعا فقط یہ ہے کہ اسلام نے اپنی صداقتوں کے تسلیم کرانے کے لئے۔ فقط عقل انسانی کا معیار پیش کیا اور اپنا مدار ان بے تعلق خوارق عادت پر نہیں رکھا۔ ممکن ہے کہ گزشتہ زمانے کی پیغمبروں نے عجیب و غریب روحانی طاقتوں کا اظہار کیا ہو۔ اس میں ناقابل تسلیم بات ہی کونسی ہے۔ خود جناب پیغمبر اسلام کی ذات بابرکات سے بھی ایسی صدہا باتیں ظہور میں آئیں جن پر تاریخی حیثیت سے ذرا بھی حرف گیری کی گنجائش نہیں ہے۔ اور جو یقیناً دیگر اقوام کے بزرگوں کے معجزوں کے مقابلے میں زیادہ مستند اور قابل قبول ہیں۔ یہ سب کچھہ صحیح لیکن پھر بھی اسلام کی سچائی ان سب باتوں سے بے نیاز ہے اسی سبب سے نہ جناب رسالت مآب نے اپنے معجزات پر زور دیا۔ نہ مسائل مذہب میں ان سے استشہاد کیا۔ لیکن اس سے معجزات کے وجود کا انکار صرف وہی شخص کر سکتا ہے۔ جو اپنے علم کو تمام ظاہری اور باطنی قوانین قدرت پر حاوی اور محیط سمجھتا ہو۔ اور جسے ہر ایک راز فطرت کے جاننے کا دعوی ہو۔ ہم کو تو معجزات میں ذرا بھی شبہ یا انکار نہیں ہے۔

اس ضمن میں اب ہمکو صرف وحی کی بابت چند باتیں اور کہنی ہیں وحی بھی ایک ایسی شئے ہے جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم

کم وبیش کرنے کا بھی اس شخص کو کچھ اختیار نہیں رہ جاتا ہے۔ تو پھر اگر وہ چاہے تو اوروں کی طرح اسے پڑھ سکتا ہے۔ مگر اس وقت تک وہ اسکے مضمون سے بالکل لاعلم ہوتا ہے۔ (اسکی لاعلمی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ مقطعات یعنی حروف مفردہ کی صورت میں ہوتا ہے۔ اور یوں اس کو پڑھنا اور اس کا مطلب سمجھنا خالی از وقت نہیں ہوتا) اسپر خوبی یہ ہے کہ باوجودیکہ اس تمام کارروائی میں عرفی معنوں میں اس شخص کی دماغی قوتوں کا کچھ دخل نہیں ہوتا۔ یہاں تک وہ خود نفس مطلب سے ہی بے خبر ہوتا ہے مگر پھر بھی جو کچھ لکھا جاتا ہے۔ وہ نہایت شستہ بامعنے بمضمون مستفسرہ کے متعلق اور نتیجہ خیز ہوتا ہے میں پوچھتا ہوں کہ یہ کیونکر ہوتا ہے۔ ہاں یہاں یہ بھی سن لیجئے کہ میں نے یہ نہ تو کسی مسمریزم کے معمول کا حال لکھا ہے نہ اس ازغیبی تحریر کا کوئی تجربہ لوگوں کو محو حیرت بنانے کے لئے لفظوں کو بدل بدل کر لکھ دیا ہے جسے آٹومیٹک رائٹنگ کہتے ہیں۔ یہ کہدینا تو بہت آسان ہے کہ یا تو میں جھوٹ بولتا ہوں۔ یا مجھے دہوکا ہوا ہے۔ اور میں اس کا جواب بھی نہیں دیسکتا۔ بجز اس کے کہ اپنی اور اس شخص کی صداقت

ملہ۔ "ازغیبی تحریر" (Autometic writting) ایک قسم کی تحریر ہوتی ہے۔ جو انسانی ارادے کے بغیر لکھی جاتی ہے۔ اور جسکی بابت خیال ہے کہ روحوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ چنانچہ مسٹر سٹیڈ کی کتاب "آفٹر ڈیتھ" جس کا کئی جگہہ ذکر آیا ہے۔ ایسی ہی فوق العادت تحریر کا نتیجہ کہی جاتی ہے۔

واقع ہونیوالی حالت کو جسے وحی کہا گیا ہے کیونکر سمجھا سکتے ہیں - مگر اپنی
اس کم فہمی کی بنا پر اس سے انکار کر دینا جہل مرکب کی دلیل ہے - یہاں
راقم الحروف اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر ایک واقعہ عرض کرنا چاہتا ہے
جو گو وحی سے تو مطلق کچھ نسبت ہی نہیں رکھتا لیکن پھر بھی کم سے کم
انسان کی نامعلوم دماغی قوتوں کی ایک چھوٹی سی مثال ہے اور جس
کا جواب غالباً اہل سائنس میری تکذیب کے سوا اور کچھ نہ دیسکیں -
میں نے بچشم خود دیکھا ہے اور متعدد مرتبہ نہایت غور و احتیاط
سے دیکھا - کہ ایک خاص صورت میں ایک شخص کی قوت
مضمون نگاری اپنے آپکو اسکی اور ساری قوائے دماغی سے بالکل
منفک کر کے بطور خود اس کے ہاتھ اور قلم سے کام لینے لگتی ہے اور
اگرچہ وہ شخص اس وقت اپنے پورے ہوش وحواس اور بیداری
کی حالت میں ہوتا ہے - مگر پھر بھی اِن باتوں کے لکھنے میں جو اسکے
قلم سے نکل رہی ہوتی ہیں - اس کے دماغ کا مطلق کچھ بھی حصہ نہیں
ہوتا یہاں تک اسے معلوم بھی نہیں ہوتا کہ اس کا ہاتھ جو کچھ لکھتا جا رہا ہے
وہ کیا ہے کس بارے میں ہے - اور کس بنا پر لکھا جا رہا ہے اور خیالات
کی عرفی اور عام طریقے پر ترتیب اور اِن سے استدلال اور استنباط
نتائج تو کجا اسے اس بات کے جاننے کی بھی کچھ ضرورت نہیں ہوتی
کہ وہ مضمون ہے کیا - اور جواب کس بات کا دیا جا رہا ہے - ہاں
جب وہ سلسلۂ تحریر جو کبھی مختصر ہوتا ہے - اور کبھی طویل - اور جسکے

حصہ دوم - اعمال وعبادات

طہارت

جو اہمیت اسلام کے عقائد میں توحید کی ہے وہی وقعت مسلمانوں کے اعمال میں طہارت کی ہے - اور جیسے حق پرستی کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا ویسے ہی طہارت کے بغیر کوئی عبادت قابل قبول نہیں ہوتی غرض جس طرح ہم توحید کو مذہبی اعتقادات کا اصل اصول سمجھتے ہیں - اسی طرح طہارت کو اپنی عبادت کا دارومدار جانتے ہیں اس لئے ارشاد ہوا ہے کہ

اَلطُّهُورُ نِصْفُ الْاِيْمَانُ ط | پاکیزگی آدھا ایمان ہے -

یہاں دیکھنا یہ ہے کہ طہارت ہے کیا - اس کے متعلق اسلام کے احکام کیا ہیں - اور اسکی بابت اصول فطرت اور تحقیقات حکمت کیا کہتے ہیں -

طہارت[1] کے معنی ہیں پاکی - پاکیزگی اور صفائی - اور اس میں ظاہری اور باطنی دونوں قسم کی صفائی شامل ہے - دنیا کے اور مذہبوں کے اصول کے مطابق تو اسلام کو من حیث المذہب دل کی صفائی کے

---

[1] میرے خیال میں انگریزی زبان میں کوئی لفظ نہیں ہے جو طہارت یا پاکی کا صحیح مفہوم ادا کر سکے اُس سے بڑھکر اور کون سا ثبوت اس بات کا ہوسکتا ہے کہ وہ قوم صفائی کی خواہ کتنی ہی دلدادہ کیوں نہ ہو مگر پاکی کے تصور سے آشنا نہیں -

اور راستبازی پر زور دوں یا یہ کہوں کہ میں نے اس کیفیت کی ہر طرح
تفتیش و تجسس کی کوشش کی۔ مگر میں اسکی ماہیت سمجھنے میں بالکل
ناکامیاب رہا۔ مگر اسکو باور کرنے یا نہ کرنے کا ناظرین کو اختیار ہے۔
بہر حال چونکہ مجھکو تو اس میں کچھ شک و شبہ ہے ہی نہیں اسلئے میں تو
سچے دل سے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے غیر معروف القا کی یہ ایک مثال
دیکھنے کے بعد وحی کے امکان میں ذرا بھی شک نہیں رہا۔ اور یہ تو
ایک ادنیٰ مثال تھی۔ نہیں معلوم کارخانۂ قدرت میں ایسے کتنے
لاکھوں کروڑوں اسرار پوشیدہ ہیں۔ اور خود ہمارے دماغوں میں ایسی
کون کون سی مخفی طاقتیں چھپی ہوئی ہیں جن تک ابھی ہمارا وہم و گمان
بھی نہیں پہنچا۔ تو پھر نزول وحی ایسی کون سی غیر ممکن اور عجیب بات ہے

وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيزٍ | اور اللہ کے نزدیک یہ کچھ مشکل نہیں ہے۔

کی اصلی وجہ وہ جراثیم ہیں جو میلی اور غیر مصفا جگھوں میں مختلف طرح پیدا ہوتے ہیں۔ اور کثافت اور غلاظت ہی میں نشو ونما پاکر طرح طرح کی بیماریوں کا باعث ہوئے ہیں۔

اس کا دوسرا فیصلہ یہ ہے۔ کہ جسم کے مسامات ہمیشہ صاف رہنے چاہیں کیونکہ اگر میل کچیل یا اور کسی وجہ سے وہ بند ہو جائیں تو اندرونی فضلات باہر نہیں نکل سکتے اور ان سے طرح طرح کی شکایتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور اسکا تیسرا فیصلہ یہ ہے کہ دل و دماغ کی حالت صحت جسمانی کی کیفیت پر موقوف ہے۔ تندرستی میں دماغ کے خیالات بھی پاکیزہ ہوتے ہیں اور دل بھی نیکیوں کی طرف مائل ہوتا ہے لیکن جب طبیعت اچھی نہیں ہوتی تو مزاج بھی چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ غصہ بھی بڑھ جاتا ہے۔ اور دل میں طرح طرح کے وسوسے بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آجکل تمام طب اور ڈاکٹری کا اصل اصول "صفائی" ہے۔

اب دیکھئے کہ اسلام نے جسکا اصل منشا تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن تھا۔ اپنے حصول مدعا کے لئے کیا طریقے اختیار کیے ہیں۔ دل کی طہارت کے لئے جو باتیں ضروری تھیں۔ ان کو تو اس نے اپنی عبادتوں میں مدنظر رکھ ہی لیا تھا۔ مگر اس نے ابتدا ہی سے اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ کہ دل کی پاکیزگی جسم کی صفائی کے بغیر ممکن نہیں ہے اس لئے اس نے عبادت کے ساتھ طہارت کو لازم کیا۔ اور نماز سے

سوا اور کسی بات سے سروکار نہ ہونا چاہیئے کیونکہ اخلاق اور مذہب کا زیادہ تر تعلق دل سے سمجھا جاتا ہے۔ بلاشبہ اس لحاظ سے یہ خیال بالکل درست ہے کہ خدا ہمارے ظاہری حالات کو نہیں بلکہ ہمارے دلوں کو دیکھتا ہے اور اس کے نزدیک ایک نہایت ہی صاف اور پاکیزہ لباس والا مکار اور مردم آزار شخص ایک میلے کچیلے اور پھٹے پرانے کپڑوں والے راستباز اور نیکوکار آدمی کے مقابلہ میں کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ خود اسلام کا یہ ہی عقیدہ ہے کہ

اِنَّ اللّٰہَ یَنظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ	بیشک اللہ تمہارے دلوں کو دیکھتا ہے
وَلَا اِلٰی صُوَرِکُمْ ط	صورتوں کو نہیں دیکھتا۔

لیکن اس کے باوجود بھی اسلام نے دل کی طہارت کے علاوہ جسم اور لباس کی پاکی پر نہایت زور دیا ہے اور ان دونوں اشیائے ظاہری کے پاک صاف رکھنے کی بڑی سخت تاکید کی ہے۔ یہاں تک کہ بعض ظاہر بین اشخاص کو تو یہ خیال پیدا ہوگیا کہ اسلام نے باطنی طہارت کی نسبت ظاہری پاکیزگی کو ترجیح دی ہے۔ لیکن یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ اسلام میں دل کی پاکیزگی سے بڑھکر کوئی چیز نہیں ہے اور اس کے بغیر کوئی نیکی اور کوئی خوبی ممکن نہیں۔ لیکن ہاں اس کے ساتھ اسلام نے جسم اور لباس کی صفائی کو بھی داخل عبادات رکھا ہے اور اسکی وجہ ہم کو اسلام سے نہیں بلکہ علوم طبعیہ کے شعبہ طب سے پوچھنی چاہیئے۔

سائنس کی جدید تحقیقات کا پہلا فیصلہ تو یہ ہے کہ تمام امراض

ہیں۔ اور دانتوں کی خرابی براہ راست معدے کے فعل کو بگاڑ کر طرح طرح کی بیماریوں کا سبب بنجاتی ہے۔ ان سب باتوں کا تدارک مسواک کی تاکید سے کر دیا گیا۔ اور چونکہ بات زیادہ ضروری تھی۔ اس لئے مسواک کی اتنی تاکید کی گئی کہ وہ تقریبًا واجب ہوگئی۔ انگلیوں اور خاصکر پاؤں کی انگلیوں کی گھائیوں میں اکثر میل اور پسینہ وغیرہ جمع ہو کر مختلف بیماریاں پیدا کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے انگلیوں اور بالخصوص پاؤں کی انگلیوں میں خلال کرنا آداب وضو میں مسنون ہے۔ لیکن میں نے یہ کیا کہا کہ اسلام نے انہی مصلحتوں سے وضو کو فرض کیا ہے۔ نہیں حقیقت یہ ہے کہ طب اور فلسفیانہ قیاس نے ابھی وضو کی صرف انہی خوبیوں کو سمجھا ہے۔ ورنہ یہ تو خدا ہی جانتا ہے کہ اس میں اور کیا کیا حکمتیں اور کون کون سی مصلحتیں مخفی رکھی گئی ہیں۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ وضو کو نماز جیسی عبادت کا مقدمہ بنا کر اس میں ظاہری شست وشو کے ساتھ ہی توبہ واستغفار کو بھی جو گویا باطنی طہارت ہے لازم کر دیا ہے۔ اسی لئے وضو کرتے وقت یہ دعا مانگنے کی ہدایت ہوئی ہے کہ۔

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ التَّوَّابِیْنَ وَاجْعَلْنِیْ مِنَ الْمُتَطَہِّرِیْنَ ط	اے اللہ تو مجھے توبہ کرنے والوں اور پاکی چاہنے والوں میں شامل کر دے۔

اور اسی کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ

وَاللّٰہُ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ	اور اللہ توبہ کرنے والوں اور پاکی چاہنے والوں

پہلے وضو کو فرض کیا۔ شستشو اور قوموں اور مذھبوں میں بھی ہے۔ مگر وضو اسلام کے ساتھ خاص ہے۔ اور ہمارے خیال میں تو یقیناً طہارت کی سب سے زیادہ پاکیزہ اور دلپسند صورت ہے۔ اس میں وہ ساری باتیں باحسن وجوہ آجاتی ہیں جن کی آج کل طبی اصول اتنی شدت سے تاکید کرنے لگے ہیں۔ اور جن کے کچھہ کچھہ فوائد اسلام کی تیرہ سو برس کی تعلیم کے بعد اب کہیں فلسفے اور سائنس کی سمجھہ میں آئے ہیں۔ وضو میں معمولی ہاتھہ منہ دھونے کے علاوہ اچھی طرح کُلّی کیجاتی ہے دانت مانجھے جاتے ہیں۔ ناک میں پانی ڈالکر اسے صاف کرنا ہوتا ہے۔ ہاتھہ کہنیوں تک دھوئے جاتے ہیں۔ سر پر بھی ہاتھہ پھیر کر اسے سرسری طور پر تر کرتے ہیں۔ کانوں میں اُنگلیاں ڈالتے ہیں۔ اور پاؤں ٹخنوں تک اچھی طرح دھوتے ہیں۔ یوں جسم کا وہ تمام حصہ جس کے عام طور پر کھلے رہنے اور گرد آلود ہونے کا احتمال بھی ہے۔ ہر ایک وضو میں اچھی طرح ایک مرتبہ نہیں بلکہ تین تین مرتبہ دُھل جاتا ہے اور دُھلتا بھی اتنی احتیاط سے ہے۔ کہ اس میں سے بال برابر جگہہ بھی سوکھی نہیں رہتی۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ وضو میں ہر ایک بات کی تاکید بالکل اسکی طبی مصلحت کی مناسبت سے کیگئی ہے۔ سب سے زیادہ احتیاط منہ کی کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اکثر وقت منہ بند رہنے اور دانتوں میں کھانے کے ریزے وغیرہ اٹک جانے سے اس میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے۔ اور بسا اوقات دانت خراب ہو جاتے

اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ دنیا کی اور کوئی قوم نہاتی ہی نہیں
نہیں۔ نہاتے دھوتے تو ضرور ہیں اور خاصکر اس معاملہ میں ہندو تو سب
سے پیش پیش ہیں۔ مگر یہ یقینی بات ہے کہ صفائی پاکی اور پاکیزگی کے
اصول کی جتنی پابندی اسلامی طریقے کے غسل میں ملحوظ رکھی جاتی
ہے۔ اتنی اور کسی صورت میں ممکن نہیں۔ ہندوؤں میں روز صبح
اٹھ کر دریاؤں پر نہانے کی رسم میں کئی فائدے معلوم ہوتے ہیں مثلاً
اس سے سحر خیزی کی عادت پڑتی ہے۔ صبح صاف ہوا میں چہل قدمی اور
ورزش ہو جاتی ہے۔ اور ایک حد تک جسمانی شست و شو بھی کر لیجاتی
ہے۔ لیکن اس میں چند قباحتیں بھی ہیں۔ اول تو بلا لحاظ موسم بارش
اور سردی میں دریا تک جانا اور وہاں کھلی ہوا میں ٹھنڈے پانی سے نہانا
ہر شخص کے لئے ممکن نہیں ہو سکتا۔ اور خاص کر بچے۔ عورتیں اور بوڑھے
تو اس میں بالکل معذور ہیں۔ خلاف مزاج اور تکلیف دہ ہونے کے
علاوہ یوں بھی میدان میں عورتوں اور مردوں کا ایک ہی جگہ تقریباً برہنہ
نہانا نہایت ہی مکروہ اور معیوب ہے۔ اور اس سے طرح طرح کی اخلاقی
خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور ان طبی مصلحتوں کا تو اس میں ذکر ہی نہیں
جو روز پنج وقتہ وضو اور ہفتے میں ایک دو مرتبہ نہانے میں ملحوظ رکھی
گئی ہیں۔ اسکے علاوہ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس دستور کے
جو کچھ فائدے بھی ہوں ان کی وجہ سے ہندو مذہب مستحق تعریف
نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ محض ایک رسم ہے۔ اسلام کے وضو اور غسل کی

الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۵ | سے محبت کرتا ہے۔

یہ کامل طہارت جسمانی ہر ایک مسلمان کو دن میں اگر پانچ بار نہیں تو بالاوسط کم سے کم تین بار کرنی ضروری ہے۔ بلکہ مستحسن تو یہ ہی ہے کہ بہ فرید احتیاط وضو ہونے کی حالت میں بھی ہر نماز کے لئے نیا وضو کر لیا جائے۔ اگرچہ لوگوں کو اپنی صحت بہت عزیز ہے اور مادہ پرستی کے ساتھ ساتھ زندگی سے وابستگی اور طبی تدابیر کی قدر و منزلت روزمرہ بڑھتی جاتی ہے۔ مگر ان سب محرکوں کے باوجود بھی طبی ہدائیتیں کتنے آدمیوں کو ایسی صفائی اور پاکیزگی کی تعلیم دیسکیں۔ اور ڈاکٹری تاکیدوں سے کسقدر آدمی اس احتیاط اور حفظ ماتقدم کے خوگر ہو گئے۔ جو اسلام نے اپنی ایک بات سے دنیا کو سکھا دی۔

اس روزانہ طہارت کے علاوہ غسل جنابت فرض اور ہر ہفتے میں کم سے کم ایک بار جمعہ کے دن نہانا۔ صاف اور پاکیزہ لباس پہنا۔ اور عطر لگانا سنت موکدہ ہے۔ اور نہانا بھی ٹب میں بیٹھکر نہانا نہیں ہے۔ کہ جو کثافت جسم سے چھوٹے۔ پھر بھی برابر جسم سے لگی رہے۔ بلکہ پانی میں حل ہونے کی وجہ سے اور بھی زیادہ اچھی طرح مسامات کے اندر نفوذ کر سکے۔ بلکہ صاف پانی سے نہانے کی ضرورت ہے جو ہر طرح کی حکمی اور حقیقی نجاست سے پاک ہو۔ اس طرح جسم انسانی کا جو حصہ وضو میں دھلنے سے باقی رہگیا تھا۔ اور جس کا روز دھونا چنداں ضروری نہیں تھا۔ اس کی صفائی کا خاطر خواہ بندوبست ہو گیا۔

یفیت سے متاثر ہوتا ہے۔ کپڑے تو اس کے جسم سے لگے ہوئے
ی ہوتے ہیں۔ اس لئے اسلام نے کپڑوں کی پاکی کو بھی فرض کر دیا
ہے۔ اور یوں ہمیشہ کے لئے۔ دل جسم اور لباس کی صفائی اور
اکیزگی کو باہم وابستہ اور ایک دوسرے کا مستلزم کر دیا۔

پیشاب اور پاخانے کے بعد استنجا کرنے کی ضرورت کے متعلق میں
چھ نہیں کہوں گا۔ کیونکہ اگر کوئی نیچر کا مطالعہ کرنیوالا فلسفی جانوروں کی
مثال دیکر اسے غیر ضروری ثابت کرے تو فی الواقع میرے پاس اس کا
وئی جواب نہیں۔ اور میں صرف غالب کا یہ شعر پڑھنے پر اکتفا کرونگا

معذوری اگر حرف مرا زود نہ یابی	رق ست نہ اندک ز دلم تا بدل تو

یہاں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ یہ احکام سب سے پہلے اُس
ملک میں جاری کئے گئے تھے۔ جہاں پانی ایک نہایت ہی محبوب اور
نایاب چیز ہے۔ اور یہ ہدایتیں اول اول اون لوگوں کو کی گئی تھیں۔
ن کو پانی پینے کے لئے بھی بقیمت ملتا ہے۔ بلاشبہ اگر عرب میں نہانے
دھونے کی بابت کوئی بھی حکم نہ دیا جاتا تو بھی ملکی حالات اس فروگذاشت
کی تائید کرتے۔ اور وہاں والے شست وشو سے غافل رہنے میں
معذور ہوتے۔ لیکن نہیں۔ اسلام کی حکمت کاملہ اس سے زیادہ مآل
اندیش اور مصلحت بیں تھی۔ اور اگرچہ

بیشک اللہ تمہارے لئے آسانی اور نرمی چاہتا ہے مشکلیں اور دقتیں نہیں چاہتا۔	اِنَّ اللّٰہَ یُرِیۡدُ بِکُمُ الۡیُسۡرَ وَلَا یُرِیۡدُ بِکُمُ الۡعُسۡرَ۔

طرح کوئی مذہبی حکم نہیں ہے۔ اور اسکی ابتدا یوں ہوئی ہے کہ شروع شروع میں جب ہندو قومیں وسط ایشیا کے خشک میدانوں سے اُتر کر پنجاب اور شمالی ہندوستان کی سرسبز اور شاداب چراگاہوں میں پہونچے تو انہوں نے یہاں کے دریاؤں کے کنارے اپنے ڈیرے ڈالدئے اور رفتہ رفتہ وہاں بڑے بڑے شہر بن گئے (ہندوؤں کی نظروں میں بالعموم تمام دریاؤں اور بالخصوص گنگا اور جمنا کے تقدس کا راز یہی ہے اور اس لحاظ سے یقیناً قابل گرفت نہیں ہیں) پھر کیونکہ وہ لوگ اپنی ہر ایک ضرورت کے لئے انہیں دریاؤں کا پانی استعمال کرتے تھے اور انہی کے کناروں پر نہاتے دھوتے تھے۔ اس لئے آہستہ آہستہ اس نے ایک رسم کی صورت اختیار کر لی اور ان کی آئندہ نسلوں نے اسے ایک مذہبی شان دیدی۔ یہاں تک کہ اب لوگ دور و دراز سے سفر کر کے ان دریاؤں میں اشنان کرنے کے لئے آتے ہیں۔ اور اس میں نہانے کو ذریعہ نجات سمجھتے ہیں۔ لیکن واقع میں یہ رسم قدامت پرستی کے سوا اور کچھہ نہیں۔

جسم کی صفائی تب تک ممکن نہیں۔ جب تک کہ لباس بھی حتی المقدور صاف نہو۔ اس کا پُر تکلف اور بیش قیمت ہونا لازمی نہیں مگر پاک اور صاف ہونا ضروری ہے۔ اور یہ ایک غریب آدمی بھی تھوڑی سی معمولی احتیاط سے کر سکتا ہے۔ دل گو کہنے کو کپڑوں سے کچھہ تعلق نہیں رکھتا مگر فی الواقع وہ اپنی گرد و پیش کی ہر ایک چیز اور ہر

صلوۃ

عبادت کے معنے ہیں اظہار بندگی۔ اس لئے ظاہر ہے کہ جہاں خدا کا اقرار کیا وہیں عبادت از خود فرض ہو گئی۔ اور کوئی شخص کسی حال مین اس سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ تاوقتیکہ وہ سرے سے خدا کے خالق اور اپنے بندے ہونے سے ہی انکار نہ کرے۔ اسلئے عبادت کی فرضیت کو تو تسلیم نہ کرنے والے بہت ہی کم ہونگے۔ مگر ہان اختلاف ہے عبادت کی طرز و وضع میں اور اسکی نوعیت میں۔ ہر مذہب نے اس معاملہ میں جداگانہ روش اختیار کی ہے۔ اور اپنے معتقدین کو طرح طرح کی عبادتین سکھائی ہیں۔ کہیں بھبوت مل کر دھونی رما کر بیٹھنا اور تصور آلہی مین برسوں آسن تک نہ بدلنا اور اپنے ہاتھ پاؤں تک کو بیکار اور بحس کر دینا سب سے بڑی عبادت سمجھا گیا ہے۔ کہیں تارک دنیا ہو کر گوشۂ عزلت میں رہنا اور ہر قسم کی جائز اور ناجائز خواہشوں کو ضبط کرنا بہترین عمل کہا گیا ہے کہیں فقط ایک پہیئے کو چکر دیدینا ہی کافی عبادت قرار دیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ ان تمام مختلف عبادتوں میں کچھ نہ کچھ فائدے ضرور تھے۔ لیکن خود لفظ "عبادت" بتا رہا ہے کہ سب سے اچھی عبادت وہی ہو سکتی ہے جس مین عبودیت کی سب سے زیادہ شان

کے سچے وعدے کے مطابق بصورت نایابی آب تیمم کو جائز کردیا مگر پھر بھی اصلی حصول کو نظر انداز نہیں کیا - اور اس کی وجہ یہ فرما دی کہ

مَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیَجْعَلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰکِنْ یُّرِیْدُ لِیُطَھِّرَکُمْ وَلِیُتِمَّ نِعْمَتَہٗ عَلَیْکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ -

اللہ تم پر کوئی سختی کرنا نہیں چاہتا - بلکہ تم کو پاک صاف رکھنا اور تم پر اپنی نعمتوں کو مکمل کرنا چاہتا ہے تاکہ تم اس کا شکر بجا لاؤ -

کہ محض کہنے ہی کو نماز کا یہ مدعا ٹھیرایا ہو۔ بلکہ اس کی تکمیل کے لئے ہی ہر ایک پہلو کو مدنظر رکھا ہے۔ چنانچہ نماز میں پہلی شرط تو طہارت ہی ہے جس میں لباس جسم اور دل سب کے صاف ہونے کی ضرورت ہے۔ طہارت کو تو اسلام نے اتنی وقعت دی ہے کہ اس کا ذکر میں علیحدہ باب میں کر ہی چکا۔ یہاں صرف اتنا ہی کہدینا کافی ہے کہ اس کے بغیر نماز ہی نہیں ہوتی۔ اسکے بعد دیکھئے کہ نماز کے لئے بلانے کا طریقہ کتنا پاکیزہ ہے تمام دنیا کے مذہب اپنے پیرووں کو اپنے معبود کی پرستش کے واسطے جمع کرنے کا کوئی طریقہ ناقوس اور گھنٹہ بجانے سے بہتر وضع نہ کر سکے۔ اسلام نے اس منادی کو بجائے خود ایک عبادت بنا دیا ہے ایک آدمی جسم اور لباس کو ہر قسم کی نجاست سے پاک اور دل و دماغ کو ماسوائے اللہ سے خالی اور یکسو کر کے منارے پر چڑھتا ہے اور نہایت ادب و انکسار سے باواز بلند اللہ اکبر اللہ اکبر کہہ کر اس شہنشاہ دوجہان۔ سلطان کون و مکان کی عظمت و کبریائی کی شہادت دیتا ہے جسکی عبادت کے لئے وہ لوگوں کو بلا رہا ہے اور پھر دوبارہ انہی کلمات کی تکرار کرتا ہے۔ اس کے بعد اشہد ان لا الہ الا اللہ کی تکرار سے بہ تاکید اعلان کرتا ہے کہ وہ خدائے واحد و یکتا جسکے سامنے ہم کو سر عبودیت جھکانا ہے۔ ایک ہے۔ نہ کوئی اس کا شریک ہے نہ کوئی اسکی نظیر ہے۔ وہ کل بادشاہوں کا بادشاہ۔ سب اولیا اور انبیا کا معبود۔ ساری مخلوقات و کائنات کا حاکم۔ تمام صفات حسنہ سے

ہو - یعنی جس میں ہمارا دل اور زبان - آنکھ اور کان - غرض ہر ایک عضو اپنے اپنے طبعی فرائض کو پورے اعتدال اور میانہ روی سے بجا لائے جو اسکے صانع حقیقی نے اسکے سپرد کیئے ہیں اور ان کی بجا آوری میں احکام الٰہی سے سرمو تجاوز نہ کرے۔

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا۔ | بیشک کان اور آنکھ اور دل سب سے وہاں پوچھ گچھ ہوگی۔

کیونکہ جب تک ایسا نہ ہوگا تب تک ہم اس منشاء عالیہ کو پورا نہیں کر سکتے جسکے لئے ہم بنائے گئے ہیں اور اس صورت میں اہم حقوق عبودیت اور مراسم بندگی کے ادا کرنے میں قاصر رہیں گے۔

یہ ہے عبادت کا اصلی مدعا اور صحیح مفہوم - جو نہ صرف لفظ "عبادت" کے لغوی معنوں سے بلکہ اصول فطرت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے اور اب اسے پیش نظر رکھکر دیکھنا چاہیے کہ اسلام نے عبادت کی بابت کیا سکھایا ہے اور اسلامی عبادتیں کہاں تک فطرت کے مطابق اور نوع انسان کی جسمانی اور روحانی ترقی میں ممد و معاون ہیں۔

اسلام نے معاملات کے بعد عبادات میں سب سے زیادہ اہم نماز کو ٹھیرایا ہے اور اس کا جو منشاء قرار دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ۔

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ | نماز بری اور ناپسندیدہ باتوں سے روکتی ہے۔

اس لحاظ سے اسکی جس قدر تاکید اور تعریف کیجائے - بجا ہے - یہی نہیں

یہ تو نماز کی اصلی حقیقت اور اسکی عمومیت کا ذکر تھا - مگر کیا اس سے یہ مراد ہے (جیسے کہ آجکل اکثر تعلیم یافتہ اور روشن خیال نوجوان سمجھنے لگے ہیں) کہ ہم کو بھی کسی قسم کی ظاہری نماز کی پابندی کی ضرورت نہیں - صرف دل ہی دل میں اللہ میاں کو یاد کر لینا کافی ہے - ہرگز نہیں - کیونکہ اول تو دل سے خدا کو یاد کرنا ہی ناممکن ہے - اور جو لوگ دل سے اللہ کا ذکر کر سکتے ہیں انکو نماز کے متعلق بحث کرنے کی حاجت ہی نہیں رہتی وہ اس درجے سے گزر جاتے ہیں - اور فی الواقع انکا ہر ایک فعل یہاں تک کہ ان کی خورد و نوش اور خواب و بیداری تک بھی گویا نماز ہی ہو جاتی ہے - لیکن ایسا شخص ہے کون - اور کم سے کم مخاطب ایسے لوگ نہیں اس لئے خدا کو دل ہی دل میں یاد کرنے کا دعویٰ محض جھوٹا ڈھکوسلا اور لامذہبی کا بہانہ ہے - اس لئے عبادت ظاہری کی قید سے تو رہائی ممکن نہیں اور رہی کٹڑی اور ہٹ دھرمی دوسری بات ہے -

حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ دل و دماغ جسم انسان میں بادشاہ کہے جاتے ہیں لیکن جسطرح بادشاہ رفتہ رفتہ نامعلوم طریقے سے اپنے مصاحبوں اور درباریوں کی خو بو اختیار کر لیتا ہے ویسے ہی دل و دماغ بھی آہستہ آہستہ حواس ظاہری اور حرکات جسمانی سے متاثر ہو کر انہی کے ہم رنگ ہو جاتے ہیں - یہ فطرت انسانی کا ایک بڑا راز ہے جو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا - اس کی عام مثال یہ لیجئے کہ بہت سی باتیں ہیں - جنکو ہم دل سے ناپسند کرتے ہیں - لیکن اگر ہم ایک مرتبہ ان کو کرنے لگیں تو اگرچہ

وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَادُمْتُ حَيًّا	اور اس نے مجھے صلواۃ اور زکوۃ کا حکم دیا ہے جب تک کہ میں زندہ ہوں۔

اور حضرت شعیب کی قوم کے آدمی یوں نہ کہتے کہ

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا۔	انہوں نے کہا اے شعیب کیا تیری صلواۃ تجھے یہ حکم دیتی ہے کہ ہم ان بتوں کو چھوڑ دیں جن کو ہمارے بزرگ پوجا کرتے تھے۔

کیونکہ غالبًا انپر قیام وقعود اور رکوع وسجود فرض نہ ہوئے تھے۔ اس سے بھی صاف اور قطعی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ پرندوں وغیرہ کی بابت یوں نہ فرماتا کہ

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ	کیا تو نہیں دیکھتا کہ بیشک اللہ کی پاکی بیان کرتی ہیں وہ سب چیزیں جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں۔ اور پرندے پر پھیلائے ہوئے ہیں۔ سب نے اپنی اپنی صلوٰۃ اور تسبیح کو جان لیا ہے۔

حالانکہ یہ تو کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ پرندے وغیرہ بھی ہماری طرح کی نماز ادا کرتے ہیں۔ اس لئے لازمی اور بدیہی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ حقیقت میں جس صلواۃ کی قرآن مجید میں اتنی تاکید کی گئی ہے وہ حکمًا ہر ایک ایسی عبادت پر حاوی ہے۔ جس میں شرائط بندگی اور آداب عبودیت کا کافی لحاظ رکھا جاوے۔ اور جسمیں سچے دل سے باللفظ یا بالنیۃ اپنے خالق حقیقی کی حمد وثنا کا اقرار اور اپنے عجز وخطا کا اظہار ہو۔

ہی بیدلی اور بدشوقی سے کیوں نہ ہو مگر رفتہ رفتہ طبیعت اس سے مانوس ہو جاتی ہے اور دل اسکی طرف مائل ہو جاتا ہے - اور جب ایک بار دل میں نماز کی اصلی خوبیاں جم گئیں تو پھر طبعاً اس سے وہ اخلاقی اصلاح اور روحانی ترقی ظاہر ہونے لگے گی - جو نماز اور ہر قسم کی عبادتوں کا اصلی مدعا ہے - اور آدمی حقوق اللہ کی بجا آوری کے ساتھ ہی حقوق العباد کی بھی ایسی سخت نگہداشت اور احتیاط کرنے لگے گا جو سارے قانونوں اور تمام مذہبوں کی علت غائی ہے اور ان سب کا نتیجہ وہ غایت الآمال ہے جو کلام پاک نے ایک نہایت ہی مختصر اور جامع فقرے -

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ - | اور تو سجدہ ادا کر اور نزدیک ہو -

میں بیان فرمایا ہے -

شائد کوئی کہے کہ نماز میں بار بار اللہ اکبر کی تکرار یا سورۃ فاتحہ کے اعادے سے کیا فائدہ - اس کا عقلی جواب دینے میں ایک بڑی دشواری تو یہ ہے کہ ابھی تک سائنس اس بات کی تہ کو نہیں پہنچی - کہ الفاظ میں بھی اثر ہوتا ہے لیکن سائنس خواہ اسے مانے یا نہ مانے یہ ہے کہ ایک واقعی بات جس سے انکار مشکل ہے اور اسکی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے ایک خوبصورت پھول دیکھ کر یا ایک برجستہ شعر سنکر طبیعت خوش ہوتی ہے - میں پوچھتا ہوں کہ موسیقی کا اثر ہوتا ہے یا نہیں - راگ میں کوئی مادی شئے تو ہے نہیں - جو حواس پر اثر کرے کان کے پردے بہرحال ہوا کی موجوں سے لرزتے ہیں - خواہ

شروع شروع میں نفرت اور کراہت ہوتی ہے - مگر تھوڑے دن میں یہ بات جاتی رہتی ہے - اور پھر اس میں کچھ عار نہیں ہوتا مثلاً شراب نہ پینے والے کو اسکی بو بھی بری معلوم ہوتی ہے مزہ بھی ناگوار ہوتا ہے طبیعت میں کچھ سرور بھی نہیں ہوتا - یعنی اس کا دل نہیں چاہتا - مگر چند دن بعد ہی شراب مدار زندگی ہوجاتی ہے - یعنی دل اس کے متواتر استعمال سے مغلوب ہوجاتا ہے اور اس کی نفرت محبت سے بدل جاتی ہے - یا اس کے برخلاف ایک شخص ہے کہ اس کا دل کسی طرح پڑھنے لکھنے میں نہیں لگتا - اور اسے کتاب کے نام سے نفرت ہے - لیکن اگر وہ تعلیم یافتہ لوگوں میں اٹھے بیٹھے اور تعلیم و تعلم کی مجلسوں میں آئے جائے تو ضروری بات ہے کہ چند دن میں اسے بھی اس کی طرف ایک قسم کی رغبت پیدا ہوجائے اور وہ پہلی سی نفرت باقی نہ رہے - یہاں تک کہ آخر رفتہ رفتہ وہ بھی حصول علم میں مشغول ہوجائے - اور اس کی بدشوقی شوق سے بدل جائے ایسی ایسی مثالیں ہم جسقدر چاہیں پیش کرسکتے ہیں - اور غالباً اکثر اصحاب کو اس بات کا ذاتی تجربہ ہوگا اس لئے یہ بداہت مزید صراحت کی محتاج نہیں -

اسلام نے اسی راز فطرت کو سمجھکر نماز ظاہری کو فرض کیا ہے اور اس کی اتنی تاکید کی ہے کہ صبح سے رات تک دن میں پانچ بار اسکے ادا کرنے کا حکم دیا ہے - کیونکہ یہ طبیعت انسانی کا مقتضا ہے کہ جو کام دن بھر میں اتنی بار کیا جائے - وہ خواہ شروع شروع میں کیسی

زبان میں اسے پکارے وہ جواب دیتا ہے۔ لیکن پھر بھی ہم پوچھتے ہیں کہ اس کی عبادت کے لیے اُن سے زیادہ اچھے اور کون سے لفظ ہوسکتے ہیں۔ جو اپنی بلاغت اور جامعیت کی وجہ سے بہترین کلمات ہیں جنکو تیرہ سو برس سے دنیا کے اکثر حصوں کے لوگ اپنی اپنی سیکڑوں ہزاروں مختلف بولیوں کو چھوڑ کر ایک وقت اور ایک حالت میں اپنے خالق کی حمد و ثنا کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اِن دعاؤں سے بہتر اور کون سی دعائیں ہوسکتی ہیں۔ جنکو ہمارے مخبرِ صادق صلعم نے ہمیں سکھایا ہے اور جو ہمارے عقیدے کے مطابق اللہ نے خود ہم کو بتائے ہیں۔ اب اگر ان کو چھوڑ کر انہی کا ترجمہ اپنی زبان میں ادا کریں۔ تب بھی یقیناً اس ترجمے میں وہ حلاوت۔ وہ لطافت۔ وہ قلبی اثر۔ وہ روحانی طاقت کہاں سے آئے گی۔ نہیں۔ اِن باتوں کا اس میں ہونا ممکن ہی نہیں۔ صرف اسلام کے عقیدے کے مطابق نہیں بلکہ اصول علم النفس و القویٰ کے مطابق۔ قوانین فطرت کے مطابق۔

یہاں ہم غیر قوموں کی آگاہی کے لئے دو سورت اور اس کا ترجمہ بھی درج کئے دیتے ہیں جو نماز میں اللہ کی تمجید اور تقدیس کے بعد سب سے پہلے اور سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہے۔ تاکہ ان کلمات کی خوبصورتی اور اِن دعاؤں کی پاکیزگی کا ہر شخص خود اندازہ کرسکے چونکہ اسی سورت سے کلام مجید کی ابتدا ہوتی ہے اس لئے اس کو سورہ فاتحہ یا فاتحہ الکتاب بھی کہتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ

وہ موجیں کسی طرح کی ہوں۔ حسن نظروں میں کھبتا ہے یا نہیں۔ آخر کیوں کیا وہاں سے کوئی چیز آنکر دل پر لگ جاتی ہے۔ آنکھ کے پردے روشنی کی لہروں کو محسوس کر لیتے ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ پھر طبیعت پر اثر کیا۔ مضطر کا یہ سوال بالکل بجا ہے کہ ؎

نگاہیں جا لگی شکل پارسی کیا چیز آئیں	جیسے درد محبت کرکے میرے دل میں رکھا ہی

تو پھر اگر الفاظ میں بھی خاص خاص اثر ہوں تو تعجب کی کیا بات ہے۔ اس کے علاوہ یہ تو خود سائنس کے شعبۂ علم النفس والقوی کا مسلمہ مسئلہ ہے کہ اگر ایک ہی لفظ کو بار بار دہرایا جائے تو اس میں اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہم کو یہ تسلیم کرنے میں کوئی معقول عذر نہیں ہو سکتا کہ الفاظ بھی خاص اثر رکھتے ہیں۔ اب یہ دیکھیے کہ جو الفاظ نماز میں کہے جاتے ہیں۔ وہ کیسے ہیں۔ ان کے معنے تو معروف ہی ہیں یہ بھی مسلم ہے کہ بلاغت اور موزونیت کے لحاظ سے وہ بہترین عبارات سے بدرجہا بہتر ہیں۔ وہ اس کتاب کے فقرے ہیں۔ جو کلام اللہ ہونے کے لحاظ سے نہیں بلکہ ایک کتاب ہونے کی حیثیت سے خدانخواستہ اسلام کے مٹ جانے کے بعد بھی زبان عرب کی سب سے زیادہ بیش قیمت اور قابل وقعت سرمایۂ فخر و ناز رہے گی۔ بے شک ہم مانتے ہیں کہ اللہ سب کی بولیاں سمجھتا اور سب کی نیتیں جانتا ہے اس کے سامنے عربی اور انگریزی اور سنسکرت اور چڑیوں کا چہچہانا اور شیروں کا غرانا سب یکساں ہے۔ اس لئے جو شخص جس طرح سے اسے یاد کرے وہ سنتا ہے جس

اَلصَّلوٰۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ	نماز سونے سے بہتر ہے۔

کی صدا ایک جگہہ بلند ہوتی ہے اور وہاں سے آفتاب عالمتاب کے ساتھ ساتھ سب کو خواب غفلت سے بیدار کرتی ہوئی دنیا بھر میں پھر آتی ہے ایک لفظ اللہ اکبر سے زمین کے دور ترین مقامات کے رہنے والے ایک دوسرے کو بھائی سمجھنے لگتے ہیں۔ لیکن خیر۔ یہ اخوت واتحاد تو اسلام کی ہر ایک بات سے ظاہر ہے۔ اس لئے اسکو تو بالخصوص نماز کی خصوصیات میں گننے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو وہ برقی نہیں۔ بلکہ روحانی اثر ہے جس نے نصف صدی ہی میں اسلام کو تمام دنیا میں پھیلا دیا جو مصلحتیں نماز کے الفاظ کے مخصوص ہونے میں ہیں۔ وہی حکمتیں اوسکے ارکان کے معین ہونے میں بھی ہیں۔ اور جس طرح اصل نماز لفظوں کی مقید نہیں ہے۔ اسی طرح ان حرکتوں کی بھی پابند نہیں ہے۔ یعنی اگرچہ تمام حالتوں میں یہ باتیں فرائض نماز میں داخل ہیں مگر خاص صورتوں میں نماز ان کے بغیر بھی ہوجاتی ہے۔ اور یہ نہیں ہے کہ اگر یہ نہوں تو نماز نماز ہی نہ ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ستاروں اور درختوں کی بابت بھی یہ ارشاد فرمایا ہے کہ

اَلنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ۔	تارے اور درخت اوسکو سجدہ کرتے ہیں۔

حالانکہ ظاہر ہے کہ وہ عرفی معنی میں سجدہ نہیں کرتے۔ لیکن پھر کیف یہ دیکھیئے کہ عبادت ظاہری کے لئے نماز کی مجوزہ حرکتوں سے زیادہ موزوں اور مناسب صورت کیا ہوسکتی ہے۔ ادب سے دست بستہ کھڑا ہونا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۙ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ؕ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ؕ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۙ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّیْنَ ۠	تمام تعریفیں اس معبود ہی کے لئے ہیں جو تمام عالموں کا پالنے والا ہے جو بڑے بخشنے والا اور بڑی مہربانی والا ہے اور روز قیامت کا بادشاہ ہے - اے اللہ ہم تیری ہی پرستش کرتے ہیں اور تجھہ ہی سے مدد چاہتے ہیں - تو ہم کو راہ راست کی ہدایت کر اور ان لوگوں کا راستہ دکھا جن پر تو نے انعام کیا ہے - ان لوگوں کا راستہ نہیں جو تیری مرضی کے برخلاف چلکر گمراہ اور مغضوب ہوتے ہیں -

ان مختصر مگر جامع الفاظ میں ہم کو ہمارے معلم ربانی نے ایسی دعا کی تعلیم دی ہے جس سے بہتر کوئی اور دعا ہو نہیں سکتی - ہمکو بتایا گیا ہے کہ اللہ سے مانگنے کے قابل صرف یہی ایک چیز ہے - کہ ہم ہر ایک معاملے میں راہ راست پر چل سکیں اور ہر طرح کی کجروی اور گمراہی سے بچ جائیں اسی کو معلمین علم اخلاق نے اعتدال حقیقی کہا ہے - اور اخلاقاً اس سے بہتر اور پسندیدہ تر اور کوئی حالت نہیں ہو سکتی - کیا اس سے بہتر کوئی اور آرزو ہو سکتی ہے - یا کوئی شخص اس سے بڑھ کر اور کوئی تمنا کر سکتا ہے اس کو بھی جانے دیجئے - دیکھئے کہ یہ اسلام کی قوت اتحاد کی کیسی زبردست دلیل ہے - اذان کی آواز شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک تمام اقصائے عالم میں ایک ہے -

فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيرًا۔	مسجدیں منہدم ہو جاتیں جن میں اللہ کا بہت ذکر کیا جاتا ہے۔

مسجد میں جاکر پنج وقتہ باجماعت نماز پڑھنے کی تاکید پر ایک یہ اعتراض ہونا ممکن ہے کہ اس طرح آدمی کی طبیعت میں خواہ مخواہ ریاکاری پیدا ہوجاتی ہے اور اسکی عبادت میں دلی خلوص کی جگہہ ظاہرداری کی شان آجاتی ہے اور یوں ایسی نماز باعثِ ثواب ہونے کے بجائے موجب عذاب بنجاتی ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ۔	افسوس ہے اُن نماز پڑھنے والوں پر جو اپنی نماز کو بھول جاتے ہیں اور جو اس میں دکھاوا کرتے ہیں۔

اور بلاشبہ ایسی عبادت کرنے سے تو نہ کرنا بہتر ہے ؎

زہدِ ریا را گفتمش کردہ بآتش فگن	زہد سے را کہ از بوئے ریا می آید

یہی اعتراض تھا جو مسیحیت نے فریسیوں پر کیا تھا کہ وہ گلی کوچوں میں عبادت کرکے اپنے زہد و ریاضت کا اشتہار دیتے پھرتے ہیں۔ اور ممکن ہے کہ کوئی شخص یہی اعتراض اسلام پر کرے۔ مگر حقیقت میں یہ شخص اس کی کوتاہ بینی اور تنگ نظری ہوگی۔ کیونکہ اول تو اسلام نے خود ہی ریاکاری کی بے انتہا مذمت اور ممانعت کی ہے۔ اور ہر ایک مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ ایک نماز ہی میں نہیں بلکہ اپنے کسی کام میں بھی نمود اور نمائش کو دخل نہ دے۔ اور جو کچھہ کرے وہ خالصتہً لوجہ اللہ کرے۔ لیکن اگر

اوسکی عظمت و عزت کے خیال سے سر تسلیم جھکا دینا - اس کی علوشان اور جاہ جلال کے تصور سے جبین نیاز کو خاکِ عجز و انکسار پر رگڑنا - اور انہی باتوں کے ساتھ ساتھ اس ہی کی وحدت اور خالقیت کا اقرار اور اپنی عبودیت اور گنہگاری کا اظہار اور آخر میں اپنے اور تمام ابنائے نوع کے لئے دعائے خیر - اس سے بہتر اور کیا عبادت ہوسکتی ہے - کیا کسی مذہب یا کسی فلسفے نے اس سے بہتر یا فطرت انسانی کے مطابق اس سے برتر کوئی طریقۂ عبادت سکھایا ہے -

فَبِاَیِّ اٰلَاۤءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ	پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے -

پھر نماز میں مردوں کے لئے تاکید یہ ہی ہے کہ مسجد میں جماعت سے پڑھی جائے - اس سے اتحاد اور اجتماع کے علاوہ بڑا فائدہ یہ بھی مدنظر ہے کہ آدمی مسجد میں بالکل یکسوئی اور دلجمعی سے یاد خدا میں مشغول ہوسکتا ہے - اور جو خشوع اور اطمینان وہاں حاصل ہوتا ہے - وہ گھر میں یا اور کسی عام جا بہ ممکن نہیں اسلام کی انصاف پسندی کو دیکھئے یہاں بھی مسجدوں کے ساتھ اور اہل مذہب کے معبدوں کا کتنے پاکیزہ اور پسندیدہ الفاظ میں ذکر کیا ہے -

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْکَرُ	اور اگر اللہ آدمیوں کو آپس میں ایک دوسرے کے ذریعے سے روک نہ دیتا تو کلیسا اور گرجے اور یہودیوں کے معبد اور مسلمانوں کی

حتی الامکان ایسے خودستائی کے خیال کا پرتو تک دل پر نہ پڑنا چاہیے ورنہ ایک لغزش میں آدمی کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔ اسی کیفیت کو خودی اور نفس پرستی سے تعبیر کیا ہے۔ اور معرفت حقیقی کے راستہ میں یہی مرحلہ سب سے زیادہ سخت ہے۔ مگر چونکہ ہر شخص کی اس تک رسائی محال ہے۔ (بلکہ اکثر اشخاص کے دل میں تو اس کا کبھی خیال بھی نہیں گزرتا) اس لئے اسلام نے اس دشوار گزار راستے کو عوام کے سامنے پیش نہیں کیا۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ | اللہ کسی کو اسکی قابلیت سے زیادہ کا مکلف نہیں کرتا۔

اسی سلسلہ میں ایک بات اور قابل لحاظ ہے۔ نماز اپنی فرضیت کے لحاظ سے کئی قسم کی ہے۔ سب سے مقدم تو فرض نماز ہے جسکی پابندی اوقات کے ساتھ بجا لانے کیلئے بے انتہا تاکید ہے۔ یہاں تک کہ اس کا ترک کسی عذر سے بھی روا نہیں۔ اور اگر کسی وقت یہ قضا ہو جائے تو آیندہ اوسکی تلافی لازمی ہے۔ یہی نماز ہے جو بحالت علالت لیٹے لیٹے خالی اشارۂ چشم و ابرو سے بھی ادا کر لینی چاہیے۔ اس کے بعد واجب۔ سنت۔ نفل نمازیں ہیں۔ لیکن یہ ایسی ہیں کہ انکی قضا نہیں ہے اور بلحاظ فرضیت بھی یہ فرض نمازوں سے اوترکر ہیں۔ یہاں ان کے مسائل کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ بلکہ یہاں مجھے صرف یہ دکھانا ہے کہ ایک عبادت میں اس قسم کی تفریق اصول فطرت کے

اگر کسی طرح نماز با جماعت میں ریا کا شبہ ہو بھی تب بھی محض اس احتمال سے ان فوائد کو نظر انداز نہیں کرسکتے جو اس میں مضمر ہیں ع

نفی حکمت مکن از بہر دل عامے چند

بلا شبہ یہ مسلم ہے کہ مذہب کا تعلق صرف دل سے ہے اور اصلی عبادت ارکان ظاہری کی بجاآوری سے بے نیاز ہے۔ مگر جس طرح ریاکار اعتراض عبادت ظاہری پر وارد ہوتا ہے۔ اسی طرح عجب کا احتمال اس دلی کیفیت پر بھی ہوسکتا ہے۔ بلکہ پہلی صورت میں ریا کی نسبت اس صورت میں عجب کا بہت زیادہ اندیشہ ہے کیونکہ اگر ایک نماز گزار شخص ریاکار ہوگا بھی تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ وہ بعض وقت بلا حضور قلب محض لوگوں کے دکھانے کے لئے شرما شرمی نماز پڑھ لے حالانکہ اس کا دل اسکی جانب مائل نہ ہو۔ بیشک یہ شخص مستوجب عتاب ہے مگر اتنا نہیں جتنا وہ آدمی قابل نفریں ہے۔ جو اپنی پوشیدہ اطاعت شعاری اور نکوکاری پر دل ہی دل میں ناز کرتا ہے۔ اور لوگوں کو ریاکار سمجھ کر حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ کیونکہ اس بارگاہ میں سب سے بڑا گناہ نخوت اور تکبر ہے۔ اور سب سے سخت قصور عجب و غرور ہے۔ جہاں دل میں اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ کا خیال گزرا کہ تمام خوبیاں گئی گزری ہوئیں۔ اور ساری نیکیوں پر پانی پھر گیا۔ اور یہ ہے بھی درست کیونکہ جس دل میں یہ خبائث شیطانی داخل ہوئیں۔ اس میں پھر عجز و انکسار اور توبہ و انابت کی صفات محمودہ کا گزر دشوار ہوجاتا ہے۔ اس لئے

نصف شب بلکہ اس سے بھی جلد اٹھکر نماز اور کلام پاک پڑھنے کا حکم ہوا تھا۔

یَاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا نِّصْفَہٗ اَوِ انْقُصْ مِنْہُ قَلِیْلًا اَوْ زِدْ عَلَیْہِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا۔ اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا	اے پیغمبر جو گودڑی لپیٹے ہوئے ہو۔ رات کو نماز کے لئے کھڑے ہو آدھی رات یا اس سے کچھ کم کرو یا کچھ زیادہ کردو۔ اور قرآن کو ترتیل سے پڑھا کرو بیشک ہم تم پر ایک گران ذمہ داری ڈالیں گے۔

اور اسی راز فطرت کو مدنظر رکھکر کہا گیا ہے کہ۔

حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْنَ	نیکوں کی خوبیاں مقربوں کی برائیاں ہیں

لیکن یہ تفریق صرف حقوق اللہ ہی میں کی گئی ہے۔ حقوق العباد دنیا بھر کے لئے یکساں ہے۔ اور ان میں فرق ہو بھی کیونکر سکتا تھا۔ معاملات دنیا میں سب برابر ہیں اور کسی کو کسی پر کوئی فوقیت یا فضیلت نہیں ہے۔ اگر ہم اپنی مسطورہ بالا مثال لیں تو گویا حقوق العباد کی نگہداشت پاس مارکس کی طرح ہے کہ ان میں کوتاہی کرنیوالا تو کسی طرح اس بات کا مستحق ہی نہیں ہوتا کہ درجہ بہیمیت سے نکل کر مدارج روحانی میں ترقی کرے۔ البتہ اس میں بقدر وسعت سعی مشکور کرنے کے بعد جب وہ اپنی اور اصلاح کرنی چاہے تو اسے حقوق اللہ کے مختلف مراتب طے کرنے چاہییں انہی مختلف زینوں کو فرائض۔ سنن اور نوافل کے نام سے تعبیر کیا ہے اور ان کی اسی اہمیت کی مناسبت سے

کس قدر مطابق اور طبیعت انسانی کے لحاظ سے کتنی موزوں ہے۔
بدیہی بات ہے کہ انسان اپنی ہر قسم کی قابلیتوں کے لحاظ سے
مختلف درجے رکھتے ہیں۔ اور یہ اختلاف ان تمام جسمانی۔ دماغی
اخلاقی۔ اور روحانی طاقتوں میں پایا جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی
سبق سارے مدرسے کے لڑکوں کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔ ایک
ہی جماعت کی کامیابی کا بھی ایک معیار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ غرض
مختصر یہ کہ جس اصول کے مطابق آج کل یونیورسٹیوں نے کامیابی
امتحان میں فرسٹ۔ سیکنڈ۔ اور تھرڈ ڈویژنیں رکھی ہیں۔ بعینہ اسی
نکتہ خیال سے اسلام نے عبادات کو فرائض۔ سنن اور نوافل میں تقسیم
کیا ہے۔ یقینی بات ہے کہ اگر دماغی اور تعلیمی امتحانوں کے برخلاف
روحانی ترقی کا معیار صرف ایک ہی رکھا جاتا تو وہ ایسا ہوتا کہ یا تو بہت
سے لوگ اس تک پہنچنے سے بالکل ہی مایوس ہو جاتے۔ یا بہت سے
آدمیوں کی عالی ہمتی اس پر اکتفا نہ کرتی۔ اسلئے اسلام نے اپنی عبادتوں
میں جو گویا روحانی تعلیم کے سبق ہیں۔ ایسی تفریق کر دی کہ ہر قسم کے لوگ
اپنی اپنی ہمت اور طبیعت کے موافق اُن سے مستفید ہوں۔ فرائض
کی بجا آوری گویا امتحان کی کامیابی کی حد ادنیٰ ہے اور نوافل کا التزام گویا
فرسٹ ڈویژن میں کامیابی کا طریقہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض احکام ایسے بھی
ہیں جو صرف جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خاص کر دئے
گئے اور عوام کو اس بارِ گراں کے قابل نہ سمجھا گیا۔ مثلاً آنجناب کو

وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبْغَۃً | اللہ کے رنگ سے کون رنگ بہتر ہو سکتا ہے

مثلاً یہودیوں اور نصرانیوں میں پہلے تو نہایت شدو مد سے لیکن اب تک بھی یہ رسم تھی کہ اپنے اپنے ایام سبت میں کسی قسم کا کوئی کام کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ سخت قید بالکل مہمل اور نہایت تکلیف دہ تھی۔ عبادت عبادت کے وقت کیجا سکتی ہے۔ صبح سے شام تک نہیں ہو سکتی۔ اور پھر بہت سے روزمرہ کے ضروری کام ایسے ہوتے ہیں کہ جنہیں التوا ممکن نہیں ہوتا اور عبادت میں ان سے کوئی حرج بھی نہیں ہوتا۔ اسلام نے اس میں بھی آسانیاں کر دیں اور اس خلاف فطرت تشدد کو اڑا کر صرف یہ ارشاد کیا کہ

یٰاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ	اے وہ لوگو جو ایمان لائے۔ جب جمعہ کے دن نماز کے لئے بلایا جائے۔ تو اللہ کے ذکر کے لئے لپکو اور لین دین چھوڑ دو۔ اگر تم سمجھو تو یہ بات تمہارے لئے بہت بہتری کی ہے۔ پھر جب نماز ہو چکے تو اپنے اپنے راستے پر منتشر ہو جاؤ۔ اور اللہ کے فضل یعنی تلاش معاش میں لگ جاؤ اور اللہ کو یاد کرو۔ شاید کہ تم بہبودی پاؤ۔

دیکھئے کتنا صاف معقول اور مناسب حکم ہے۔ نماز کے لئے اذان ہو تو کام کاج چھوڑ کر اللہ کی یاد میں مشغول ہو۔ نماز پڑھ چکو تو پھر جاؤ

ان کی تاکید کی گئی ہے تاکہ کوئی شخص ان کی ترتیب میں غلطی نہ کرے۔ کیوں کہ بلاشبہ نوافل فضول ہیں اگر فرائض کی بجاآوری میں تساہل کیا جاتا ہے۔ اور تقلید سنن اس وقت تک مفید نہیں جب تک کہ اس سنت اولی یعنی حقوق العباد کی پوری رعایت اور نگہداشت نہ کی جائے۔

انصاف سے کہیئے کہ کیا روحانی ترقی کے ایسے تدریجی سبق کسی اور مذہب نے بھی دئے ہیں؟ یقیناً نہیں۔ مگر آپ ہی بتایئے کہ یہ تفریق اصول فطرت کے مطابق ہے یا نہیں۔ کیا روحانی ترقی میں ساری دنیا ایک لاٹھی سے ہنکائی جاسکتی تھی۔ اور سب کے لئے ایک ہی معیار کافی ہونا مناسب تھا یہ کہنا ایک بدیہی بات سے انکار کرنا ہے۔ کیونکہ مختلف طبایع میں حصول تربیت کی استعداد یقیناً مختلف اور متفاوت ہے۔ لیکن خیر سے اس رمز کو تو سرے سے کسی مذہب نے سمجھا ہی نہیں۔

مردوں کے واسطے نماز پنجگانہ کے علاوہ ہفتے میں ایک دن جمعے کی نماز بھی اسلام نے فرض کی ہے۔ اور اس میں جماعت کی قید کو شرط لازم کر دیا ہے۔ حقیقت میں یہ ویسی ہی عبادت ہے۔ جیسی یہودیوں کے ہاں شنبے کو اور عیسائیوں کے ہاں یکشنبے کو ادا کیجاتی ہے۔ اگرچہ اسلام نے اسے بھی اپنے رنگ میں رنگ کر ہر قسم کے لچر اور لغو باتوں سے پاک کر دیا ہے۔

خواہ کیسی ہی قوی کیوں نہ ہو جائیں پھر بھی وہ تقرب الی اللہ کا وہ رتبہ حاصل نہیں کر سکتے تھے جو اس صاف اور سیدھی سادی عبادت سے حاصل ہونا ممکن ہے۔ حالانکہ تمام تگ و دو کا اصلی مدعا اور واقعی منشا یہی ہے اور اسکے سوا جو کچھ ہے وہ کچھ بھی نہیں۔ میں نے نماز کی صرف وہ چند ظاہری اور سرسری خوبیاں بیان کرنے کی کوشش کی ہے جو چشم ظاہربیں اس میں بلا غور و خوض دیکھ سکتی ہے۔ لیکن اس کے اصلی لطف اور اسکی روحانی برکتیں وہ شخص کیا بتا سکتا ہے جو اس چاشنی کا لذت آشنا ہی نہو۔ ان کو تو وہی خوب اچھی طرح جانتا ہے جس نے یہ فرمان واجب الاذعان صادر فرمایا ہے کہ

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا وَمِنَ الَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا۔

اے پیغمبر آفتاب کے زوال سے رات کے اندھیرے تک (ظہر۔ عصر۔ مغرب۔ عشا) کی نمازیں پڑھو اور نماز صبح بھی۔ کیونکہ نماز صبح کا وقت بڑا سہانا وقت ہے۔ اور رات کو نماز تہجد بھی پڑھا کرو۔ جو تمہارے لئے نفل ہے۔ شاید کہ اللہ تم کو کسی مقام محمود پر پہنچاوے۔

اپنا کام کاج دیکھو بھالو - مگر اللہ کو ہر حال میں یاد رکھو اصل نفع اسی
میں ہے - اس میں نہ دن بھر کی قید بے زنجیر ہے - نہ اپنے کارہائے ضروری
سے دستکشی کی ضرورت ہے - صرف ایک گھنٹہ بھر تک سب لوگوں کے
ساتھ یاد الٰہی میں مشغول رہنا کافی ہے - اور اتنا وقت بھی اس لیئے چاہیئے
کہ آدمی نماز سے پہلے پہنچکر خطیب کا وعظ سنے - یہودی اور نصرانی
مذہبوں میں صرف اسی ایک یوم السبت کی جو کچھہ عبادت ہے وہی ہے
اس کے سوا ہفتے بھر تک ان کو اللہ کی طرف رخ کرنے کی حاجت
نہیں پڑتی ان کی ساری روحانی ترقی کا دارومدار اسی ایک خطبے پر
ہے جو اسدن گرجے میں سنتے ہیں - اسلام کے روزانہ نماز کے مقابلے
میں تو ان کے ہاں کوئی عبادت ہے ہی نہیں -

نماز کے اصول و قواعد کو دیکھنے کے بعد اب میں پوچھتا ہوں
کہ کیا اور کوئی طریقۂ عبادت اپنے معقول اور مطابق فطرت ہونے میں
اس کا مقابلہ کرسکتا ہے میں یہ نہیں کہتا کہ اور مذہبوں کی طرز عبادت روحانی
ترقی میں مفید نہیں ہے - نہیں - بلکہ غالباً بعض بعض طریقے تو انسان
کی باطنی طاقتوں کو قوی کرنے میں نہایت سریع الاثر تھے لیکن ہاں
وہ طریقے عوام کے کام کے ہرگز نہ تھے کیونکہ ان میں ایسی ریاضتہائے
شاقہ تھیں کہ کوئی دنیا دار و دنیا دار رہ کر ان کو برداشت نہیں کرسکتا تھا
اس لئے وہ خلاف فطرت تھیں اور ان کے عامل خواہ کیسے ہی
عجیب و غریب کرشمے کیوں نہ دکھا سکتے ہوں - اور انکی باطنی طاقتیں

سحری کی ممانعت تھی عیسائیوں میں پر انسٹنٹ فرقہ تو تقریباً آزاد ہی ہے۔ مگر رومن کیتھلک لوگوں میں ایام لینٹ کے روزوں کا شاید اب بھی تھوڑا بہت رواج ہو لیکن بہرحال خود اصل مذہب مسیحیت کو اس حکم سے کچھ تعلق نہیں کیونکہ ان روزوں کا رواج چوتھی صدی مسیحی میں ہوا۔ اور اس وقت ۳۶ دن کے روزے قرار دئے گئے۔ بعد میں ۸۰۰ عیسوی میں فیلکس سوم نے اس میں چار دن اور بڑھا دئے۔ تاکہ یہ تعداد ایام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی چلہ کشی کے برابر ہو جائے۔ لیکن بہرحال اب لینٹ کا جو کچھ وجود باقی ہے وہ کارنیول کے جشن منانے کے لئے ہے۔ اور کچھ نہیں۔ ہندوؤں کی مختلف ذاتیں مختلف قسم کے روزے رکھتی ہیں۔ بعض روزوں میں تو فقط اناج کا پرہیز ہوتا ہے۔ اور دودھ مٹھائی وغیرہ جتنی چاہیں کھائیں بعض ایسا سخت روزہ رکھتے ہیں کہ ایک روز قبل مغرب روزے کی نیت کرتے ہیں تو پھر ۳۶ گھنٹے کے بعد کہیں تیسرے دن بعد طلوع افطار کرتے ہیں۔ اس افراط و تفریط کا نتیجہ ہے کہ یا تو ان میں ضبط نفس کی چنداں ضرورت ہی نہیں یا ان کی پوری احتیاط سے پابندی مشکل ہے۔ حالانکہ یہی ان کا اصلی مدعا تھا۔ اسی طرح ان مذہبوں کے پیرو اپنے مقدس مقامات کی زیارت کے لئے بھی آتے ہیں اور اسے داخل عبادت سمجھتے ہیں لیکن ان مذہبوں نے اس کا کوئی خاص طریقہ یا وقت مقرر نہیں کیا۔ اور یوں وہ مقصود اجتماع و اتحاد فوت ہو جاتا ہے جو اس کی ترویج کی علت غائی تھا۔ بہرحال یہاں بالاجمال ان عبادات اسلامی کا ذکر کافی ہوگا۔

روزہ - زکوۃ - حج

نماز کے علاوہ اسلام نے اپنے معتقدین پر اور بھی چند عبادتیں فرض کی ہیں جن میں نماز کی سی جامعیت تو نہیں ہے لیکن ان میں سے ہر ایک طبیعت انسانی کی کسی خاص صفت کے تصفیے کے لئے مقرر کی گئی ہے اور یوں بالواسطہ اس کا اثر بہ ہیئت مجموعی انسان کے اخلاق اور طرز معیشت و معاشرت پر پڑتا ہے مثلاً روزہ ہر قسم کی خواہشات حیوانیہ کو مغلوب کرنے اور طبیعت کو صبر و تحمل کا خوگر بنانے کا سب سے اچھا طریقہ ہے۔ زکوۃ مال و دولت کی حد سے زیادہ محبت اور بخل و خست کا نہایت عمدہ علاج ہے۔ اور حج تکالیف سفر اور مفارقت احباب کی برداشت کا سبق دینے کے علاوہ اقصائے عالم کے رہنے والوں کو ایک جگہہ مجتمع کر کے دلوں میں اخوت اور اتحاد اسلامی کا خیال راسخ کرتا ہے اس قسم کی عبادتیں اور مذہبوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ لیکن اُن میں نہ یہ شان عمومیت ہے نہ وہ ان کی طرح منضبط اور باقاعدہ ہیں۔ چنانچہ ہندوؤں۔ عیسائیوں اور یہودیوں میں بھی کئی قسم کے روزے ہوتے ہیں یہودیوں کا التواب من حیث القوم عدم و وجود برابر ہے مگر ہاں ان میں روزوں کا دستور تھا اور ان کا روزہ پورے چوبیس گھنٹے کا ہوتا تھا۔ افطار کے بعد پھر

مطابق اشتہا سے کم کھانا تو صحت قائم رہنے کا سب سے اچھا طریقہ ہے
ہی - مگر اس کے ساتھ یہ بھی مسلم ہے کہ کبھی کبھی فاقہ کرنے سے جسم کی رطوبات
فاسدہ اور اخلاط زائدہ جل جاتی ہیں - اور یوں تندرستی میں خلل نہیں
پڑتا - اور اب بعض ڈاکٹر تو لاعلاج امراض کا علاج ہی فاقہ کشی تجویز
کرتے ہیں - بلکہ ان میں سے بعض کی تو یہ رائے ہے کہ اگر آدمی چلہ کشی کرے یعنی
خورو نوش سے ایک دن کے لئے نہیں بلکہ ہفتوں تک بالکل محترز رہے
تو اس سے اس کی بگڑی ہوئی صحت بالکل درست ہو جاتی ہے - اور اسے
ایک خفیف سے ضعف کے سوا اور کوئی شکایت پیدا نہیں ہوتی[۵۱] -
ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کا یہ بیان کہاں تک صحیح ہے - بظاہر تو یہ خلاف
قیاس معلوم ہوتا ہے - لیکن ہم کو اس سے بحث نہیں - البتہ اتنا تو ہر ایک
روزہ رکھنے والا شخص اپنے ذاتی تجربہ سے کہہ سکتا ہے - کہ رمضان
میں بالعموم طبیعت بہت ہلکی اور دماغ بہت صاف رہتا ہے - گو پچھلے
دن کو خفیف سی نقاہت اور سستی سی پیدا ہو جاتی ہے - یا اگر کسی کو
تمباکو وغیرہ کی عادت ہو تو اسے اپنی اس عادت کی وجہ سے کچھ تکلیف
محسوس ہوتی ہے - ورنہ یوں مجموعی طور پر آدمی رمضان میں نسبتاً زیادہ

---

۵۱ - چنانچہ امریکہ کا ایک مشہور اور تجربہ کار طبیب ڈاکٹر ہیلنز ایم اے - ایم ڈی -
پی - ایچ - ڈی - اپنی ایک کتاب میں لکھتا ہے " ایک تندرست شخص ایک مہینے سے
زیادہ عرصے تک بغیر کچھ کھائے پیئے زندہ رہ سکتا ہے - اور بہت سی بیماریوں کا
اس سے بہتر کوئی علاج نہیں کہ اعتدال سے روزے رکھے جائیں " اس دعوی کی

مسلمانوں پر ہر سال ماہ رمضان کے روزے رکھنے فرض ہیں۔ مگر آج کل کی نئی روشنی کی نوجوان نہیں۔ بلکہ بعض اکابر قوم بھی اس کو رسم جاہلیت قرار دیتے ہیں۔ اور موجودہ ترقی وتہذیب کے زمانے کے لئے اسے فضول اور بے سود سمجھتے ہیں۔ ماشاء اللہ۔ کیا الٹی سمجھ ہے اور کچھ نہیں۔ اگر روزوں کو صرف ایک قسم کی ریاضت اور نفس کشی ہی کہا جائے۔ تب بھی اسکی آج کل زیادہ ضرورت ہے؟ جبکہ صبح سے شام تک پنج گانہ نماز کے بجائے پانچوقت کا کھانا فرض موقت کر لیا گیا ہے یا اس زمانہ میں زیادہ ضرورت تھی؟ جبکہ بیچارے بادیہ نشینانِ عرب کو جَو کے ستو اور خشک کھجوروں ہی پر گزارہ کرنا پڑتا تھا۔ اور جب یہ بھی نہ ملتا تھا تو پیٹ پر پتھر ہی باندہ کر آتش اشتہا کو دبا دیا کرتے تھے؟ ان دنوں میں اسکی زیادہ حاجت ہے؟ جب کہ کثرت شکم پروری سے آئے دن ہیضے اور تخمے کا دورہ ہوتا ہے یا وہاں زیادہ حاجت تھی جہاں ریتلے میدانوں کا اُبلا ہوا پانی اور سوکھا ہوا اونٹ کا گوشت بھی مشکل سے نصیب ہوتا تھا۔ اگر یہ اصول درست ہے کہ دوا وہاں دیجاتی ہے جہاں درد کی شکایت ہو۔ اور پرہیز وہاں بتایا جاتا ہے جہاں نقصان کا احتمال ہو۔ تو یقیناً اس کے مطابق نفس کشی اور اجتناب عن الخواہشات ضرورت آغاز اسلام کے زمانے سے آجکل بدرجہا زائد ہے۔

لیکن روزوں کی ریاضت بلاوجہ نہیں ہے۔ اصول طب کے

کیسی ہوتی ہے ؟ جیسے ان کے بہت سے غریب اور محتاج ہمسائے روز برداشت کرتے ہیں۔ روزوں سے آدمی میں خوش خلقی۔ غمخواری۔ ایثار اور انکسار کی صفات محمودہ آجاتی ہیں۔ دل میں دوسروں کا درد اور غیروں کے ساتھ ہمدردی اور طبیعت میں خاکساری اور فروتنی پیدا ہو جاتی ہے اس کے علاوہ صیام اسلام صرف منہ باندھ لینے کا ہی نام نہیں ہے یوں تو ہمیشہ ہی لیکن روزے میں بالخصوص ہر قسم کی بری باتوں سے بچنا تکمیل صوم کے لئے لازمی ہے۔ بدزبانی۔ فحش گوئی۔ غیبت۔ چغلخوری دروغگوئی۔ افترا پردازی سب کچھ ممنوع ہے۔ کیسی طرف برائی سے دیکھنا یا کسی کی بدی سننا بھی مکروہ ہے۔ یعنی مختصر یہ کہ روزہ تب ہی مقبول ہو سکتا ہے جبکہ آدمی ہر قسم کے جذبات حیوانیہ کو دبانے کے ساتھ ہی اپنے سارے حواس ظاہری و باطنی کو بھی ناپسندیدہ باتوں سے بچائے۔ اور حقوق العباد کی بجا آوری کے ساتھ ہی دل کو یاد الٰہی میں ہی مصروف رکھے اخلاقی تعلیم اس سے بہتر اور کیا ہو سکتی ہے اور کون دے سکتا ہے ؟

ظاہر ہے کہ جس کام میں اتنی جسمانی اور اخلاقی مصلحتیں ہیں اس میں ضرور کچھ نہ کچھ روحانی حکمتیں بھی ہونگی۔ البتہ ان کا بیان کرنا ذرا مشکل ہے اور وہ بھی اس شخص کے لئے جو آپ ان سے محروم ہو۔ اور ایسے لوگوں کے سامنے جو خود روح کے وجود پر مادی ثبوت مانگتے ہوں۔ مگر اتنا تو ہم کلام مجید سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ رمضان وہ مبارک مہینہ ہے

بشاش اور خوش دل رہتا ہے۔ اور اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ جو لوگ رمضان میں روزہ رکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ وہ معمولی دنوں میں بھی مقابلتہً بھوک پیاس کی تکلیف کو زیادہ آسانی سے برداشت کر سکتے ہیں۔

جسمانی اور مادی فائدوں سے قطع نظر کرکے روزوں کی اخلاقی مصلحتوں کو دیکھئے یہ مسلم مسئلہ ہے کہ دنیا میں ہر ایک چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ ہر تاریکی نہ ہو تو روشنی محسوس نہ ہو سکے۔ بیماری نہ ہو تو تندرستی بے وقعت ہو جائے۔ تکلیف نہ ہو تو راحت کی کچھ عزت نہ رہ جائے۔ اسی اصول کے مطابق روزے رکھنے سے روزی کی قدر معلوم ہوتی ہے جن لوگوں کو کبھی فاقے کی نوبت نہیں آتی وہ کیا جانیں کہ بھوک پیاس کی تکلیف

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۷ ۔ تائید میں مصنف موصوف نے کئی مثالیں دی ہیں۔ چنانچہ وہ لکھا ہے کہ "نیو یارک کے ایک مشہور اور متمول سوداگر ملٹن ریٹھ بن نے ابھی حال میں ۲۹ دن کا روزہ رکھا اور جب ان سے اسکی بابت پوچھا گیا تو اسنے یہ جواب دیا کہ "مجھے زیادہ مٹاپے وغیرہ کی شکایت تھی۔ اس روزے سے گو میں جسمانی طور پر تو کسی قدر کمزور ہو گیا مگر میرا دماغ زیادہ قوی ہو گیا۔ یہاں تک کہ میں روزانہ ۱۳ گھنٹے بے تکان میز پر کام کر سکتا تھا بعد میں میری صحت نہایت عمدہ ہو گئی۔ ۲۱ سیر وزن گھٹ جانے سے میرے بدن میں چستی آگئی اور میرا دل دوبارہ لڑکوں کی طرح بشاش ہو گیا" اور ایک شخص ڈاکٹر ٹینیر چالیس دن تک کچھ نہیں کھایا۔ اور شکاگو کے ایک اور شخص گرسکم نے ۴۸ دن کا روزہ رکھا۔ یہ مثالیں علمائے تشریح الابدان کے غور و خوض کے قابل ہیں" ملاحظہ ہو کتاب

موسومہ ڈیتھ ڈیفیٹیڈ مصنفہ ڈاکٹر پیلیز طبع پنجم باب ۱۲ صفحہ ۹۱-۱۱۵

کہنے والے ہیں ہی وہ لوگ جن کو ان کی غفلت اور نحوست نے روزوں کی نعمت سے محروم کر رکھا ہے۔ لیکن بہر حال ہم روحانی فوائد کو اپنے دائرہ بحث میں شامل نہیں کرتے کیونکہ تلامذۂ فطرت روح کے نام سے ہی ناک بھوں چڑھانے لگتے ہیں۔ اور ہم کو تعلیم اسلام اور اصول فطرت میں تطبیق ہمارا دعوے ہے۔ مگر ہم صرف ایک بات اور کہنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ بظاہر قیاس یہ چاہتا تھا کہ دن بھر کی فاقہ کشی اور نفس کُشی کے بعد رات کو کچھ آرام ملتا۔ تاکہ اس ریاضت شاقہ کی کچھ تو تلافی ہو جاتی۔ مگر اس کے برعکس یہاں افطار کے بعد عشائے ساتھ بیس رکعت تراویح کی اور قید لگ گئی۔ اور اس میں کلام مجید سننے کی تاکید سے اور بھی زیادہ طوالت ہو گئی۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ رمضان میں مسلمان پہلی رات کو سحری کے لئے اُٹھتے ہیں۔ اس کے بعد بعض خدا کے بندے ایسے بھی ہیں جو سونے کی بجائے تہجد گزاری کرتے ہیں۔ لیکن جو سو بھی رہتے ہیں ان کو بھی کچھ زیادہ وقت سونے کے لئے نہیں ملتا۔ ذرا دیر میں صبح ہو جاتی ہے۔ اور صبح کی نماز کے بعد دن بھر معمولی کام کاج میں گزارتے ہیں۔ شام کو افطار کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھی۔ پھر کچھ کھانا کھایا۔ اب عشا اور تراویح کا وقت ہے۔ اس میں ۱۱ بجے۔ کہئے تکان دور کرنے اور آرام لینے کے لئے کتنا وقت ملا۔ جن لوگوں کو معمولی دنوں میں فرض نماز پڑھنی بھی بعض وقت مشکل معلوم ہوتی ہے۔ وہی لوگ رمضان میں دن بھر روزہ رکھ کر یوں شب بیداری کرتے ہیں۔ آخر یہ بات کیا ہے؟

جس میں پہلے پہل قرآن پاک نازل ہوا۔ گویا بانئے اسلام علیہ التحیۃ والسلام کی بعثت اور مذہب اسلام کی ابتدا اسی مقدس مہینے میں ہوئی۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ	ماہ رمضان جس میں کلام مجید اتارا گیا۔ وہ کلام مجید جس لوگوں کے لئے راہنمائی ہے اور جس میں ہدایت اور حق و باطل میں تمیز کرنے کے احکام ہیں۔

یہیں سے ہم کو روزوں کی فرضیت کی ایک وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ رمضان جو ایسا مبارک اور متبرک مہینہ ہے جس میں ہم اہل اسلام کے لئے خصوصاً اور تمام اہل عالم کے لئے عموماً خیر و برکت کا ظہور ہوا۔ اس مہینے میں ہم اپنی خواہشات جسمانی کو دبا کر روحانی نعمتوں کو حاصل کرنیکی اہلیت اور قابلیت بہم پہنچائیں۔ تاکہ ہم بھی ان انوار الٰہی کے پرتو سے بہرہ یاب ہوں جن سے کائنات کا ذرہ ذرہ جگمگا رہا ہے۔

ہر ایک مذہب میں مختلف صورتوں سے فاقہ کشی کی تاکید خود اس بات کی بڑی دلیل ہے کہ روزے کا روحانی اثر مسلم ہے۔ اور کم سے کم اسکا تو ہر شخص خود بھی تجربہ کر سکتا ہے کہ جب وہ خوب سیر ہو کر کھانا کھالیتا ہے تو اسے ہر قسم کے کام اور خاص کر دماغی محنت یا عبادت میں بڑی آلکسی اور سستی معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس کی ہر قسم کی نفسانی خواہشیں بھی تب ہی زور کرتی ہیں جب شکم سیر ہو۔ بلکہ حقیقت میں عبادات مذہبی کو رسوم جاہلیت اور روحانیت کو ضعیف الاعتقادوں کا ڈھکوسلا

غیر مذہب کی سلطنتیں کاربند ہو رہی ہیں۔ آغاز اسلام کے زمانہ وحشت وجہالت کو دیکھئے اور پھر اس قانون کی مصلحت بینی اور مآل اندیشی پر غور کیجئے۔

یہیں ایک بات اور بھی کہہ دینی چاہیئے کہ زکوٰۃ کی فرضیت سے خیرات کی ضرورت ساقط نہیں ہوتی۔ خیرات ایک جدا چیز ہے۔ اور اگرچہ وہ فرض نہیں ہے اور نہ اسکی کوئی حد مقرر ہے۔ مگر اس کی بھی تاکید بہت کی گئی ہے۔ اور اس کے بارے میں بھی یہ ارشاد ہوا ہے کہ

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔

تم نیکی نہیں پا سکتے جب تک ان چیزوں میں سے نہ خرچ کرو جو تم کو محبوب ہیں۔

اور نیکی کی تعریف میں منجملہ اور باتوں کے یہ بھی فرمایا ہے کہ۔

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ۔

نیکی یہ ہے کہ آدمی مال کی محبت کے باوجود بھی اسے اپنے عزیزوں یتیموں محتاجوں مسافروں فقیروں اور غلاموں کی آزادی کے لئے خرچ کرے۔

یہ اور ایسی ایسی متعدد تاکیدیں زکوٰۃ کے علاوہ غربا کی مالی امداد کے متعلق صادر ہوئی ہیں۔ مگر اسلام کی میانہ روی اور اعتدال پسندی ملاحظہ ہو کہ ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ

نہ بالکل ہاتھ روک لو نہ اتنا پھیلاؤ کہ سب کچھ ہی دے ڈالو۔ اور پھر لوگ تم کو برا بھلا

کہتے ہیں کہ رمضان میں شیطان قید ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہی ہو مگر
یہ کیونکر ممکن ہے؟ شیطان کا تو آج کل سرے سے کوئی وجود خارجی ہی
قابل تسلیم نہیں رہا۔ خیر تو یہ بھی نہ سہی۔ مگر پھر اسے خواہ مخواہ روزوں کی
روحانی برکت سمجھئے۔ کیا اور کسی مذہب نے بھی اپنے پیروؤں کو کوئی ایسی
ریاضت سکھائی ہے؟ یہی نہیں۔ کیا اس قدر تعمیم کے ساتھ اور کوئی
قوم اپنے مذہب کے واسطے اتنی جفاکشی کر سکتی ہے؟ اس کا امکان
تو ہے۔ مگر تاریخ عالم میں اب تک کوئی مثال نہیں ملتی۔ لیکن لطف تو یہ ہے
کہ اس پر بھی اغیار اسلام کی تعلیم پر عیش پسندی اور نفس پرستی کا الزام لگاتے
ہیں۔ سبحان اللہ۔

اب زکوٰۃ کو لیجئے۔ زکوٰۃ حقیقت میں ایک مقررہ ٹیکس ہے جو مال
کی ایک معین مقدار پر ہر سال ادا کرنا چاہیئے۔ یہ اخوت اسلامی کا ایک
عملی اظہار ہے اور اس سے غرض یہ ہے کہ متمول اصحاب اپنے نادار بھائیوں
کی امداد کریں۔ زکوٰۃ کی مقدار بالعموم راس المال کا چالیسواں حصہ ہے۔
آجکل کا مروجہ انکم ٹیکس بھی تقریباً اسی شرح سے لیا جاتا ہے۔ فرق صرف
یہ ہے کہ زکوٰۃ اس مال پر واجب ہوتی ہے جو تمام مصارف نکال کر ایک
سال تک آدمی کے پاس رہے۔ اور انکم ٹیکس ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو تنخواہ
ملنے سے پہلے ہی کٹ جاتا ہے۔ اور یوں دیکھا جائے تو زکوٰۃ سے کئی
گنا بڑھ جاتا ہے۔ لیکن اصول وہی ہے۔ اور کیسی عجیب بات ہے کہ گویا
جو حکم اس بارے میں اسلام نے ۱۳ سو برس پہلے صادر کیا تھا اسے آج

ہیں کہ آپ نے صرف ایک ہی ٹیکس مقرر فرمایا اور اپنے لئے اسے بھی ناجائز قرار دیدیا۔ یہ کیسی دولت طلبی اور جاہ پسندی تھی؟ یہ بھی مسلم ہے کہ آنجناب دولتمند نہ تھے۔ کوئی اور ذرائع آمدنی نہیں رکھتے تھے۔ تو پھر اگر وہ آجکل کی بہترین اور مقبول ترین طرز حکومت یعنی جمہوری سلطنت کے پریزیڈنٹ کی حیثیت سے ہی اپنے لئے کوئی صلہ چاہتے تو کیا یہ خواہش کچھ بیجا ہوتی؟ ہرگز نہیں۔ لیکن اس شہنشاہ دو عالم روحی فداہ کا طبعی استغنا اسے کیونکر گوارا کرتا۔ نہیں۔ حقیقت میں ہمارا استدلال ہی غلط ہے۔ آپ سرے سے بادشاہ تھے ہی نہیں۔ نہ آپ نے جو حکم نافذ فرمائے ان میں ملک و دولت کا کوئی خیال تھا۔ بلکہ جس بات کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے مناسب اور مفید سمجھا۔ اس کا حکم زبان فیض ترجمان سے دلوایا گیا۔ اور اسی لئے یہ بھی ارشاد فرما دیا گیا کہ۔

لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا۔ | میں اس پر تم سے کچھ اُجرت نہیں مانگتا۔

اب حج کو لیجئے۔ حج بشرط مقدرت و اطمینان عمر بھر میں ایک بار فرض ہے۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا۔ | اور ان لوگوں پر اللہ کی طرف سے اس مکان مقدس کا حج فرض ہے جو وہاں جا سکیں۔

اس سے غرض یہ ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں کے مسلمان سال میں ایک مقررہ وقت پر اسلام کے اس ابتدائی وطن اور اصلی مرکز

فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا | کہنے لگیں اور تم حسرت زدہ ہو کر بیٹھ رہو۔

باہمی مشابہت کی وجہ سے زکوۃ کے ساتھ خیرات اور اس میں اعتدال کا ذکر آگیا۔ مگر چونکہ فرض صرف زکوۃ ہے۔ اس لئے یہاں اسی پر بحث کرنی ہے۔ یہ تو ہم کہہ ہی چکے کہ یہ ایک قسم کا خیراتی ٹیکس ہے۔ اور اسکے مصرف بھی اللہ نے ایسے ہی بتائے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بعض مصرف مثلاً غلاموں کی آزادی وغیرہ کی اب ہمارے ہاں ضرورت باقی نہیں رہی۔ لیکن ان کی جگہ مذہبی انجمنوں اور قومی تعلیم گاہوں کے چندوں نے لی ہے اور یہ مصرف بتادینے کے بعد اب میرے خیال میں ہمکو زکوۃ کے اصول فطرت کے عین مطابق ہونے کی کچھ زیادہ دلیلیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

زکوۃ کی بحث میں ایک بات قابل ذکر ہے۔ باوجودیکہ زکوۃ ایک قسم کا ٹیکس ہے اور اسلام نے اس کے سوا اور کوئی ٹیکس مقرر ہی نہیں کیا لیکن پھر بھی بانئے اسلام علیہ التحیۃ والسلام نے اسے اپنے لئے ہی نہیں بلکہ اپنے تمام خاندان کے واسطے حرام فرما دیا۔ تاکہ کور باطن سے کور باطن معترض کو بھی یہ کہنے کا موقعہ نہ ملے کہ آنجناب نے زکوۃ کو اپنی ذات کے لئے حصول منفعت کا ایک ذریعہ بنایا تھا۔ ذرا دیر کے لئے بفرض محال مان لیجیئے کہ آپ رسول مبعوث نہ تھے جاہ پسند بادشاہ اور عیش طلب حکمران تھے۔ اور ان کی ساری کوشش اور محنت اور تمام جنگ وجدال ملک گیری کی ہوس میں تھا۔ تب بھی ہم یہ پوچھتے

لَبَّیْکَ | کوئی شریک نہیں ہے میں حاضر ہوں۔
کہتے ہوئے دوڑنے کا لطف اٹھا چکے ہیں اور جو اپنے ذوق و شوق کے عالم بیخودی میں جنگل بیاباں طے کرتے اور کوہ میدان کی خاک چھانتے ہوئے آخر اس روضۂ مطہر اور مرقد منور کی زیارت سے سرفراز ہو کر مَنْ زَارَنِیْ فِیْ حَیَاتِیْ کے مصداق بن چکے ہیں وہی آپ کو بتا سکتے ہیں کہ اس سرزمین میں کیسی کشش اور کتنی دلیری ہے۔ جیسے اس سرور ہر دو سرا کی بود و باش اور اس سردار کون و مکاں کے قیام و رہائش کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ان طبیعتوں کے لئے جن میں اس محسن حقیقی کے احسان کا احساس ہے۔ صحرائے حجاز کا ایک ایک پتھر لعل بدخشاں اور عقیق یمن سے زیادہ بیش بہا ہے۔ اور ان لوگوں کے واسطے جو اس محبوب بارگاہ آلہی کے بادۂ محبت سے سرشار ہیں۔ بیابان یثرب کی سموم روضۂ رضوان کی نسیم سے زیادہ دلآویز اور حیات بخش ہے۔

حقیقت میں حج کا سب سے بڑا منشا ہی یہ ہے کہ دلوں میں اسلام کی عظمت اور بانیٔ اسلام علیہ التحیۃ والسلام کی محبت پیدا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسکو تمام عبادات میں سب سے موخر اور مشروط رکھا ہے۔ تاکہ جب آدمی اپنے اور سب فرائض بجالا کر تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کے مختلف مدارج طے کرے تو پھر ان سب باتوں کے اثر سے جو محبت اسلام

سلہ یہ ایک حدیث کا ٹکڑا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے میرے مرنے کے بعد میری قبر کی زیارت کی وہ اس آدمی کی طرح ہے۔ جس نے مجھے زندگی میں دیکھا۔

پر جمع ہوکر ان شعائر اللہ کی زیارت کریں۔ جنکو دین حنیفی کے ساتھ قدیم تعلقات نے مقدس بنادیا ہے۔ اور ان رسوم مذہبی کو بجالائیں۔ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے اہل ایمان ادا کرتے رہے ہیں اس میں یہ بھی مصلحت ہے کہ اس جگہہ کو دیکھکر جہاں سے وہ نور ہدایت کا آفتاب جہانتاب طالع ہوا۔ دلوں میں صداقت کی روشنی بڑھے اور اس مقام کی زیارت سے جہاں سے وہ رحمت و رافت کا چشمہ پھوٹا طبیعتوں میں نیکی اور نیکوکاری کی اُمنگ پیدا ہو۔ اسی وجہ سے حج کی فرضیت کے ساتھ ہی یہ حکم محکم بھی صادر ہوگیا کہ

لَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ۔	حج میں نفسانی خواہش کی اور گناہ کی اور جھگڑے کی کوئی بات نہ ہونی چاہیے۔

لیکن چونکہ حسن معاشرت اور خوبیئے اخلاق تو اسلام کی تعلیم کا اصل اصول ہی ہے اس لئے یہ بات کچھہ دل میں چبھتی نہیں کہ حج جیسی مشروط اور مفید فی المکان والزمان عبادت کا مدعا صرف لڑائی جھگڑے اور فسق و فجور سے روکنا ہو بلکہ گمان غالب ہے کہ اسکی فرضیت میں کوئی اور راز ہو۔

آہ اس راز کو عقل ظاہر بیں سے نہیں بلکہ دل محبت آئیں سے پوچھئے اس کا شافی جواب میں نہیں دیسکتا۔ وہ لوگ دیسکتے ہیں جو بادۂ اُلفت سے مخمور اور نشۂ محبت میں چور ہوکر سر و پا برہنہ دوڑے بطحا میں۔

اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ	حاضر۔ حاضر اے اللہ میں حاضر ہوں۔ اے کہ تیرا

حصہ سوم - آداب و معاملات

عام اخلاق

ہم اسلام کے عقائد و عبادات کو اجمالی نظر سے دیکھ چکے اب یہ دیکھنا ہے کہ اس روحانی تربیت کے علاوہ اسلام نے معاملات دنیا کے متعلق کیا کچھہ سکھایا ہے - اور جو کچھہ سکھایا ہے اسکی اصول فطرت کہاں تک تائید کرتے ہیں بہت کم مذہب ایسے ہیں جنہوں نے معاملات کو بھی اپنے دائرۂ اثر میں لیکر ان میں عبادت کی شان پیدا کر دی ہو لیکن یہ اسلام ہی کی خصوصیت ہے کہ اس نے معاملات کو عبادات کا تقدس ہی نہیں دیا - بلکہ حقوق العباد کو حقوق اللہ پر بھی مقدم کر دیا - اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ ہر ایک معاملے میں انصاف کا اتنا خیال رکھا کہ کسی خفیف سی بات میں بھی کسی کی ذرہ برابر حق تلفی نہیں ہونے دی - اکثر مذہبوں نے عدل و انصاف پر اتنا زور دینے کی بجائے عفو و رحم کی زیادہ تاکید اور تعریف کی ہے - اور بظاہر کہنے میں رحم انصاف سے زیادہ اچھا بھی معلوم ہوتا ہے - مگر حقیقت میں یہ ایک مغالطہ ہے - بلاشبہ رحم نہایت ہی پسندیدہ شئے ہے - مگر اس ذات کے لئے جسکی حق تلفی کا ڈر نہیں جسپر ظلم کا امکان نہیں - ہمارے

اس کے دل میں پیدا ہوئی ہو۔ اسے وہ اسلام کے ابتدائی وطن اور اصلی مرکز کی زیارت سے تازہ کرے۔ اور اس کے ساتھ ہی تمام دنیا کے مسلمانوں میں باہمی رشتۂ اخوت واتحاد مضبوط و مستحکم ہو جائے اس لئے ؎

مارا بہ رنگِ شبنم تا آستانِ خورشید
باید بدیدہ رفتن گر بال و پر نباشد

لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ۔	کے ذمے ہے۔ بیشک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

بلاشبہ اسلام اس سے زیادہ فطرت شناس تھا کہ کوئی ایسا حکم دیتا کہ "اگر کوئی چاہے کہ تجھ پر نالش کر کے تیری قبا لے۔ تو تو کرتے کو بھی اسے لینے دے۔ اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار لے جائے۔ اس کے ساتھ دو کوس چلا جا" کیونکہ یقیناً یہ حکم صرف ناممکن التعمیل ہی نہیں بلکہ خلاف فطرت بھی ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ یہ حکم دراصل عفو و درگزر اور ضبط نفس کی تاکید کے طور پر دیا گیا تھا اور اس سے اس کے لفظی معنی مراد نہ تھے۔ مگر پھر بھی اس کا کوئی جواب نہیں کہ اس میں یہ اصول نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ ہم پر ہمارے نفس کے بھی کچھ حق ہیں اور ہم اپنے اوپر بھی ظلم کر سکتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ مسیحیت نے اس راز قدرت کو سمجھا ہی نہیں۔ اور اسی وجہ سے اس نے عفو و رحم پر اتنا زور دیا ہے کہ اس کی تاکیدیں حد افراط تک پہنچ کر مہمل اور لغو ہو گئی ہیں اور اگر مسیحی اپنے مذہب کے ان احکام کی پیروی کرتے تو یقیناً صفحہ ہستی سے ان کا نام و نشان کب کا مٹ چکا ہوتا۔

مسئلہ ارتقا کے نہایت ہی وسیع اور اہم اصول تنازع للبقا کا تو مفہوم ہی یہ ہے کہ دنیا کے میدان کارزار میں چھوٹی سے چھوٹی شے سے لیکر بڑی سے بڑی ہر ایک ذی حیات شے اپنے آس پاس کے آثار حیات کو دبا کر خود ان کی جگہ لینا چاہتی ہے اور اس کشاکش ہستی میں جو چیز ذرا بھی کمزور یا حالات کی ناموافق ہوتی ہے۔ وہ فنا ہو جاتی

لئے رحم کا حکم بالعموم مناسب نہیں ہے - کیونکہ اس میں ہماری حق تلفی کا احتمال ہے اور صرف ہماری ہی نہیں بلکہ قیاس غالب ہے کہ اس سے اور بھی بہت سے لوگوں کی حق تلفی ہو - اور ظاہر ہے کہ وہ رحم جو کسی دوسری جگہ ظلم کا باعث ہو - ہرگز پسندیدہ اور قابل تعریف نہیں ہو سکتا - اسی بنا پر اسلام نے ہر جگہ حکم تو انصاف کا دیا ہے - مگر ساتھ ہی رحم کی سفارش کی اور ظلم کی نہایت سختی سے ممانعت فرمائی تاکہ کوئی شخص کسی عذر پر بھی دوسروں کی حق تلفی کر کے کسی پر رحم کرنے کی جرأت نہ کرے - ہاں جہاں اس رحم کا اثر اس شخص واحد کی ذات ہی تک محدود رہتا ہو - وہاں اسے ایثار کر کے اپنے حق کو معاف کر دینے کا اختیار ہے - اور اس ایثار کا صلہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے لیا ہے ایک حاکم کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی چور کو رحم کھا کر چھوڑ دے - کیونکہ یہ رحم اس شخص پر ظلم ہے جس کے ہاں چوری ہوئی یہ ہی نہیں - بلکہ اس چور کی رہائی مخدوش اور مخل ہے - عوام کے حفظ مال کے لئے - البتہ ایک آقا اپنے خادم کی گستاخی یا سستی کو نظر انداز کر سکتا ہے - کیونکہ اس کا اثر آقا کی ذات سے آگے نہیں بڑھتا - اور اسے اس قدر ایثار کا اختیار ہے - لیکن اسلام کی عدل پسندی اس کا حکم نہیں دیتی - فقط اسکی سفارش کرتی ہے اور اس کا فرمان یہی ہے کہ

جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ	بُرائی کا بدلہ ٹھیک ویسی ہی بُرائی ہے - لیکن جو معاف کر دے اور صلح کرے - تو اس کا صلہ اللہ

نظر انداز کر کے غیر کو اپنے اوپر ترجیح دے تو اللہ اس کو اس کا صلہ دیگا۔
اسی بنا پر غصے کے دبانے کا خاص طور پر ارشاد ہوا ہے کہ

وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۔	اور غصے کو پی جانے والے اور لوگوں کو معاف کر دینے والے اور اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ۔

اسلام کا حکم معاملات کی بابت یہ ہے کہ

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ	اے وہ لوگو تم جو ایمان لائے ہمیشہ انصاف پر قائم رہو ۔

اور یہ حکم صرف اپنے اور اپنے دوستوں ہی کے معاملے کے لئے نہیں ہے بلکہ اغیار و اجانب کے ساتھ بھی یہی انصاف مدنظر رکھنے کا ارشاد ہوا ہے چنانچہ حکم یہ ہے کہ

وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۔	اور اگر تو ان میں (یعنی اپنے دشمنوں میں) فیصلہ کرے تو تو ان میں انصاف سے فیصلہ کر ۔ بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے ۔

یہی انصاف ہر قسم کے لین دین اور تجارتی کاروبار میں ملحوظ خاطر رکھنے کا حکم ہے اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ

وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۔	اے لوگو لین دین میں پورے انصاف سے کام کرو ۔ اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم مت دو اور زمین پر فساد نہ پھیلاتے پھرو ۔

ہے" اور اس لحاظ سے جو حال افراد کا ہے وہی اقوام اور انواع کا ہے -
اس لئے جو شخص فرط رحم سے اپنے آپ کو اتنا مٹا دے کہ دوسرے لوگ اس کے حقوق کو پامال کرنے لگیں وہ صرف اپنے نفس ہی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ حقیقت میں وہ اس نقصان کا بھی جواب دہ ہے جو اس کی بے انصافی سے اوسکی قوم اور ملک پہونچتا ہے - سچ یہ ہے کہ علم اخلاق کا یہ اصول کہیں بھی غلط نہیں ہوتا کہ اچھے سے اچھے کام میں بھی افراط و تفریط دونوں مذموم اور معیوب ہیں مگر خود علم اخلاق نے یہ بات ارشاد نبوی

خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُھَا | کاموں میں سب سے بہتر ان میں اعتدال اور توسط ہے

سے ہی سیکھی ہے -

اسلام کی یہ میانہ روی اور اعتدال پسندی کی تعلیم اول سے آخر تک ہر ایک بات میں ہے - دنیا کے نہایت ہی اہم معاملات سے لیکر روزمرہ کے ذرا ذرا سے کاموں تک میں وہی ایک عدل و انصاف کو مدنظر رکھنے کی تاکید ہے اور اس کے ساتھ ہی حسب حیثیت ایثار اور عفو اور ملاطفت کی سفارش کی گئی ہے -

وَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا وَالصُّلْحُ خَیْرٌ | اور تم معاف کر دو اور صلح کر لو اور صلح اچھی چیز ہے -

یہی اسلام کے عین فطرت ہونے کی نہایت قوی دلیل ہے کہ حکم تو دیا ہے انصاف کا اور سفارش کی ہے رحم کی یعنی قدرت کا اصل اصول تو ہر ایک امر میں انصاف ہے اور اس لئے انصاف ہی کرنا چاہیئے - لیکن چونکہ انسان ضبط نفس پر قادر ہے - اس لئے وہ اپنے حقوق کو ایک حد تک

دوسرے میں کفارے[۱] کا مسئلہ نہ پایا جاتا۔ یہی تو وجہ ہے کہ عیسائی مصنّف اسلام پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا خدا اتنا منتقم اور سخت گیر ہے کہ گویا اس میں رحم و کرم کی وہ صفتیں ہی نہیں جن پر مسیحیت کو اتنا ناز ہے اور جن کی بنا پر وہ اسے مجازی نہیں بلکہ عرفی اور حقیقی معنوں میں اپنا باپ کہنے لگے۔ لیکن اس اعتراض کی لغویت کے لئے عقائد اسلام سے زیادہ واقفیت کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ جس کسی نے کلام مجید کو کھول کر اسکی پہلی سطر پر ہی ایک نظر ڈالی ہے وہ ہی سمجھ سکتا ہے کہ خدائے اسلام کے رحمٰن و رحیم ہونے سے انکار کتنی سخت کور باطنی اور سخن پروری ہے۔ ہاں البتہ مسلمانوں کے خدا میں ایسا ظالمانہ رحم نہیں ہے کہ وہ پہلے تو ایک شخص (یعنی حضرت آدمؑ) کے گناہ نافرمانی کو ان کی ساری قیامت تک آنے والی اولاد کے سر تھوپ دے اور انکی وجہ سے سب کو گنہگار اور نافرمان بردار ٹھہرائے اور پھر نعوذ باللہ اپنے بیٹے یا خیر کم سے کم اپنے ایک خاص بندے کو ناکردہ گناہ اس کے تمام قصوروں کی پاداش میں سولی پر چڑھائے اور یوں ہر طرح انصاف کا خون کرے۔ مانا کہ ہم سب گنہگار ہیں اور نافرمانی ہماری طبیعت ثانی ہے۔ مگر اول

[۱] کفارے کا مسئلہ یہ کہ گویا حضرت عیسیٰ خود مصلوب ہو کر بنی تمام اُمت کے گناہوں کا کفارہ دے چکے۔ اور اب قیامت تک ہمارے مسیح معصوم اور گناہوں سے پاک ہیں۔ حقیقت میں علمائے مسیحیت نے رحم کی تعریف کے غلو میں یہ مسئلہ ایجاد کیا مگر یہی بات ہے کہ عقل سلیم کے نزدیک ایسا کفارہ کسی طرح قرین انصاف نہیں ہو سکتا۔

غرض یوں ہم دیکھتے ہیں اسلام نے تمام معاملات معاشرت میں عدل و انصاف کو اپنا اصل اصول قرار دیا ہے اور رحم و عفو و ہمدردی اور ایثار کو اوس کا مشیر اور مصلح ٹھیرایا ہے - اور کہیں بھی ایسی صورت نہیں پیدا ہونے دی کہ رحم اپنی حد سے گزر کر ظلم بنجائے - البتہ صفت رحم اللہ کو اپنے لئے سب سے زیادہ محبوب ہے اسی لئے اس نے اپنے نام کے ساتھ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ رحمن اور رحیم کا لقب پسند کیا ہے - اور ان ناموں کے اعادے اور تکرار سے مدعا ہی یہ ہے کہ ہم کو بھی ان صفتوں کے اختیار کرنے کی ترغیب ہو -

میں یہ نہیں کہتا کہ اسلام کے سوا اور مذہبوں نے انصاف کی تعلیم ہی نہیں دی ہے - نہیں - یہ تو کیونکر ممکن تھا کہ تربیت اخلاق انسان کے ایسے عالمگیر قانون اس تمام قوانین عالم کے اصل اصول کو نظر انداز کر دیتے - عدل و انصاف کی تعریف تو سب نے ہی کی ہے - مگر میرا کہنا یہ ہے کہ جو وقعت اور جو اہمیت اپنے سارے احکام و قواعد میں انصاف کو اسلام نے دی ہے - وہ اور کسی مذہب نے نہیں دی - مثال کے طور پر دیکھئے کہ اگر ہندویت اور مسیحیت نے انصاف کا وہی درجہ رکھا ہوتا جو بعد میں اسلام نے رکھا تو ایک میں ذاتوں[۵] کی تفریق اور

[۵] - ظاہر ہے کہ انصاف کی نظروں میں تمام آدمی یکساں ہیں اور مذہب کو صرف اس کے اعمال سے بحث ہونی چاہئے - سودر اور برہمن کا فرق اور پھر انکے مراتب دنیوی کا ہی نہیں بلکہ سزا اور جزا اور مدارج اخروی میں بھی امتیاز - یعنی چہ -

جس سے یہ بات بالکل صاف ہو جائے گی۔ ایک باپ ہے جو اپنے بچوں پر نہایت مہربان اور شفیق ہے۔ اور ان سے بیحد محبت کرتا ہے مگر ہاں جب کوئی ایک بچہ کوئی قصور کرتا ہے۔ تو جو سزا اسے دیتا ہے وہ ہی سزا دوسرے بچے کو بھی اسی قسم کا قصور سرزد ہونے پر دیتا ہے۔ اور جب کسی ایک کی کسی حرکت کو نظر انداز کرتا ہے تو دوسرے کی بھی اسی طرح کی حرکتوں کو نظر انداز کردیتا ہے۔ غرض سب بچے اس کے نزدیک برابر ہیں۔ اور وہ ان کے ساتھ بیحد شفقت مگر ساتھ ہی پورے انصاف کا برتاؤ کرتا ہے۔ یہی عقیدہ اسلام کا اپنے اللہ کی بابت ہے۔ اب یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ انصاف کی بابت یہ عقیدہ قوانین قدرت کی یکسانیت اور عدل پرستی پر غور کرنیوالے کے نزدیک کتنا معقول اور کس قدر قابل قبول ہے ع

آفتاب آمد دلیل آفتاب

انصاف کے متعلق اس سے زیادہ صاف اور کھلا ہوا حکم اور کیا ہوگا کہ

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۔ (مائدہ ع ۲ پ ۶)	اور کسی قوم کی دشمنی تم سے یہ جرم نہ کرائے کہ تم انصاف نہ کرو (نہیں بلکہ ہر حال میں) انصاف کرو کیونکہ یہ پرہیزگاری سے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو بیشک اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔

تو اس کا الزام حضرت آدمؑ پر نہیں ہے۔ دوسرے اس کا کفارہ حضرت عیسیٰؑ نہیں ہو سکتے۔ تمام قوانین قدرت پکار پکار کر یہ ہی کہتے ہیں کہ۔

لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی	کوئی شخص دوسرے کا بار نہیں اٹھائے گا۔

اور جہاں کہیں اس کے خلاف ہوگا۔ وہاں وہ انصاف نہیں کہا جائیگا۔ ظلم ہی کہلائے گا۔ یہاں تک کہ ایشیائی شاعری کا مصور خیال عدالتِ محبت میں بھی اسے انصاف نہیں کہہ سکتا اور یہی کہتا ہے کہ ؎

جفا نگر کہ بہ دیوانِ عشق مے طلبند	زآبِ دیدۂ بلبل حسابِ خندۂ گل

ہمارا خدا رحیم ہے مگر انصاف کے ساتھ۔ گناہوں کا بخشنے والا ہے مگر ایک ہی طریقہ اور اصول پر۔ سزا اور جزا دینے والا ہے۔ مگر اعمال و افعال کے لحاظ سے اس کے نزدیک سب برابر اور یکساں ہیں۔ کسی کو کسی پر بالذات کچھ فضیلت نہیں ہے۔ کوئی فرقہ بالخصوص اس کے الطاف کا مستحق نہیں ہے۔ کوئی قوم بالتخصیص اس کی عنایتوں کی حقدار نہیں ع

فیض ازلی نبود مخصوص گروہے را	حرفلیست کہ می خوردن آئین مغانستے

صرف ایک معیار ہے اور وہ یہ کہ

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ	بیشک تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز تم میں سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اس کا رحم و کرم بے پایاں اور اس کی شفقت و رافت بے انتہا ہے۔ کیا اسلام کے اس عقیدے پر اعتراض کرنے والے یہ نہیں سمجھ سکتے کہ رحم و انصاف کیونکر جمع ہو سکتے ہیں۔ ایک مثال لیجیے

مخالف ہوتا - اور ایسا عمل یقیناً ناممکن تھا - جسکی عملی مثال ہمارے سامنے موجود ہے - اور ایسا حکم دینا اسلام جیسے عالمگیر مذہب کی شان سے بالکل بعید تھا - اسلام نے جو حکم دیا وہ ایک طرف تو اصول فطرت کے عین مطابق ہے - اور دوسری طرف اس میں نہایت اعلیٰ درجے کے ایثار اور نفس کشی کی اخلاقی اور روحانی خوبی کا ارشاد بھی موجود ہے -

شائد یہ بات ان لوگوں کو کچھ عجیب معلوم ہو - جو اسلام پر بہ زور شمشیر پھیلائے جانے کا اتہام لگاتے ہیں - اور اس پاک اور مقدس مذہب کو بیجا کشت و خون کی اجازت دینے کا ملزم ٹھہراتے ہیں - غالباً وہ یہاں یہ اعتراض کریں کہ اگر سچ مچ اسلام کو انصاف اور درگذر کا ایسا ہی خیال تھا تو اس نے اپنے مخالفین کے مقابلہ میں تلوار کیوں اٹھائی - اور غزوات کی نوبت ہی کیوں آئی - لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر تعصب کا پردہ ان کی آنکھوں پر پڑا ہوا نہ ہوتا تو ان کے دل میں یہ اعتراض پیدا ہی نہ ہوتے - اور انصاف اور عفو کے یہی صریح اور تاکیدی احکام اسلام پر سے ایسے لغو اور بیہودہ الزام رفع کرنے کے لئے کافی ہوتے - مگر معترضین نے ان کو تو نہیں دیکھا - فقط اس ارشاد کو لے لیا - کہ

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ -	اور ان لوگوں کو (یعنی اپنے دشمنوں کو) جہاں پاؤ مار ڈالو اور جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے - تم بھی ان کو وہاں سے نکال دو

انصاف کرنے میں نہ دشمنی کا لحاظ ہے۔ نہ دوستی کا پاس ہے حق حق ہی ہے جس میں کسی خارجی اثر سے کچھہ کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ اور ہم کو یہ ہدایت ہے کہ خواہ کچھہ ہو مگر حق پر ہر حال میں قایم رہیں۔ یہاں تک کہ خود حق کی حمایت میں بھی حق سے زیادتی جائز نہیں ہے۔

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِيْنَ۔

(نحل ع ۱۶ پ ۱۴)

اور اگر تم دین کی بحث میں مخالفوں سے سختی کرو تو اتنی ہی سختی کرو جتنی تم پر کی گئی ہے اور اگر تم اتنی بھی نہ کرو اور اس سختی پر صبر کر لو تو بیشک یہ صبر کرنے والوں کے حق میں بہت اچھا ہے۔

سبحان اللہ کتنے پاکیزہ اور مناسب الفاظ میں انصاف اور نرمی کی ہدایت کی گئی ہے خود تو کسی طرح کی سختی کرنے کی قطعی ممانعت ہی ہے۔ البتہ سختی کا جواب سختی سے دینے کی اجازت ہے۔ مگر ساتھ ہی اس پر صبر کرنے کی تعریف کر کے گویا اس منصفانہ بدلہ لینے کو بھی کنایتہً ناپسند قرار دیا ہے۔ اور یوں دشمنوں تک سے عفو و درگذر کی ہدایت فرمائی ہے۔ اس میں قابل غور بات تو یہ ہے کہ فطرت انسانی کا کتنا لحاظ رکھا گیا ہے۔ قانون بنانے والا۔ اور وہ بھی حاکم علی الاطلاق اگر چاہتا تو صرف یہ ہی کہدیتا کہ "نہیں خواہ کوئی تم کو کتنا ہی ستائے مگر تم اسے کچھہ مت کہو۔ یا اگر کوئی تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو تم دوسرا بھی آگے کر دو" مگر نہیں یہ حکم اصول فطرت کے بالکل منافی اور تقاضائے بشریت کے بالکل

نہ کی ہوں۔

اس کے مقابلے میں دیکھئے کہ اسلام نے اصول فطرت کے ساتھ لوازم اخلاق اور شرائط انصاف کو کس قدر مدنظر رکھا ہے۔ بلاشبہ حمایت مذہب میں تلوار اُٹھانے کی اجازت دی تھی۔ مگر کن لوگوں کے مقابلے میں؟ جو مسلمانوں سے لڑنے میں پیش دستی کریں۔ جو ان کو ان کے گھروں میں سے نکالنا چاہیں۔ جو مقدس مقامات کی بے حرمتی کریں۔ کیا ایسی مجبوری کی صورت میں بھی مسلمان اپنی حفاظت کے لئے ہاتھ پاؤں نہ ہلاتے؟ کیا پھر بھی وہ اپنے دشمنوں کا مقابلہ نہ کرتے؟ اگر وہ ایسا کرتے تو شریعت اسلام کے مطابق ہی نہیں۔ بلکہ اصول فطرت کے مطابق سخت ترین جرم کے مرتکب اور شدید ترین سزا کے مستحق ہوتے۔ پھر یہ دیکھئے کہ یہ ہارے درجے لڑنے کا حکم دیا کس زمانے میں گیا تھا؟ جب کہ مسلمان نہایت ہی کمزور اور مظلوم تھے۔ جبکہ وہ چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرے ہوئے تھے۔ جبکہ خود ان کے گھر والوں نے ان کے اقارب و احباب نے اپنے ساتھ ان کا میل جول اور روٹی پانی تک بند کر دیا تھا۔ باوجود ان سب باتوں کے اسلام کی انصاف پسندی دیکھئے کہ پیش قدمی کرنے کو تب بھی نہیں کہا۔ اور زیادتی کرنے سے پھر بھی روک دیا اور جا بجا یہی حکم دیا کہ

وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ــــ	اور تم زیادتی مت کرو۔ اللہ زیادتی کرنیوالوں کو پسند نہیں کرتا۔

| اور فساد خونریزی سے بھی بڑھکر سخت ہے

اور پھر بے سوچے سمجھے لگے اسپر اعتراض اور نکتہ چینیاں کرنے - یہ ہی ہے وہ حکم جس کی بنا پر مخالفوں کے نزدیک مسلمانوں کا مذہب اتنا خوفناک ہے - اور اسی کی وجہ سے اسلام پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اسکی اشاعت بزور شمشیر ہوئی اور اس کی بنیاد خونریزی اور غارتگری پر رکھی گئی بقول برق کلیسا ؎

غیر ممکن ہے مجھے انس مسلمانوں سے
مطمئن ہو کوئی کیونکر کہ یہ ہیں نیک نہاد

بوئے خوں آتی ہے اس قوم کی افسانوں سے
ہے ہنوز انکی رگوں میں اثر حکم جہاد

مگر سوچیے تو کہ اس میں اچنبے کی کونسی بات ہے اور خاص کر ان لوگوں کو تو اس پر کچھ اعتراض ہونا ہی نہ چاہیے - جو مسئلہ تنازع للبقا کے قائل ہیں - اور تمام عالم موجودات میں نفسی نفسی کا شور سنتے ہیں - کیونکہ حامیان ارتقا کے خیال میں تو اس سے بڑھکر کوئی گناہ اور اس سے زیادہ سخت کوئی جرم ہی نہیں ہے - کہ اپنے سامنے کسی کے حقوق کا کچھ بھی لحاظ رکھا جائے یا حفاظت نفس کے مقابلے میں دوسروں کو پامال کرنے میں ذرا بھی تامل کیا جائے - ان کے نزدیک کشاکش ہستی میں ظلم و زیادتی بے معنی لفظ ہیں کیونکہ ضعیف کا ضعف ہی اس کا اتنا بڑا جرم ہے کہ جس کی سزا قتل و پامالی کے سوا اور کچھ نہیں - محض فلسفہ جدید کا نکتہ خیال ہی نہیں ہے بلکہ مدتوں سے مہذب دنیا کا یہی دستور العمل رہا ہے خواہ سیاسیات نے اسکی کچھ ہی تاویلیں کیوں

وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (نحل ع۱۶ پ۱۴)

باتوں اور عمدہ نصیحتوں کے ذریعے سے بلا اور ان سے ایسی طرح بحث کر جو بہت ہی پسندیدہ ہو۔

اور رہا کشت وخون اور فتنہ وفساد کی تو اسلام نے کسی حالت میں کسی پر بھی کبھی اجازت نہیں دی۔ اور بھلا وہ مذہب اسکی اجازت دی بھی کیونکر سکتا تھا جس کا نہایت ہی صریح حکم ہے کہ

وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ

تم دنیا میں انتظام کے بعد فساد مت پھیلاؤ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم ایمان والے ہو۔

اور جس نے اعلان کیا ہے کہ

اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔

فساد کشت وخون سے بھی زیادہ سخت گناہ ہے

اس لئے یہ کہنا کہ اسلام نے مخالفوں کے ساتھ پورا انصاف مدنظر نہیں رکھا۔ صریح بہتان اور محض غلط ہے۔ اسلام میں مطابقت فطرت کا جو اصول ہر ایک بات میں مدنظر رکھا گیا ہے وہ دشمنوں اور مخالفوں کے ساتھ برتاؤ کرنے میں بھی نظر انداز نہیں کیا گیا اور اس بارے میں بھی جو کچھ حکم دیے گئے وہ عین عدل وانصاف پر مبنی ہیں۔

کیا ان احکام کے بعد بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ اسلام نے بیجا کشت وخون کی اجازت دی ہے - یا ظلم وزیادتی کو روا رکھا ہے - خود اشاعت مذہب کے متعلق تو نہایت ہی صاف ارشاد ہے کہ

لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ	مذہب کے معاملے میں کوئی زبردستی اور مجبوری نہیں ہے -

اس کے سوا اور ایک جگہہ ارشاد ہوا ہے کہ

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ اسْتَجَارَکَ فَاَجِرْہُ حَتّٰی یَسْمَعَ کَلَامَ اللّٰہِ ثُمَّ اَبْلِغْہُ مَاْمَنَہٗ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْلَمُوْنَ -	اور اگر کوئی مشرک تجھ سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دے یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سنے پھر اسے اس کی امن کی جگہہ پہنچا دے - یہ رعایت اسلئے ہے کہ یہ لوگ سچائی کو جانتے نہیں -

ماشاءاللہ کتنی عجیب بات ہے کہ مخالف تو اسلام پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے لوگوں کو زبردستی پکڑ پکڑ کر مسلمان بنا لیا - اور اسلام کا یہ حکم ہے کہ اگر کوئی شخص تمہارے قبضے میں آ بھی جائے تو اس حالت مجبوری میں اس سے کچھہ نہ کہو بلکہ اسے آزاد اور مطمئن ہو جانے دو تاکہ وہ خود حق و باطل پر غور کرکے درست انتخاب کر سکے - **مصرع**

بہ بیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

فی الواقع اسلام نے اشاعت مذہب کے لئے صرف یہی ایک قاعدہ مقرر فرمایا ہے کہ

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ	تو ان کو اپنے اللہ کے راستے کی طرف عقل کی

بن گئے - اور وہ قبیلے جن کی باہمی عداوت کی آگ آتش ایران کی طرح بجھائے نہیں بجھتی تھی ایک دوسرے کے سچے جان نثار اور حامی و مددگار ہو گئے - یہی وہ احسان عظیم ہے جسکی بابتہ ارشاد ہوا ہے کہ

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا - (ع پ)	اور اپنے اوپر اللہ کی اس مہربانی کو یاد کرو کہ تم باہم دشمن تھے پھر اللہ نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت ڈالدی پس تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی بن گئے -

دنیا حیران ہے کہ یہ بے مثل اور بے نظیر تغیر کیونکر پیدا ہو گیا - اور غیر قومیں سمجھ نہیں سکتیں کہ ان بظاہر متباین اور متضاد اجزا کو کس طاقت نے مجتمع اور متحد کر دیا - یہی وجہ ہے کہ وہ اس اتحاد اسلامی کا سبب زور شمشیر قرار دیتی ہیں اور اتنی موٹی بات نہیں سمجھتیں کہ تلوار سے کام لینے سے پہلے تلوار کا مہیا کرنا بھی ایک کام ہے - مگر چونکہ وہ ایک طرف تو اسلام کی حقانیت کی منکر ہیں اور دوسری طرف تلوار کی طاقت کے سوا اور کسی قوت فرماں روا کو مانتیں نہیں - اسلئے وہ اسلامی ہمدردی اور اخوت کی حیرت انگیز طاقت کا کچھ اندازہ نہیں کر سکتیں اور

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا (ع پ)	اور تم سب اللہ کی رسی تھامے رہو اور پراگندہ مت ہو -

کے عالمگیر اثر کے صحیح تصور سے قاصر ہیں - اور یوں اسلام کی کامیابی کو غیر واقعی اسباب کی طرف منسوب کرتی ہیں - تمدن پر اسلام کا یہ بہت بڑا احسان

اخوتِ اسلامی

حقیقت شناس دلوں کے نزدیک تو دنیا اپنی تمامتر روحانی اور اخلاقی ترقی کے لیئے اسلام کی ممنونِ احسان ہے ہی۔ مگر چشم ظاہر بیں کے لیے سب سے زیادہ عجیب وہ اصلاح اور انقلاب ہے جو اسلام نے چند ہی دن میں اصولِ تمدن میں پیدا کر دیا۔ اسلام سے پہلے عرب کی جو کچھ حالت تھی وہ محتاج بیان نہیں۔ ان لوگوں کے آپس کے لڑائی جھگڑوں سے تلواریں کبھی میان میں نہیں جاتی تھیں اور قبیلوں کی باہمی خانہ جنگیوں اور خونریزیوں سے صحرا کی ریت اکثر سرخ رہا کرتی تھی۔

کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا
کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا
لب جو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا
کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا

یونہی روز ہوتی تھی تکرار ان میں
یونہی چلتی رہتی تھی تلوار ان میں

نہ ہٹتے تھے ہرگز جو اڑ بیٹھتے تھے
سلجھتے نہ تھے جب جھگڑ بیٹھتے تھے
جو دو شخص آپس میں لڑ بیٹھتے تھے
تو صدہا قبیلے بگڑ بیٹھتے تھے

مگر اسلام نے آتے ہی مرقع الٹ دیا اور نقشہ بدل دیا۔ وہی لوگ جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہتے تھے آپس میں بھائی بھائی

بتمام اقوام عالم کے مصلحوں کی تعظیم اور ادب کی تعلیم دی اور سب سے یہ کہلوا دیا کہ

لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (ع ۲ پ ۳) | ہم اللہ کے سب پیغمبروں کو مانتے ہیں اور انمیں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے

یہاں تک کہ اس کے پیغمبر صلعم نے اپنے آپ کو اور پیغمبروں سے بہتر کہلوانا تک پسند نہ کیا۔ اور انہوں نے خود اپنے ایک صحابی کو اس بات پر جھڑکا کہ اس نے ایک یہودی کو اس بات پر بگڑ کر طمانچہ مار دیا تھا۔ کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آنحضرت سے افضل کہتا تھا اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس کے خدا نے اپنے منکرین اور مشرکین تک کو بھی برا کہنے کی اجازت نہیں دی اور یہ حکم دیا کہ۔

لَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ۔ | تم ان لوگوں کو بھی گالی مت دو اور برا مت کہو جو اللہ کے سوا کسی اور کو پوجتے ہیں کیونکہ وہ جہل کر نادانی سے اللہ کو برا کہینگے۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں نے کبھی ان غیر مسلموں کی بزرگان ملت کو بھی برا نہیں کہا جو ہمیشہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بے ادبیاں اور بدزبانیاں کرتے رہے ہیں۔ کیا مسلمانوں کو اپنے رسول روحی فداہ سے محبت نہیں ہے؟ کیا ان کے دل پر وہ گالیاں شاق نہیں گزرتیں جو ان کے مخالف انکے رسول کو دیتے ہیں۔ مگر اسی رسول مقبول صلعم کا فیض تعلیم ہے کہ مسلمان اور خواہ کچھ کریں مگر یہ نہیں کرتے کہ جواب میں ان مخالفوں کے بزرگوں کو گالیاں دینے لگیں۔ یہ بات شیوۂ انصاف سے دور ہے۔ اور یہ انصاف ان کو اسلام نے سکھایا ہے۔

اسلام کی تاریخ کا یہ واقعہ کتنا دردناک اور کس قدر نتیجہ خیز ہے کہ اندلس میں جب مسلمان برسر عروج تھے تو وہ اپنے مسیحی رعایا کے امور مذہبی میں اتنا کم دخل دیتے تھے کہ اس زمانے کے جاہل اور نادان

ہے کہ اس نے نہ صرف سرزمین عرب میں بلکہ تمام عالم اسلام میں یگانگت اور یکجہتی کی روح پھونکدی اور ساری دنیا کو اپنے دائرۂ اثر میں لاکر مشرق و مغرب کا تفرقہ مٹا دیا۔ اور شمال اور جنوب کا امتیاز اُٹھا دیا۔ اسی منشاء کی تکمیل کیلئے کعبہ کا حرم محترم نماز کا قبلہ اور حج کا مرکز بنکر بیت اللہ کے لقب سے ممتاز و مفتخر ہوا۔ ورنہ اسلام کا خدا جا و جہت کی قید سے آزاد اور مکان و زمان کی بندش سے ارفع ہے۔

اسلام کے اس یک رنگ کن اثر کی وقعت اسوقت سمجھ میں آتی ہے جب ہم اس کے مقابلہ میں خود اپنے ہی ملک میں دیکھتے ہیں کہ مسیحیت اپنے نئے پیروؤں کو اور خواہ کتنے ہی مفید اور کارآمد حقوق کیوں نہ دیدے مگر پھر بھی کالے اور گورے کا امتیاز نہیں اُٹھا سکتی۔ اور جو گرجے اہل یورپ کے ہیں ان میں ویسی عیسائیوں کا گزر نہیں ہونے پاتا۔ اور خواہ جناب مسیح کی قربانی نے اِن دونوں کو جنت کا کتنا ہی مساوی استحقاق کیوں نہ دیا ہو۔ پھر بھی یہاں ان کے معبد مشترک نہیں ہو سکتے۔

اسلام کی یہ عالمگیر ہمدردی عالم اسلام سے گزر کر تمام دنیا پر محیط ہوگئی۔ کیونکہ اول تو اسلام نے دنیا کے سامنے وہ سادہ اور سہل مذہب پیش کیا جسکی کوئی بات نامعقول اور خلاف فطرت نہیں ہے۔ اس نے فقط ایک خدائے واحد کی پرستش سکھائی اور اس کی صفات اسکے بنائے ہوئے آثار قدرت کے مشاہدے اور مطالعہ سے دکھائیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے پیروؤں کو سارے ادیان سابقہ کے بزرگوں اور

مسلمانوں کی قومی حریّت اور مذہبی حمیت آج کل کی طرح سرد نہیں پڑی تھی۔ اور ان کی بے پناہ ہمت اور شجاعت نے دنیا کو ان کے قدموں پر ڈال دیا تھا۔ اس وقت اگر ان کو اسلام کی تعلیم نہ روکے ہوتی تو مسیحیان اندلس کا نام صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح کب کا مٹ چکا ہوتا۔ وہ مذہبی دیوانے جن کو اس دیوانگی پر ناز تھا اگر اپنے مذہب کی سکھائی ہوئی اخوت اور ہمدردی کی زنجیر سے جکڑے ہوئے نہ ہوتے تو آج یورپ نہیں بلکہ دنیا کا نقشہ کچھ اور وضع کا ہوتا۔ مگر نہیں۔ اسلام نے کبھی زیردستوں پر زیادتی کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اس نے کسی عذر پر بھی عہد شکنی کو جائز نہیں رکھا۔ اور کبھی بھی اپنی حمایت میں تلوار کو خون آلود نہیں ہونے دیا۔ آہ اسی رحمدلی اور نرم مزاجی کا نتیجہ تھا کہ جب آٹھ سو برس بعد ان کے بچے کھچے نام لیوا اپنے لٹائے اپنے پشتہا پشت کے گھروں سے نکالے گئے تو ہسپانی بادشاہوں کے نہایت پختہ وعدوں کے باوجود بھی ان کے لئے مسیحیوں کے خونخوار تلوار اور محکمۂ احتساب کی مقدس آگ سے کہیں مفر نہ تھا کیونکہ ان بادشاہوں کو ایفائے وعدہ کی تعلیم نہیں دی گئی تھی۔ اگر کوئی منصف مزاج شخص ان دونوں حالتوں کا غور سے موازنہ کرے تو وہ اس سے بہت کچھ نتیجے نکال سکتا ہے مگر یہاں اسلام کی رحم و انصاف کی تعلیم سے بھی زیادہ تعجب اس کے اس عجیب و غریب روحانی اثر پر ہوتا ہے جو ہمیشہ ہر ملک اور ہر دور میں اس کے مقلدوں کے دلپر رہا ہے

عیسائی مرنے تک کو ترستے تھے یہاں تک کہ آخر ان کے پیر طریقت سینٹ یولوجیس نے شرف شہادت حاصل کرنے کا یہ طریقہ سوچا کہ اس کے شاگرد قاضی کے سامنے علی رؤس الاشہاد اس رسول حجازی صلعم کو بلا وجہ گالیاں دیا کریں جن کی ذات بابرکات سے اسے یا اس کی قوم کو یا دنیا کے کسی فرد بشر کو بھی کچھ تکلیف نہیں پہونچی تھی سب سے پہلے قرطبہ کے ایک پادری پرفکٹس نے اس کی ابتدا کی اس دشنام دہی پر قاضی کو غصہ تو بے شک آیا ہوگا ہے - مگر وہ اسی کی تعلیم سے مجبور تھا جس کی شان میں دریدہ دہنی کیجا رہی تھی - اس نے انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دیا - جسقدر دیر تک پھرا سکا رہا - اس دیوانہ کو بہت کچھ سمجھایا بجھایا - مگر وہ دنیا کی بے ثباتی سے تنگ آچکا تھا اور اس کے سوا مرنے کی اور کوئی صورت نہ تھی - قاضی کی نرمی اور صلح جوئی سے اسکی آتش زبانی اور بڑھ گئی - یہاں تک کہ آخر مجبور ہوکر قاضی نے قانون وقت کے مطابق اسے اس ہرزہ سرائی کی تکالیف سے نجات دیدی لیکن سب و شتم کا یہ شرمناک سلسلہ بے نیابت کرتے ہوئے اب عیسائی عورتوں کو بھی شہ ملی جب یونہی جاری رہا - مگر سلطنت نے خلاف دستور کوئی معینہ سزا سوا اسیر اور کچھ بھی تجویز نہ کیا یہاں تک کہ اس فتنے کے بانی مبانی یولوجیس تک سے کچھ تعرض نہ کیا گیا - جب تک کہ اس نے خود آٹھ برس بعد اسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا - حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب

ساتھ مرعی رکھا ہے۔ تاکید ہے کہ دشمنوں پر بھی کسی طرح ظلم و زیادتی مت کرو عہد و پیمان پر قایم رہو ضعیفوں اور کمزوروں کو مت ستاؤ۔ علماء و ائمہ مذہب سے تعرض نہ کرو۔ یہ تمام آداب دُنیا نے اسلام ہی سے سیکھے ہیں۔ اور اگر اسلام کی عالمگیر اخوت سے انکار کردیا جائے تو دشمنوں کے ساتھ اتنی رعایتیں کرنا بے معنی ہو جاتا ہے۔ مگر نہیں۔ اسلام نے شروع سے اس اصول کو ملحوظ رکھا ہے کہ تمام بنی آدم بھائی بھائی ہیں اور اگر کبھی کسی وجہ سے ان میں لڑائی ہو بھی جائے تو اس میں اپنی محافظت اور دشمن کی مدافعت سے زیادہ تجاوز کرنا کسی طرح روا نہیں ہے۔

بلاشبہ ذمیوں سے جزیہ لینے کا حکم ہے اور اس پر بہت کچھ لے دے کی گئی ہے۔ اور اسے مذہبی تعصب اور قومی تفریق پر محمول کیا جاتا ہے۔ مگر کسی مدعی خرد نے اتنا نہیں سمجھا کہ جزیہ صرف وہ لگان ہے جو فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہونے کے عوض میں غیر مسلموں سے لیا جاتا تھا اور جس کے معاوضے میں سلطنت ملک کے اندرونی امن و انتظام کی ضامن اور رعایا کو بیرونی دشمنوں کے جور و تشدد سے بچانے کی کفیل ہوتی تھی۔ اور اس کے وصول ہو جانے کے بعد پھر ان سے اور کوئی مطالبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگر کسی کو جزیے ہی کے نام سے چڑ ہو تو بات جدا ہے ورنہ لگان کو چھوڑ کر بھی جتنی مختلف صورتیں سلطنتوں نے اب حصول محاصل کی جاری کر رکھی ہیں۔ جزیے کی رقم ان کی عشر عشیر بھی نہ تھی۔ چنانچہ سٹینلی والپول جو اپنی کتاب کے آغاز ہی میں بے آپ کو مسلمانوں کے

مخالف کہتے ہیں کہ اسلام بزور شمشیر پھیلایا گیا۔ مگر اس قول کی بنا پر تو چاہیے تھا کہ اس زور کے ہٹتے ہی اس کے پیرو پھر اس سے برگشتہ ہو جائے جاتے لیکن اس کے برعکس وہ بزور شمشیر بھی اسے نہیں چھوڑتے۔ نہیں۔ موت کا ڈر تو کیا۔ محکمہ مقدس کے نہایت ہی ہولناک اور تکلیف دہ عذاب بھی (جو موت سے ہزار درجے بدتر اور سخت ہیں) ان کو مذہب اسلام سے منحرف نہیں کر سکتے۔[۱]

غرض اس طرح اسلام نے ہر قوم اور ہر دور کے بزرگوں کی (خواہ ان کا ذکر کلام پاک میں ہو یا نہ ہو) عزت و حرمت کی تاکید فرما کر ان کو مسلمانوں کے نزدیک بھی مکرم و محترم بنا دیا اور یوں گویا دنیا بھر کے آدمی اہل اسلام کے دینی بھائی بن گئے۔ اور اسلام کی ہمدردی اور اخوت کا دائرہ اقصائے عالم پر حاوی اور محیط ہو گیا۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ ہمارے لئے برادران یوسف ثابت ہوئے۔ گو ہم نے پھر بھی اپنی قوت و قدرت کے زمانے میں ہمیشہ ان سے

لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ — آج تم پر کچھ الزام نہیں ہے۔

ہی کہا۔ اور اب تو مدتوں سے وہ صلح جو اور صاف گو زبان ہی بند ہے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کا حلم اسلام کی وجہ سے نہیں کہا جاتا۔ بلکہ خوشامد اور کمزوری پر محمول کیا جاتا ہے۔

اسی ہمدردی کا عملی ثبوت وہ حسن سلوک ہے جو اسلام نے دشمنوں سے

۱۔ ماخوذ از مورزان سپین۔ مصنفہ سٹینلی واپیول۔

سلطنتیں بھی ضروریات فوج کے مقابلے میں کسی پرائیویٹ استحقاق کی ذرہ بھر پروانہ کرتیں۔ دوسری طرف مفتی کی اخلاقی جرأت اور جنرل کی اسلامی حریت کو دیکھئے کہ ایک نے حکم دینے اور دوسرے نے اسکی اطاعت کرنے میں کیسے استقلال اور استقامت کا ثبوت دیا۔ کہ فوراً عیسائیوں اور یہودیوں کی تمام چیزیں واپس کردی گئیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے بعض وقت بیس بیس گنا قیمت لیکر بھی کھانے پینے کی چیزیں نہیں دیں۔ اور شہر میں بیچارے مسلمان سپاہیوں کے سوا اور کسی کو بھی فاقے کی تکلیف اور محاصرے کی شدت کی خبر تک نہ ہوئی۔ مگر مسلمانوں نے تین تین دن کے فاقوں پر بھی اپنی ذمی رعایا کی کسی چیز کو ہاتھ تک نہ لگایا اور جب یلغاریہ کی فاتح فوج کو ایڈریانوپل کے مال غنیمت میں ہزاروں ڈھیر بکریاں بھی ملیں تو دنیا کو حیرت ہوگئی۔ کہ اتنے سامان کے ہوتے ہوئے ترکوں کو قلت رسد کی شکایت کیوں تھی۔ اسکی حیرت بجا تھی۔ کیونکہ وہ اسلام کی اخوت اور انصاف اور مسلمانوں کی حریت اور مساوات کا تصور بھی نہ کرسکتی تھی۔ جو لوگ جزیے کی شکایت کرتے ہیں۔ وہ دنیا کی تاریخ اٹھاکر دیکھیں اور کسی قوم یا کسی مذہب کے واقعات میں سے اس قسم کی کوئی ایک بھی مثال دکھائیں اور بتائیں کہ کیا اب صدہا قسم کے محاصل ادا کرنے کے بعد بھی کسی ملک کی رعایا اپنی سلطنت (اور سلطنت بھی غیر قوم اور غیر مذہب کی سلطنت) سے ایسی رعایت اور حق نوازی کی توقع کرسکتی ہے۔ یہ اسلام ہی کی شان ہے۔ اور اسلام کے سوا اور کہیں اسکی کوئی نظیر

ساتھ ہمدردی کے الزام سے بچاتا ہے - اندلس کی بابت لکھتا ہے کہ "وہاں اہل شہر کو تمام مصارف سلطنت کا بار برداشت کرنے کی بجائے صرف جزیہ دینا پڑتا تھا - جو کچھ زیادہ نہ تھا - اور اس کے بعد وہ تمام ذمہ داریوں سے بری ہو جاتے تھے - البتہ اگر ان کے پاس زمین بھی ہوتی تھی تو ان کو خراج یعنی زمین کا لگان بھی دینا پڑتا تھا - جو بلا قید مذہب سب کے لئے یکساں تھا - جزیہ کی مقدار حیثیت پر موقوف تھی اور ۱۲ سے ۴۸ درہم سالانہ تک ہوتی تھی چونکہ یہ قسم ماہواری قسطوں میں وصول کی جاتی تھی اس لئے اس کی ادائیگی میں اور بھی آسانی تھی"[۵] جو لوگ جزیہ کو خلاف انصاف کہتے ہیں ان کو اس کا مقابلہ آج کل کے مختلف مدات محاصل سے کرنا چاہیئے - اور فقط یہی نہیں - بلکہ ان حقوق کا بھی لحاظ کرنا چاہیئے جو جزیئے کی خفیف سی رقم ادا کرنے سے ذمیوں کو حاصل ہو جاتے تھے اس کے لئے ہمیں کچھ دور جانے کی ضرورت نہیں - ابھی کل کی بات ہے اور غالباً دنیا اسے اتنی جلدی نہ بھولی ہوگی - کہ جب شکری پاشا ایڈریانوپل میں محصور ہو گئے - اور باہر سے سامان رسد کا پہنچنا ناممکن ہو گیا - تو حسب دستور جنگ انہوں نے شہر کی تمام اجناس خوردنی کو اپنی نگرانی میں لینے کا ارادہ کیا - مگر اس خبر کے معلوم ہوتے ہی مفتی شہر نے اس حکم کے برخلاف فتویٰ دیا - اور کہا کہ "ذمیوں کی کسی چیز پر دست اندازی کسی عذر پر بھی جائز نہیں ہو سکتی" ایک طرف تو اس نازک موقعہ کا خیال کیجئے جبکہ یورپ کی منصف سے منصف اور مہذب سے مہذب

---

۵ ماخوذ از مورز ان سپین صفحہ ۱۴۲

اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْہِ مَیْتًا فَکَرِھْتُمُوْہُ	بھائی کا گوشت کھانا پسند کرو گے۔ یہ تو تم کو ناگوار ہے۔ (تو پیٹھ پیچھے اسکی برائی کرنی کیوں گوارہ ہو۔
(الحجرات ع ۲ پ ۲۶)	

مشکوٰۃ شریف کی ایک روایت ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے دو شخصوں کو کسی کی غیبت کرتے ہوئے سُنا۔ تو ان کو دوبارہ وضو کر کے نماز کے اعادے کا حکم دیا۔ اور چونکہ وہ دونوں اس دن روزے سے تھے اس لئے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اس روزے کے عوض پھر کسی دن روزہ رکھیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ غیبت سے روزے نماز اور وضو تک میں خلل آجاتا ہے۔ اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ عام عبادات ظاہر سے زیادہ باطن سے اور جسم سے بڑھ کر دل سے تعلق رکھتی ہیں۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو ظاہر ہے کہ غیبت کوئی ایسی مادی ناپاکی تو ہے ہی نہیں جس سے روزہ ٹوٹ جائے یا نماز باطل ہو جائے۔ یا وضو جاتا رہے۔ جس طرح غیبت اور بدگمانی کی ممانعت کی گئی ہے۔ ویسی ہی اور بھی ہر ایک ایسی بات سے روکا گیا ہے۔ جس سے کسی دوسرے کو کسی قسم کی بیجا تکلیف ہو۔ لیکن یہ عام اخلاقی خوبیاں ایسی ہیں کہ ان کے زیادہ تفصیلی بیان کی حاجت نہیں۔ اس سے تو قطعاً کسی کو انکار ہو ہی نہیں سکتا کہ حسن اخلاق میں کوئی چھوٹی سی چھوٹی بات بھی ایسی نہیں ہے۔ جسے اسلام نے نظر انداز کر دیا ہو۔ لیکن میرے نزدیک اسلام کے دائرہ اخوت کی وسعت اور جہانگیری کا اندازہ اس ایک بات سے ہو سکتا ہے۔ کہ جس طرح خدا نے

نہیں مل سکتی۔

لوگوں میں مصالحت اور محبت کے متعلق کلام پاک کا یہ ارشاد ہے کہ

لَاخَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوٰهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ اَجْرًا عَظِيمًا (النساء ع پ)	اور منافقوں کے اکثر مشوروں میں کچھ بھلائی نہیں ہوتی۔ مگر ہاں جو خیرات یا احسان یا اصلاح بین الناس کا حکم دے۔ اور جو کوئی اللہ کی خوشنودی کے لئے ایسا کرے تو ہم ضرور اسکو صلہ عظیم دیں گے۔

یہ اصلاح بین الناس کا حکم بلا قید مذہب و ملت ہے۔ اور اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام نے اسکو کتنی اہمیت دی ہے۔ خود مسلمانوں کی بابت تو صریح ارشاد ہے ہی کہ

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ (حجرات ع پ)	ایمان والے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ تو تم اپنے دو بھائیوں میں صلح کرا دو۔

اس اخوت اسلامی کی بنا پر بدگمانی، عیب جوئی۔ اور غیبت کی ممانعت فرماتے ہوئے اسے مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے تشبیہ دی ہے۔ چنانچہ ارشاد فیض بنیاد ہے کہ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ	اے ایمان والو زیادہ شک کرنے سے بچو کیونکہ بعض بدگمانی گناہ ہے۔ اور ایک دوسرے کے حالات کی کرید مت کرو۔ اور نہ تم میں سے کوئی ایک دوسرے کی غیبت کرے۔ کیا تم اپنے مردہ

رعایت حقوق

صفائی معاملت اور حسن معاشرت کا سنگ بنیاد انصاف اور رعایت حقوق ہے۔ اور ہم بالاجمال دیکھ ہی چکے کہ اسلام نے انصاف پر کتنا زور دیا ہے اس لئے لازمی نتیجہ ہے کہ تعلیم اسلام میں معاملت کے کھرے پن اور معاشرت کی پاکیزگی کی بے انتہا تاکید ہو۔ اور یہ ہی وجہ ہے کہ اسلام میں رعایت حقوق العباد کا درجہ اور تمام نیکیوں سے بڑھا ہوا ہے۔ (اگرچہ سچ یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ ساقط الاعتبار اور بدمعاملہ قوم ہم ہی ہیں۔ مگر اس سے تعلیم اسلام پر حرف نہیں آتا۔ کیونکہ اس کا سبب بقول شبلی مرحوم ۔ ع

"ترکِ پابندئی اسلام ہے۔ اسلام نہیں"

نہیں۔ بلکہ حقوق العباد کی بجا آوری ہی ایک اصلی اور سچی نیکی ہے۔ اور اسی سے حقوق اللہ پورے ہو جاتے ہیں۔ فی الواقع غور کیجئے تو اللہ کے حقوق ہمیہ ہین ہی کیا۔ یہ کہ ہم اس کی نعمتوں کا شکر اور اس کے احکام کی پیروی کریں۔ لیکن وہ ہمارے شکر سے بے نیاز اور ہماری فرمانبرداری سے مستغنی ہے۔ بلکہ سرے سے ہم اس کی ناشکر گذاری یا نافرمانی کر ہی یوں کر سکتے ہیں۔ اور اگر کسی طرح کریں بھی تو اس سے اسکو نقصان ہی کیا

اسلام نے اپنے آپ کو رب العالمین کہا ہے۔ رب المومنین یا رب المسلمین نہیں کہا۔ اسی طرح پیغمبر اسلام علیہ الصلواۃ والسلام کو بھی رحمتہ للعالمین کہا گیا۔ رحمتہ للمومنین یا رحمتہ للمسلمین نہیں کہا۔ غور کیا جائے تو یہی ایک ایسا تعلق ہے جو ہمکو ساری دنیا سے متحد کرنے کیلئے کافی ہے۔ کیونکہ اس سے گویا ہم کو یہ بتایا گیا ہے کہ جیسے ہم سب کا پروردگار ایک ہے ویسے ہی وہ فخر امم سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم۔ جن کا سایۂ شفقت وعنایت ہمارے سروں پر ہے بھی ساری دنیا کے لئے سرچشمہ ہدایت ورحمت ہیں اور وہ صرف ہمارے لئے نہیں بلکہ تمام اقوام عالم کی رہبری کے واسطے مبعوث ہوئے تھے۔ اس لئے ہم سب تو آپس میں بھائی بھائی ہیں ہی۔ لیکن جو لوگ ہمارے مخالف اور دشمن ہیں ہم کو ان سے بھی عداوت کے بجائے رحم اور نفرت سے زیادہ ہمدردی کرنی چاہیئے۔ کیونکہ وہ اپنی نادانی کی وجہ سے اس نعمت عظمیٰ سے بے نصیب رہ گئے ہیں جس سے اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل وکرم سے ہمکو مالامال کیا ہے۔

يَالَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ بِمَا غَفَرَلِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ	اے کاش میری قوم (یعنی تمام نوع انسان) کو یہ معلوم ہوتا کہ میرے اللہ نے مجھے کس طرح بخش دیا۔ اور مجھے عزت والوں میں شامل کیا۔

زیردستوں پر مہربانی۔ دوستوں کے ساتھ اخلاص۔ دشمنوں کے ساتھ انصاف یہ سب کچھ لوازم اسلام ہیں۔ اور مسلمانوں کو اون کا ہروقت خیال رکھنے کی سخت تاکید کی گئی ہے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ۔

اور تم اللہ کی عبادت کرو اور اوس کا کوئی شریک مت ٹھیراؤ اور ماں باپ کے ساتھ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور قرابت والے ہمسایوں اور غیر ہمسایوں اور پاس کے بیٹھنے والوں اور راہگیروں اور جو (لونڈی غلام) تمہارے قبضے میں ہوں ان سب کے ساتھ عمدہ برتاؤ کرو۔

یوں تو سارے ہی بڑے بڑے مذہبوں میں یہ باتیں داخل حسنات ہیں مگر یہاں خاص طور پر قابل لحاظ یہ بات ہے کہ ان سارے تعلقات میں حسن سلوک مرعی رکھنے کی ہدایت اللہ کی عبادت کے پہلو بہ پہلو کی گئی ہے اور اس آیت کے سوا کلام مجید میں اور مقامات پر بھی اس مضمون کے بیان میں یہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ یعنی عقیدۂ توحید کے ساتھ ہی والدین وغیرہ کے ساتھ احسان کی تاکید کا ارشاد ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسلام میں ان اخلاقی خوبیوں کو کتنی وقعت اور اہمیت دی گئی ہے۔ اور ان کو محض حسن اخلاق کے درجے سے بڑھا کر کیونکر مذہبی احکام کا تقدس دیدیا گیا ہے۔

اسلام نے اپنی تعلیم میں انسانی طبیعت کے اس راز کو ملحوظ رکھا

پہنچ سکتا ہے۔ بقول صائب ؎

کشش ز دوری ہم از حکم قضا و مکشی در ہم	چہ پروا آتش از چین جبین بوریا دارد

وہ ازلی اور ابدی طاقت جس کے ادنیٰ اشارے سے لاکھوں کروروں آفتاب قضائے محیط میں سرگرداں ہیں۔ اس کرۂ خاک کے ذرۂ بمقدار پر رینگتے ہوئے لاشئے محض انسان کی اطاعت اور معصیت سے کیا متاثر ہو سکتی ہے؟ اگرچہ وہ اپنے آپ کو بزعم خود اشرف المخلوقات اور خلیفۃ اللہ سمجھے ہوئے ہے۔ اس لئے حقیقت میں اس کے حقوق یہی ہیں کہ ہم اوس کے بندوں کی حق تلفی نہ کریں اور اپنے ابنائے جنس سے لطف و مراعات سے پیش آئیں

مَنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہَ	جو شخص آدمیوں کا شکرگزار نہیں ہوتا وہ اللہ کا بھی شکر نہیں بجا لاتا۔

کا مطلب بھی یہ ہے اور اس کے بعد دوسرے درجے پر یہ کہ ہم ان چند باتوں پر عمل کریں۔ جو خود ہمارے تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کے لئے ہم کو بتائی گئی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اِن دونوں صورتوں میں فائدہ سرتاسر ہمارا ہی ہے۔ اسلام نے تمام معاشرتی اور تمدنی تعلقات کے حقوق قایم کئے ہیں اور جہاں تک ہمارا خیال ہے مقابلۃً وہ دیگر مذاہب کے مقرر کردہ حقوق کی نسبت زیادہ معقول اور منصفانہ ہیں۔ والدین کی اطاعت۔ اوستادوں کی عزت۔ بزرگوں کا ادب۔ رشتہ داروں کی محبت چھوٹوں پر شفقت۔ ہمسایوں کی رعایت۔ بیماروں کی تیمارداری۔ مسافروں کی مہماں نوازی محتاجوں کی حاجت روائی۔ یتیموں کی خبرگیری۔ حاکموں کی فرماں برداری

ولادت اور پرورش وغیرہ میں ماں کو پیش آتی ہیں۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا۔	اور ہمنے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کی تاکید کی اور اسکی ماں نے اسے پیٹ میں رکھا مشکل سے اور جنا مشکل سے اور اوس کا زمانہ حمل و مدت شیرخوارگی ڈھائی برس میں جاکر پوری ہوئی۔

اسی طرح یتیموں اور محتاجوں کے ساتھ نرمی اور شفقت کا برتاؤ کرنے کا جہاں ارشاد فرمایا ہے۔ وہیں اسکی مزید تاکید کے لئے یہ بھی یاد دلادیا ہے کہ یہ دن ہر ایک کے لئے پیش آجانا ممکن ہے کہ وہ مرجائے اور اوس کے چھوٹے چھوٹے بچے یتیم رہجائیں اور ان کو خود دوسروں کے سامنے دست سوال پھیلانا پڑے۔ پس اس حالت کا خیال کرکے آج ان بیکسوں کے ساتھ لطف و نوازش سے پیش آؤ۔ جن کو حادثات زمانہ نے تمہارا دست نگر بنادیا ہے۔

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ	اور جب بوقت تقسیم ترکہ رشتہ دار اور یتیم اور محتاج حاضر ہوں تو ان کو بھی اس میں سے دو اور اون سے اچھی نرمی کی بات کہو۔ اور ان لوگوں کو ڈرنا چاہیئے کہ اگر وہ اپنے پیچھے ناتواں اولاد چھوڑ جائیں تو ان کے حال پر ان کو کتنا ترس آتا۔ اس لئے چاہیئے کہ

ہے کہ آدمی کسی ایسی کیفیت کا صحیح تصور نہیں کر سکتا جو اس پر کبھی نہ گذری ہو نہ کسی ایسی حالت سے ہمدردی کر سکتا ہے جس کا خود اس پر واقع ہونے کا احتمال نہ ہو۔ اسلئے ارشادات قرآنی میں اکثر جگہہ احکام کے ساتھ ہی ساتھ ان کی وجہ بھی بیان کر دی ہے یا کسی ایسی حالت کی یاد دلا دی ہے جس سے اس حکم کی معقولیت اور زیادہ دلنشیں ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اطاعت والدین کو ہی لیجئے۔ بچپن میں تو سب ہی اپنے ماں باپ کا کہنا مانتے ہیں اور جو سعادت مند ہوتے ہیں۔ وہ بڑے ہوئے پر بھی ہمیشہ اون کا لحاظ اور ادب کرتے ہیں مگر اکثر آدمی جوان ہونے کے بعد اپنے بچپن کے زمانے اور اپنی شیر خواری کی حالت کو بھول جاتے ہیں۔ اور جب تک وہ باتیں یاد نہ آئیں تب تک ماں باپ کی شفقت اور محبت کا پورا احساس نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے اللہ تعالےٰ نے جہاں ماں باپ کے ساتھ نرمی اور رعایت کا ارشاد فرمایا وہیں ایام طفولیت کی بھی یاد دلا دی اور ان کے لئے ایسے پیارے الفاظ میں دعائے خیر کی تعلیم دی کہ

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيرًا۔	اور محبت اور خاکساری کا پہلو ان کے آگے جھکائے رکھ اور اُن کے حق میں دعائے خیر کر کہ اے پروردگار تو ان دونو پر رحم کر جیسے اُنہوں نے مجھے بچپن میں محبت سے پالا۔

یا ایک اور جگہہ والدین کی شکر گزاری اور احسان مندی کی تاکید فرماتے ہوئے ان وقتوں اور تکلیفوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جو بچوں کی

اس مال کو بلا اجازت صرف کر سکتی ہے۔ لیکن پھر بھی اس سے جو اولاد کی حق تلفی کا احتمال ہے وہ زائل نہیں ہوتا۔ اور خاص کر ایسی صورتوں میں اس کا بڑا اندیشہ ہے جبکہ یہ بیوہ بچوں کی سوتیلی ماں ہو۔ لیکن اگر ایسا نہ بھی ہو۔ تب بھی ہمارے نکتۂ خیال سے تو یہ بات کچھ بہت زیادہ قرین انصاف نہیں معلوم ہوتی کہ باپ کے یکایک مرجانے سے اس کے چھوٹے چھوٹے بچے کافی دولت ہونے کے باوجود بھی بالکل فقیر ہو جائیں اور ان کو اپنے نہایت ہی ضروری اور معمولی مصارف کے لئے دوسرے کا محتاج ہونا پڑے۔ خواہ وہ ان کی سگی ماں ہی کیوں نہو۔ اور اگر بہ تقاضائے الفت مادری وہ عورت ان بچوں کی پرورش کرے بھی تب بھی وہ قانون بے انصافی کے الزام سے نہیں بچ سکتا۔ جسنے اولاد کو ان کے باپ کے ترکے سے اس طرح محروم کر دیا۔ گویا ان کا آپس میں کچھ تعلق ہی نہ تھا۔

کہا جا سکتا ہے کہ اس قانون نے بیوہ کو دوسری شادی کی ممانعت کر کے بالواسطہ بچوں کے حقوق کا تحفظ کر دیا ہے۔ لیکن یہ ہمارے نزدیک ایک دوسرا ظلم اس عورت پر ہے۔ ممکن ہے کہ وہ بالکل نوعمر ہو۔ یا اسے اپنے پہلے شوہر سے زیادہ وابستگی نہ ہو یا کسی اور وجہ سے وہ اس قید گراں کی متحمل نہ ہو سکتی ہو۔ لیکن خیر یہاں ہم کو صرف یہ کہنا ہے کہ اس طرح ایک ظلم کی تلافی دوسرے ظلم سے ہرگز نہیں ہو سکتی۔ بیوہ نہو تو پھر اولاد ذکور بالسویہ وارث ہوتی ہے۔ مگر لڑکیاں ہر حال میں ترکۂ پدری سے محروم رہتی ہیں خواہ وارث ان کی ماں ہو یا بھائی۔ اور یوں وہ دوسروں کے رحم و

وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا (النساء ع ۱/۴)	(غربا کے ساتھ سختی کرنے میں اللہ سے ڈریں۔ اور ان سے نرمی سے بات کریں۔

حقوق اقارب کے ضمن میں اسلام کا قانون میراث دنیا بھر کے قانونوں سے ممتاز ہے۔ اکثر مذہبوں نے تمام ترکہ کا حقدار صرف فرزند اکبر کو ٹھیرایا ہے اور اس کے سوا اور تمام اولاد کو بھی محروم الارث قرار دیا ہے۔ دیگر رشتہ داروں کا تو ذکر ہی نہیں۔ اور خاص کر عورتوں کو تو میراث میں سے کچھ بھی حصہ نہیں دیا۔ چنانچہ عرب جاہلیت میں بھی یہی دستور تھا کہ عورتوں اور کم عمر لڑکوں کو ترکے میں سے کچھ نہیں دیا جاتا تھا۔ اور عذر یہ تھا کہ چونکہ وہ لڑائی اور لوٹ مار میں شریک نہیں ہوتے اس لئے ان کو میراث پانے کا بھی حق نہیں ہے۔ یوروپین قانون میں ترکے کی تقسیم کا زیادہ تر دار ومدار وصیت پر رکھا گیا ہے لیکن اگر کوئی وصیت نہ ہو تو پھر تمام جائداد کا وارث سب سے بڑا بیٹا ہوتا ہے۔ اور اگر بیٹا نہ ہو تو عموماً ترکہ بیوی اور لڑکیوں کی موجودگی میں بھی بنی اعمام کو پہنچتا ہے۔ لیکن بہرحال وارث خواہ کوئی ہو مگر وہ بلا شرکت غیرے وارث ہوتا ہے۔ یہ ہی حال ہندوں میں بھی ہے۔ مگر ان میں بیوی کا بڑا لحاظ رکھا گیا ہے اور اسی کو شوہر کے سارے ترکے کا وارث قرار دیا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے ہوتے ہوئے بعض وقت اولاد بھی محروم رہجاتی ہے۔ گو اس رعایت کے مقابلے میں یہ قید بھی ہے کہ بیوی کو دوسری شادی کرنے کی اجازت نہیں ہے اور نہ وہ

سے چند دن پیچھے پیدا ہوئے۔ کیوں ایسے محروم رہجائیں۔ گویا وہ اپنے ماں باپ کی اولاد ہی نہیں ہیں۔ یہی نہیں۔ بلکہ بعض وقت ایسی دردناک صورتیں بھی پیش آجاتی ہیں کہ اولاد ذکور نہ ہونے کی صورت میں تمام جائداد کسی دور کے رشتہ دار کو پہنچ جاتی ہے اور متوفی کی بیوی اور لڑکیاں جو کل تک تمام چیزوں کی مالک و مختار تھیں نان شبینہ تک کو محتاج ہوجاتی ہیں۔ اور خیر اگر یہ بھی ہو تو کیا یہی کچھ کم بے انصافی ہے کہ بہن بھائی کو بھی اپنے بھائی کے سامنے نہیں بلکہ ماں تک کو اپنے بیٹے کے آگے ہاتھ پھیلاتا اور اُس کا ممنون احسان ہونا پڑے۔ اس قاعدے کی حمایت میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس طرح جائداد محفوظ اور قایم رہتی ہے اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہوکر برباد اور منتشر نہیں ہونے پاتی۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ کوئی معقول عذر نہیں ہے کیونکہ جائداد خود کبھی بھی مقصود بالذات شئے نہیں ہوسکتی۔ بلکہ وہ ہرحال میں زیادہ سے زیادہ حصول راحت و منفعت کا ایک واسطہ ہے اس لئے ایسی حالت میں اس کی حفاظت کبھی بھی مستحسن نہیں ہوسکتی جبکہ مستحقین اس کے جائز استعمال سے محروم رہجائیں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے بہت سے آدمیوں کا روپیہ ان سے چھین کر ایک شخص کو دیدیا جائے۔ اور اوسپر یہ عذر پیش کیا جائے کہ چونکہ زیادہ روپیہ سے زیادہ فائدہ کی امید ہوتی ہے۔ اسلئے زیادہ آدمیوں کے پاس تھوڑا تھوڑا روپیہ ہونے کی نسبت یہ بہتر ہے کہ تھوڑے آدمیوں کے پاس زیادہ

انصاف پر چھوڑ دیگئی ہیں - حالانکہ اگر دنیا میں یہی ہوتا تو سرے سے نہ ہوں
اور قانونوں کی ضرورت ہی نہوتی -

لیکن اسکے برخلاف اسلام نے اول تو کسی فرد واحد کو تنہا تمام ترکے کا حق دار قرار نہیں دیا (البتہ اگر اور کوئی عزیز و اقارب ہوں ہی نہیں تو یہ دوسری بات ہے) بلکہ اولاد میں سے ہر ایک کو حصہ رسدی دیا ہے - اور اولاد کی موجودگی میں ہی بیوی بھائی بہن اور ماں باپ کو مقررہ حصے دیے ہیں - دوسرے مردوں کی وجہ سے عورتوں کو محروم الارث نہیں کیا -

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا (النساء ع ۲)	مردوں کے واسطے ان کے ماں باپ اور رشتہ داروں کے ترکے میں سے حصہ ہے - اور عورتوں کے واسطے بھی اس کے ماں باپ اور انکے رشتہ داروں کے ترکے میں سے حصہ ہے خواہ وہ ترکہ تھوڑا ہو یا زیادہ - یہ حصہ مقررہ ہے -

اگرچہ بعض صورتوں میں بحکم لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ مردوں کا حصہ عورتوں سے دوگنا ہے - بہرکیف یہاں ہم کو علم الفرائض کے تفصیلی نکات سے بحث نہیں ہے بلکہ صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ اسلام میں ترکے کی تقسیم کے اصول دیگر مذاہب کے مقابلے میں کسقدر زیادہ معقول ہیں ظاہر ہے کہ اولاد ہونے کی حیثیت سے چھوٹے بڑے سب برابر ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ باپ کے تمام ترکے کا وارث صرف بڑا بھائی کیوں ہو - اور اوس کے سب بھائی بہن محض اس وجہ سے کہ وہ اتفاق

دن رائج رہا۔ اور سرچشمۂ ہدایت و نبوت کو دنیا سے اُٹھے کچھ زیادہ مدت نہیں ہوئی تھی کہ حکمرانی کی ہوس اور جہاں بانی کی چاٹ نے حکامِ وقت کی آنکھوں کو ایسا خیرہ کر دیا کلان کو اپنی جانشینی کے لئے اپنی اولاد سے زیادہ قابل اور مستحق کوئی اور شخص نظر ہی نہیں آیا۔ اور یوں قیصر و کسریٰ کی طرح امیر المومنین کا لقب بھی پشتینی ہوگیا۔ لیکن اس الزام سے اسلام کا دامن بالکل پاک ہے۔

سلطنت کے موروثی ہونے کی تائید میں بھی اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ حکمرانی کے لئے خاص قابلیت اور لیاقت کی ضرورت ہوتی ہے جس کے لئے شروع ہی سے بچے کی تعلیم و تربیت ایک خاص طریقہ پر کیجاتی ہے۔ اور اس سے سب سے زیادہ فائدہ بڑا بیٹا ہی اُٹھاتا ہے۔ اس کے علاوہ بہ تقاضائے سن اسے اپنے چھوٹے بھائیوں کی نسبت تجربہ بھی زیادہ ہوتا ہے اسلئے بہ لحاظ وسعت معلومات و تجارت اپنے بھائیوں میں وہی سب سے زیادہ تخت و تاج کا اہل ہوتا ہے۔ لیکن بہرحال ہمکو سیاسیات سے کیا بحث۔

ہاں تو خیر اسلام نے جہاں سارے رشتہ داروں کو تھوڑا بہت صلۂ رحمی سے مستفید کیا ہے۔ وہاں متوفا کو بھی اوس کے حقوق مالکانہ سے بالکل محروم نہیں کیا۔ اور اسے اسکی املاک کی ایک تہائی حصہ پر وصیت کرنے کا اختیار دیا ہے۔ اور اس میں یہ منصفانہ مصلحت ملحوظ رکھی ہے کہ ایک طرف تو اگر مرنے والا کسی شخص کی خدمات کا انعام یا احسان کا صلہ جیتے جی

روپیہ ہو؟ لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایسا کرنا صریح ظلم نہیں ہے۔ اسکے علاوہ یوں بھی جائداد کا تحفظ محض اسکی یکجائی پر موقوف نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت میں اس کا انحصار اس کے مالک کی قابلیت پر ہے۔ اور بالکل ممکن ہے کہ ایک جائداد کئی مالکوں میں منقسم ہونے کے بعد بھی انکے حسن انتظام سے چند دن میں اس قدر ترقی کر جائے کہ اپنی اصلی مقدار سے کئی گنا بڑھ جائے۔ یا ایک ہی مالک کے پاس یکجا رہنے کے باوجود بھی اسکی نااہلی سے بالکل ضائع اور برباد ہوجائے۔ اس لئے تقسیم میراث میں کسی ایک فرد کے حق کی ترجیح کے لئے تحفظ املاک کا عذر بالکل مہمل اور لغو ہے۔

یہاں معترض صرف سلطنت کی ایک مثال پیش کرکے کہہ سکتا ہے کہ اس میں ولیعہدی فرزند اکبر کا حق کیوں سمجھی گئی ہے۔ اور اس میں اور اولاد اور رشتہ داروں کو حصہ کیوں نہیں دیا گیا۔ بلاشبہ یہ اعتراض درست ہوتا اگر اسلام کے نزدیک سلطنت بھی کسی شخص کی ذاتی ملک سمجھی جاتی۔ مگر صورت حال یہ نہیں۔ اسلام نے شروع ہی سے نہ صرف اصولاً بلکہ عملاً اس بات کی تعلیم دی کہ عہدۂ حکومت کا مستحق قوم کا قابل ترین فرد ہے اور اس میں توریث کو کچھ دخل نہیں۔ ع

"کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست"

چنانچہ اسکی قطعی شہادت اور کافی ثبوت ہم کو ترتیب خلافت راشدہ سے ملتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ یہ نہایت ہی مستحب اور مستحسن طریقہ بہت تھوڑے

کے حصوں کا فیصلہ کریں۔ ان قصوں کو اسلام ہماری طرف سے چکا دیتا ہے۔ اور ایسی خوش اسلوبی اور حق نوازی سے کہ اس سے بہتر کسی طرح ممکن نہیں۔

خاطر خواہ طور پر نہ دے سکا ہو تو وہ اوس کی حسرت دل کی دل ہی میں نہ لیجائے۔ اور دوسری طرف اگر وہ کسی عارضی ناراضی یا فوری جوش کی وجہ سے اپنے قدرتی اور جائز وارثوں کو بالکل محروم کرنا چاہے تو وہ مرتے وقت ایسی بے انصافی بھی نہ کر سکے جس سے اسکے سب عزیز ہمیشہ اسپر نفریں کرتے رہیں۔ پھر اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ مرض الموت میں آدمی کے ہوش و حواس بجا نہیں رہتے۔ اور اگر ایسا نہ بھی ہو تب بھی بیماری کی حالت میں یہ کہاں ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنی عمر بھر کی کمائی کا حساب کر کے اس میں سارے حقداروں کے حصے بخرے کرتا پھرے۔ اور یوں جو وصیت کرے وہ بالکل منصفانہ ہی ہو۔ اور موت سے اس قدر ڈرتے والے آدمی النادر کالمعدوم کا حکم رکھتے ہیں جو مرنے بلکہ بیمار ہونے سے بھی پہلے ہطرح سوچ سمجھکر وصیت نامہ تیار کر لیا کریں۔ اسلئے اسلام نے خود ہی ان سارے احتمالات کا خاطر خواہ تدارک کر دیا کہ کسی کو مرتے وقت اِن الجھنوں میں پڑنے کی حاجت ہی نہ ہو۔ اور پھر اس اصول کے نہایت ہی منصفانہ ہونے کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کو اس ایک تہائی حصے کے متعلق بھی کوئی خاص وصیت کرنے کی شاذونادر ہی حاجت پڑتی ہے اور اس کی تو ان کو کبھی ضرورت ہی پیش نہیں آئی کہ جب وہ بستر مرگ پر پڑے ہوں تو اوس وقت بھاگا بھاگ طبیب سے پہلے وکیل کو بلائیں اور عالم نزع میں اپنے خیالات کو دنیا و مافیہا سے یکسو کر کے خدا کی طرف پھیرنے کی بجائے وارثوں کے حقوق کا تصفیہ اور اپنے مال و دولت

کے رتبے سے بھی گرا دیا- یہی وجہ تھی کہ جب چوتھی صدی مسیحی میں نصرانیت کا زور ہوا- اور شریعت عیسوی تمام یورپ کے قانون کا ماخذ بنی- تو اس کے مطابق عورتوں کے وہ سارے حقوق قطعاً سلب ہو گئے- جو فلاسفہ یونان اور عقلائے روما کی صدیوں کی سعی و کوشش اور تغیر و تبدل خیالات کے بعد عورتوں کے لئے مسلم ہوتے جاتے تھے- ظاہر ہے کہ اس مذہب میں صنفِ نازک کی کیا عزت و وقعت ہو سکتی ہے جس کے بزرگوں نے عورت کو "شیطان[۵۱] کا دروازہ- خوبصورت بلا- دلکش مصیبت- اژدہے[۵۲] سے زیادہ خطرک اور افعی سے بڑھکر چالاک- غرض تمام[۵۳] خرابیوں اور ساری برائیوں کی جڑ" قرار دیا ہو- جس نے حوا کے پیدا کرنے کی غایت و غرض صرف یہ سمجھی گئی ہو کہ "وہ آدم سے اللہ کے حکم کی نافرمانی کرانے میں شیطان کی معاون اور مددگار رہو[۵۴]" جس نے ازدواج کے پاک اور ضروری رشتے کو دام تزویر اور کمند معصیت[۵۵] ٹھہرایا ہو-

۵۱- یہ قول ٹرٹلین کا ہے -
۵۲- یہ قول سینٹ گرگوری کا ہے
۵۳- یہ قول سینٹ جیروم کا ہے
۵۴- یہ قول سینٹ آگسٹائن کا ہے

(۵۱ تا ۵۴) یہ سب لوگ مسیحیت کے بزرگوں میں نہایت مقتدر اور سر برآوردہ ہیں جن کے ہاتھوں سے اس مذہب کی عمارت قایم ہوئی ہے- اور جن کی تحریروں پر مسیحیت کا مدار ہے-

۵۵- ڈیڑھ ہزار برس سے زیادہ تک کلیسا نے یہی تعلیم دی کہ جہاں تک ممکن ہو تجرد اختیار کیا جائے- کیونکہ تعلق زنا شوئی خواہ کیسا ہی ضروری اور باقاعدہ کیوں نہ ہو- یہ بھی ایک گناہ اور آتش دوزخ کی ایک لپٹ ہی ہے -

صنفِ ضعیف اور اسلام

مخالفوں نے اسلام پر جو اتہام لگائے ہیں۔ اور منافقوں نے اس دین کی بابت جو غلط فہمیاں پھیلائی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس مذہب نے صنفِ ضعیف کی سخت حق تلفیاں کی ہیں۔ اور مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی بہت تذلیل و توہین روا رکھی ہے گو سچ یہ ہے کہ ؎

نقلِ ہر جور کہ از خلق کریمت گویند ۔۔۔ قولِ صاحب غرضان است تو اینہا نکنی

الزام تو خیر جو کچھ ہے۔ ہے ہی۔ مگر اس میں قابلِ دید بات یہ ہے کہ یہ اعتراض کرنے والے وہ لوگ ہیں۔ جو مذہب مسیحیت کے پیرو کہلاتے ہیں۔ حالانکہ عورت کی جو بُری گت اس مذہب نے کی ہے اور جس ذلیل درجہ پر صنفِ نازک کو اسنے پہنچایا ہے۔ وہ شاید تمام ادیانِ عالم میں سب سے بدتر ہے۔" اگرچہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تو اوس کے یا اور کسی تمدنی معاملے کی بابت کچھ ہدایت کی ہی نہیں۔ مگر انہوں نے اِن بے انصافیوں اور بدسلوکیوں کے برخلاف بھی ایک حرف نہیں کہا۔ جو یہودیوں میں عورتوں کے ساتھ جائز رکھی جاتی تھیں[۱]" اور ان کے بعد ان کے خلیفۂ اعظم سینٹ پال نے تو عہدِ عتیق کی تعلیم کے مطابق عورتوں کو انسانیت

[۱] یہ فقرہ مسٹر جوزف میک کیب کی کتاب "دی ریلیجن آف ویمن" کے باب سوم سے ترجمہ کیا گیا ہے

ایک صفر ہے .... بیوی کا مرتبہ ماما سے کسی طرح زیادہ نہیں ہے۔ انگریزی قانون عامہ کے مطابق اس کا شوہر اس کا مالک اور آقا ہے۔ اسے بیوی کی ذات اور اس کے نابالغ بچوں پر پورا اختیار حاصل ہے۔ وہ اسے ایسی لکڑی سے مار سکتا ہے "جو اس کے انگوٹھے سے زیادہ موٹی نہ ہو" اور وہ اس کی کوئی شکایت نہیں کر سکتی .... ممالک متحدہ امریکہ کے قانون عامہ میں زن و شوہر کو شخص واحد قرار دیا ہے۔ مگر وہ شخص واحد خاوند ہے۔ وہ وصیت سے بیوی کو اپنی کل جائداد ہی سے نہیں بلکہ خود اس کے املاک سے بھی محروم کر سکتا ہے۔ وہی اسکے تمام مال و متاع کا مالک و مختار ہوتا ہے۔ بیوی اپنے شوہر کی مرضی کے بغیر نہ کوئی وصیت کر سکتی ہے نہ کسی قسم کا معاہدہ۔ نہ وہ اپنی ذاتی جائداد کو قانوناً منتقل کرنے کی مجاز ہے۔ اس کا لباس بھی اس کا نہیں ہے۔ اس کے بذاتہا کسی طرح کے کچھ حق نہیں ہیں یہاں تک کہ وہ اپنی جان کو بھی اپنا نہیں کہہ سکتی۔ اس کا شوہر اس کے بچوں کو اس سے چھین سکتا ہے۔ اس کے کپڑے اتروا سکتا ہے۔ اسے اور بال بچوں کو بھوکا مار سکتا ہے۔ مگر عورت کے لئے قانونی چارہ جوئی کا دروازہ بند ہے۔ البتہ اگر عورت بیچاری خود محنت کر کے کچھ کمائے تو مرد بحق شوہری اسکی کمائی پر قبضہ پانے کا مستحق ہے"[۵۱]

۵۱۔ ماخوذ از "ہسٹری آف ویمینز سفریج" مصنفہ مسز کیڈی سٹینٹن حصہ سوم صفحہ ۲۹۰ میں نے اس مضمون کو مسٹر جوزف میک کیب کی کتاب "دی ریلیجن آف وومین" سے لیا ہے۔

مگر ہم کو ان اقوال پر اتنا تعجب نہیں ہوتا۔ جتنا حسن اخلاق کے بہترین نمونے اور دنیا کے سب سے زیادہ حلیم۔ خوش خلق اور نیک شخص (حضرت عیسیٰؑ) کے اس برتاؤ سے ہوتا ہے۔ جو انہوں نے از روئے انجیل اپنی والدہ مکرمہ حضرت مریم کے ساتھ جائز رکھا۔ حیرت ہے کہ کوئی سعادتمند بیٹا اپنی ماں سے جو فرط محبت سے اسے دیکھنے چلی آئی ہو۔ کیونکر ایسے سخت اور کرخت الفاظ میں خطاب کرسکتا ہے۔ کہ "بڑھیا تو کیوں آتی ہے۔ تیرا مجھ سے کیا کام ہے" لیکن خیر۔ جب ہم اس مذہبی تعلیم کے بعد سنہ ۱۸۵۰ء میں انگریزی قانون کے مطابق مہذب اور ترقی یافتہ بلاد مغرب میں صنفِ ضعیف کی حسب ذیل حالت پاتے ہیں۔ تو ہم کو کچھ تعجب نہیں ہوتا۔ ہم پڑھتے ہیں کہ "عورت کسی چیز پر قابض نہیں ہو سکتی خواہ وہ اسکی خود پیدا کردہ ہو یا اسے ورثے میں ملی ہو۔ بحالت ناکتخدائی وہ مجبور ہے کہ اسے کسی کے پاس امانت رکھ دے۔ اور اسکی مرضی پر کاربند ہو۔ اگر وہ شادی کرنا چاہے۔ اور اپنے مال پر قبضہ پانے کی خواہش مند ہو۔ تو وہ قانوناً مجبور ہے۔ کہ اپنے آیندہ شوہر سے ایک معاہدہ کرے جس کی رو سے اپنی تمام املاک اس کے سپرد کردے۔ عورت خواہ شادی شدہ ہو یا ناکتخدا۔ کوئی ذمہ داری اور حکومت کا منصب نہیں پا سکتی۔ اسکی سرے سے کچھ شخصیت ہی نہیں ہے۔ نہ اسکے بہ حیثیت باشندۂ شہر کوئی حق ہیں۔ نہ وہ انسانی خاندان کا کوئی رکن ہے۔ وہ تہذیب و تمدن کی میزان میں کوئی عدد نہیں ہے۔ بلکہ محض

کا دعویٰ کرتی ہیں۔ وہ خود اپنے اس طرز عمل سے اپنے سچے اور صحیح دعووں کی تردید کرتی ہیں۔ کیونکہ اس سے لازمی اور صریحی نتیجہ یہ ہی نکلتا ہے کہ اصل میں تو عورتیں مردوں سے بہت کم درجے کی ہیں اور ان کے مخصوص فرائض بھی بہت ذلیل اور پست ہیں۔ مگر اب چونکہ وہ اپنے خاص کاموں کو چھوڑ کر اپنے آپ کو مردوں کی خدمتیں انجام دینے کے قابل بنانا چاہتی ہیں۔ اس لئے ان کو ان کے کار آمد ہونے کے لحاظ سے ایک حد تک مردوں کے برابر مان لینا چاہیئے۔ لیکن ظاہر ہے کہ عورتوں کی یہ عزت فی الواقع مردوں کی فضیلت کا ایک اور ثبوت ہے۔ حقیقت میں عورتوں کی اصلی عزت وہ ہے۔ جو وہ اپنے دائرہ انوثیت میں رہ کر اپنے مخصوص فرائض بجا لانے سے حاصل کر سکیں۔ اور ہم کو یہاں یہی دیکھنا ہے کہ یہ اصلی عزت عورتوں کو کس مذہب اور کس قانون نے دی ہے۔ کیونکہ یہ تو بدیہی بات ہے کہ یورپ کے موجودہ نظام معاشرت اور اصول تمدن میں یہ صفت نہیں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جس طرح پہلے عورتوں کو مردوں سے اپنی حق تلفی کی شکایت تھی۔ اب مردوں کو عورتوں سے حد سے زیادہ آزادی کا گلہ ہے۔ غرض انصاف و اعتدال وہاں نہ پہلے تھا۔ نہ اب ہے

ہم نے یورپ کی مسیحی اقوام میں عورتوں کی حالت کا بیان کسی قدر تفصیل سے کیا ہے۔ اس سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ جو اصحاب یورپ کی تقلید میں عورتوں کی آزادی کے دلدادہ ہیں۔ اور احکام اسلام پر اس صنف ضعیف کی تذلیل و توہین کا الزام لگاتے ہیں۔ ان کو کم سے کم

یہ حالت نہایت افسوس ناک ہے۔ اور خود مسیحیوں کو بھی اس سے انکار نہیں کہ عورتوں کی اس پستی کا سبب احکام شرع مسیحی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ یہ کیفیت اب سے پچاس ساٹھ برس پہلے کی ہے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ اشاعت تعلیم اور دیگر اسباب نے (جن میں یقیناً اسلام کا بہت بڑا اثر ہے اگرچہ کوئی اس کا نام نہیں لیتا) اس طرز عمل میں ترمیم کرنی شروع کی اور چند ہی دن میں اتنا انقلاب عظیم واقع ہو گیا کہ عورتوں نے اخلاقاً وقانوناً مردوں کی برابری کا ہی دعویٰ نہیں کیا (جس کی وہ یقیناً مستحق ہیں) بلکہ وہ اپنے فرائض نسوانیت کی بجا آوری سے پہلو تہی کر کے مردوں کے کاموں میں دخیل ہونے لگیں۔ اور اپنے جامہ نوانیت کو عار سمجھ کر مردانہ طرز و وضع اختیار کرنے لگیں۔ یہاں تک کہ اب وہ اپنی اس تبدیل ہئیت و تغیر حالت کا ذکر بھی سننا نہیں چاہتیں۔ کیونکہ اس سے ان کی مداخلت کے بیجا ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ اسے اپنا فطری حق اور قدرتی منصب قرار دیتی ہیں۔ سردست ہم ان دعووں کی بابت کچھ کہنا نہیں چاہتے۔ مگر ہم کو خواتین مغرب کے اس طرز عمل سے اتفاق نہیں ہے کیونکہ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ جہاں کہیں کوئی فضیلت دوسرے کی نقل کے ذریعہ سے حاصل کی جائے۔ وہاں یہ امر خود ہی اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ نقل کرنے والا دل میں اپنی پستی کو تسلیم کرتا ہے اور بذریعۂ تقلید اسکی تلافی کرنی چاہتا ہے۔ اس لئے حقیقت میں جو عورتیں مردوں کے کام انجام دیکر یا مردانہ وضع اختیار کر کے مردوں کی ہمسری

جس کا کچھ سرسری ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ اس کے برخلاف عرب میں قبل بعثت عورتیں اتنی گئی گزری ہو گئی تھیں کہ حقیقت میں ان کی وقعت جانوروں سے زیادہ نہیں رہی تھی۔ اول تو ان میں لڑکیوں کا پیدا ہونا ہی نہایت نامبارک اور شرمناک حادثہ سمجھا جاتا تھا۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۚ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ۭ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰي هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ۭ	اور جب ان میں سے کسی کو اس کے ہاں لڑکی ہونے کی خبر دی جاتی تھی تو اس کا منہ فق ہو جاتا تھا۔ اور وہ ملول ہو جاتا تھا۔ اور اس بری خبر کی وجہ سے اپنی قوم سے چھپا چھپا پھرتا تھا اور دل میں سوچتا تھا کہ اسے باوجود ذلت اپنے ہاں رہنے دے یا اسے مٹی میں دفن کر دے۔

اسی وجہ سے جو قبیلے اپنے آپ کو بڑی ناک والا سمجھتے تھے وہ عموماً لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی یا بچپن میں قبل بلوغ زندہ دفن کر دیا کرتے تھے یا اور کسی طرح مار ڈالا کرتے تھے ۵

جو ہوتی تھی پیدا کسی گھر میں دختر پھرے دیکھتی جب تھی شوہر کے تیور	تو خوف شماتت سے بے رحم مادر کہیں زندہ گاڑ آتی تھی اس کو جا کر

یہ وحشیانہ رسم عرب کے سوا دنیا کے اور ملکوں میں بھی رائج رہی ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں اس کا انسداد عہد انگریزی کا ایک تاریخی واقعہ ہے۔

خیر اگر زندگی ہوتی اور لڑکیاں ماں باپ کے خلاف فطرت جور و عتاب کے باوجود بھی بچ جاتیں تو وہ بھائیوں کے مقابلے میں ترکہ پدری

اتنا تو معلوم ہو جائے کہ یورپ کی یہ معاشرتی آزادی کیسی مشکل سے پیدا ہوئی ہے۔ اور اب بھی نہیں معلوم اسے اصول فطرت کے بالکل مطابق بننے کے لئے ابھی کتنے اور ارتقائی مدارج طے کرنے باقی ہیں۔ کیونکہ اس سے تو یقیناً کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ کہ وہاں صنف اناث و ذکور کے باہمی تعلقات میں ابھی تک ایک اضطرابی کیفیت ہے۔ اور انکا طرز معاشرت ایک انقلاب پذیر حالت میں ہے۔ جسے ایک مستقل اور پر اطمینان صورت اختیار کرنے کے لئے ابھی بہت کچھ ترمیم اور اصلاح کی ضرورت ہے۔

اب اس مذہب کو لیجئے۔ جس کی بابت کہا جاتا ہے کہ اسنے عورتوں میں سرے سے روح ہی کو تسلیم نہیں کیا۔ اور ان کا درجہ جانوروں سے بھی کچھ کم رکھا ہے۔ اور دیکھئے کہ اسنے عورتوں کی بابتہ کیا کہا ہے۔ اور جو کچھ کہا ہے وہ کس زمانے میں کن آدمیوں سے کہا ہے۔ مسیحیت نے جب روما اور یونان کی مدنیت پر اپنا اثر ڈالا۔ تو اس وقت وہاں عورتوں کی حالت بہت بہتر ہو چکی تھی۔ اصحاب رائے نے اِن کو ہر حیثیت سے مردوں کے برابر مان لیا تھا۔ وہ اپنی جائداد کی خود مختار مالک ہوتی تھیں۔ اور اپنی ذات سے ہر قسم کے تمدنی معاہدے اور قانونی معاملے کرنے کی مجاز تھیں۔ غرض ان کی حالت قریب قریب ایسی ہی تھی۔ جیسی آج کل یورپ[۵] میں ہے۔ لیکن اس اثر سے ان کی یہ ساری برتری جاتی رہی۔ اور وہ اس درجے کو پہنچ گئیں اور ڈیڑھ ہزار برس تک برابر اسی حالت میں رہیں۔

[۵] ماخوذ از "دی ریلیجن آف دو میں" از جوزف میک کیب" باب دوم۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (ع ۱۳ پ ۱۴)	جو نیک کام کرے خواہ وہ مرد ہو یا عورت - اور وہ ایمان والا ہو - تو ہم ضرور اسے پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے - اور جو اچھے کام وہ کرتا تھا ان کا نہایت عمدہ بدلہ دیں گے-

اس میں عورتوں کا نام بالتخصیص اسی غرض سے لیا گیا ہے کہ ان کے مردوں سے کم درجے کے ہونے کا خیال باطل مٹ جائے - اور دونوں میں اعمال کے سوا جنسیت کی وجہ سے کچھ امتیاز باقی نہ رہے - ورنہ عموماً قاعدہ یہ ہے کہ جہاں کہیں کوئی حکم عورتوں اور مردوں میں مشترک ہوتا ہے - وہاں صرف ضمیر مذکر کا استعمال دونوں پر حاوی ہوتا ہے - مگر یہاں تصریح سے مردوں اور عورتوں کی باہمی مساوات کی تاکید مد نظر ہے - اسی لئے صاف صاف کہا گیا ہے کہ ثواب آخرت کے لئے صرف نکوکاری شرط ہے ورنہ یوں مرد عورتیں سب برابر ہیں - اس مساوات کو اسلام نے ہبوط آدم ہی سے پیش نظر رکھا ہے - چنانچہ شجر ممنوعہ کے چکھنے میں بھی مرد و عورت دونوں کو شریک مساوی قرار دیا ہے - اور چونکہ اللہ تعالےٰ نے ممانعت کرتے وقت بھی دونوں کو مخاطب فرمایا تھا - اسلئے سزا کے مستحق بھی دونوں برابر تھے - اس لئے وہ توبہ و استغفار بھی اکٹھے کرتے ہیں - انجیل کی طرح یہ نہیں کیا گیا کہ نافرمانی کا تمام بار بیچاری عورت پر ڈالکر بدنامی کا ٹوکرا اسی کے سر پر رکھدیا ہو - اور صنفِ ضعیف کو صرف اپنے ہی نہیں بلکہ جنس ذکور کے بھی ابتدائی گناہ کا محرک اور موید ٹھہرایا ہو -

پانے کی مستحق نہ ہوتی تھیں کیونکہ ان کے خیال کے مطابق وہ لڑائیوں میں حصہ نہیں لیتی تھیں۔ شادی کے بعد وہ بالکل اپنے شوہر کے قبضہ اختیار میں ہو جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ شوہر کے انتقال کے بعد وہ مال متروکہ کی طرح اس کے وارثوں میں تقسیم کر دی جاتی تھیں۔ اسی بنا پر ان میں یہ دستور تھا کہ بیوہ ہونے کے بعد سوتیلی مائیں اپنے سوتیلے بیٹوں کی زوجیت میں آ جاتی تھیں اور اس کے لئے ان کی رضامندی اور قبولیت بھی ضروری نہیں ہوتی تھی۔ اس میں سب سے مقدم حق بڑے بیٹے کا ہوتا تھا۔ وہ اگر قبول نہ کرتا تو وہ عورتیں اس کے چھوٹے بھائیوں پر پیش کی جاتیں۔ اور اگر وہ بھی نہ لیتے تو کوئی اور قریبی رشتہ دار ان کا وارث و مالک ہو جاتا تھا۔

ان باتوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام سے پہلے عرب میں عورتیں کس قدر ذلیل سمجھی جاتی تھیں۔ اسی خیال سے ان کو بہت سی عبادتوں اور مذہبی رسموں میں بھی شریک نہیں کرتے تھے۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ ان میں بعض عورتیں اپنی دلیری اور شجاعت۔ شعر گوئی اور کہانت کی وجہ سے شہرہ آفاق بھی ہوئیں مگر پھر بھی علی العموم ان کی اخلاقی اور تمدنی حالت بہت پست تھی اور وہ کسی حیثیت سے مردوں کی برابری کا دعویٰ نہ کر سکتی تھیں

ان مخالف حالات کے مقابلے میں اسلام نے آتے ہی یہ اعلان کر دیا کہ روحانی ترقی اور اخلاقی ذمہ داری کے لحاظ سے عورتیں مردوں کے برابر ہیں اور قرب الٰہی میں صرف افعال و اعمال کو دخل ہے۔ مرد یا عورت ہونے سے کچھ فرق نہیں ہوتا۔ چنانچہ بار بار ارشاد ہوا ہے کہ۔

اس سے یہ بھی قطعی طور پر معلوم ہوگیا - کہ اسلام نے عورتوں اور مردوں کے قوائے دماغی میں بھی کوئی خاص فرق تسلیم نہیں کیا - انہی دونوں حدیثوں سے یہ حکم بھی مستنبط ہوتا ہے کہ لڑکیوں کو بھی لڑکوں کی طرح تعلیم دینی چاہیئے - اگرچہ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ہم آج کل کے زنانہ مدارس اور ان میں انگریزی یونیورسٹیوں کے مجوزہ نصاب کی فرضیت ثابت کر رہے ہیں - ظاہر ہے کہ جس علم کی تلاش ہم پر فرض کی گئی ہے - وہ شیکسپیر کے ڈرامے اور یونان کے افسانے نہیں ہیں - لیکن خیر یہ ایک جدا بحث ہے -

اس کے بعد جوان ہونے پر اس نے عورت کو ہر ایک معاملے میں بالکل آزاد اور خود مختار تسلیم کر لیا - چنانچہ اسے ترکہ والدین میں سے حصہ دلایا (اگرچہ بعض صورتوں میں وہ حصہ مردوں کی نسبت نصف ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں برابر) اسے اپنے مال و متاع کا بلا شرکت غیرے مالک قرار دیا - اسکو ہر قسم کے معاملات و معاہدات کرنے کا مجاز مانا - اسی طرح شادی میں مرد اور عورت دونوں کی رضامندی کو شرط لازم ٹھہرایا - اور بصورت ناموافقت عورت کو بھی مرد سے علیحدگی اختیار کرنے کی اجازت دی - اور صرف انہی پر مردوں کے حق قائم نہیں کئے - بلکہ مردوں کو بھی ان کے حقوق کا پابند کیا -

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ	جیسے مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں ویسے ہی ان کے حقوق مردوں پر بھی ہیں -

غرض جہاں تک قیاس ہوتا ہے ہر ایک بات میں عورتوں اور مردوں کی

یوں اسلام نے روحانی اور اخلاقی حیثیت سے عورتوں کو مردوں کے برابر کر کے درحقیقت ان کو اور تمام حیثیتوں سے بھی ان کا ہمسر تسلیم کر لیا۔ کیونکہ ارکان مذہبی کی بجا آوری اور فرائض اخلاقی کی تعمیل میں مساوات کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کی عقلی اور دماغی قابلیتیں بھی برابر ہوں۔ لیکن چونکہ مذہب کو ان خاص حیثیتوں کے سوا اور کسی پہلو سے کوئی حکم دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لئے اسکی کچھ صراحت نہیں کی گئی۔ البتہ اصول تمدن کی تعلیم میں اسلام نے وہ قواعد سکھائے جن سے عملی طور پر عورتوں کے ہر قسم کے حقوق کی خاطر خواہ حفاظت کر دی گئی اور مردوں اور عورتوں کی برابری ہر پہلو سے ثابت ہو گئی۔ اس نے سب سے پہلے تو دختر کشی کی ظالمانہ رسم کو مٹا دیا۔ اور لڑکیوں کی پیدائش پر ملول ہونے سے منع فرمایا۔ اور ان کو لڑکوں کے برابر رکھنے کی تاکید فرمائی۔

چنانچہ ارشاد نبوی ہے۔

مَنْ كَانَتْ لَهُ أُنْثٰى فَلَمْ يَئِدْهَا وَلَمْ يُهِنْهَا وَلَمْ يُؤْثِرْ وَلَدَهُ عَلَيْهَا أَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ۔ (ابو داؤد)	جس کسی کے ہاں لڑکی پیدا ہو۔ پھر نہ وہ اسے زندہ دفن کرے نہ اسے ذلیل کرے نہ اس پر اپنے لڑکے کو ترجیح دے۔ تو اللہ اسے جنت میں جگہ دے گا۔

تعلیم کی تاکید میں بھی مردوں اور عورتوں کو یکساں رکھا گیا۔ چنانچہ ارشاد ہوا کہ

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَةٍ	علم کی تحصیل ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔

رکھا جاتا تو یہ مردوں پر سخت ظلم ہوتا۔ بہرحال اس تقسیم میں عورتوں اور مردوں کی ضرورتوں کا لحاظ کیا گیا ہے۔ جو بالکل قرین انصاف ہے۔ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تذلیل و توہین کسی طرح بھی مدنظر نہیں ہے۔ اور اس سے یہ نتیجہ نکالنا قطعاً غلط ہے۔ اس اعتراض میں سب سے زیادہ قابل دید بات انسانی طبیعت کا تلون ہے۔ وہی لوگ جو ایک طرف تمام ترکے کا وارث جائز لڑکوں میں سے بھی فقط ایک بڑے بیٹے کو مانتے ہیں۔ لڑکیوں کا تو ذکر ہی نہیں۔ وہی لوگ دوسری طرف لڑکیوں کا حصہ لڑکوں سے نصف ہونے کو خلاف انصاف کہہ کر اس قانون میراث پر اعتراض کرتے ہیں۔ سبحان اللہ کیسی عجیب بات ہے۔

دوسرا شبہ گواہی کے متعلق تھا کہ ایک مرد کی بجائے دو عورتوں کی گواہی کیوں ضروری سمجھی گئی۔ اس کی وجہ خود کلام مجید نے وہیں بتا دی ہے کہ۔

اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى۔	اگر ان میں سے ایک بھول جائے تو دوسری سے یاد دلا دے۔

ظاہر ہے کہ عورتیں زیادہ تر اپنے گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی ہیں انکو لین دین کے معاملات اور گواہی شہادت کے جھگڑوں میں کبھے کبھے پھرنے سے کیا تعلق۔ اس لئے اول تو ان کو گواہی کے لئے بلانے کی ضرورت ہی نہیں۔ دو مرد کافی ہیں۔ لیکن اگر کوئی ایسا ہی موقعہ آپڑے کہ ایک ہی مرد ہو تو خیر ایک مرد کی جگہہ دو عورتیں گواہ کر لیجائیں۔

برابری کا خیال رکھا - اور کسی طرح سے بھی بہ لحاظ جنس ایک کو دوسرے پر فضیلت نہیں دی -

یہاں ایک دو شبہے پیدا ہو سکتے ہیں - اور کہا جا سکتا ہے کہ اگر اسلام نے ہر طرح عورت کو مرد کے برابر رکھا ہے - تو

لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ - | مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے -

کیوں ہے - اور ایک مرد کی گواہی کے مقابلے میں دو عورتوں کی گواہی کیوں رکھی گئی ہے - مناسب ہے کہ ہم اور اعتراضوں کو دیکھنے سے پہلے ان شبہات کا جواب دے لیں - یہ درست ہے کہ ترکۂ پدری میں بہن کا حصہ بھائی سے نصف رکھا گیا ہے - مگر یہ بے انصافی اور حق تلفی نہیں ہے بلکہ عین انصاف ہے - لڑکی جب تک ماں باپ کے گھر رہی اس کا سارا بار ان کے سر پر رہا - جب شادی ہوئی - تو ایک طرف تو ماں باپ سے جہیز پانے کی مستحق - دوسری طرف شوہر سے مہر لینے کی حقدار - اور اسکے سوا اب بھی نان و نفقے کا خاوند ہی ذمہ دار - اتنی سبکدوشی اور آزادی کے باوجود بھی اسے ترکہ میں سے ایک معقول حصہ دیا جاتا ہے جس میں سے اسے صرف کرنے کی ضرورتیں بہت ہی کم پیش آتی ہیں - تو کیا یہ بھی اس کا آدھا اس کے بھائی کے سارے حصے کے سوا بر نہیں ہے - ہم تو سمجھتے ہیں کہ اگر حساب کیا جائے تو ماں باپ کا جتنا روپیہ لڑکی کو پہنچتا ہے - اتنا لڑکے کو کسی حال میں بھی نہیں ملتا - اور اگر ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے ترکے میں مرد و عورت کا حصہ برابر

ہم اسکی حمایت میں کچھ نہ کہیں گے۔ کیونکہ سردست ہمکو فقط اسکی مذہبی حیثیت سے بحث ہے۔ حقیقت میں اسلام نے اول تو اتنے سخت پردے کا حکم ہی نہیں دیا۔ دوسرے جو کچھ بھی حکم اس بارے میں ہوا وہ اس وجہ سے نہیں ہوا کہ عورتیں ناقابل اعتبار سمجھی گئیں۔ یا ان کو اپنی عصمت کا کافی نگہبان تسلیم نہیں کیا۔ یا خواہ مخواہ ان کی آزادی کو محدود اور مقید کیا گیا۔ بلکہ حقیقت میں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ فی الواقع مرد اس لائق نہیں سمجھے گئے کہ وہ عورتوں سے بلا تکلف ملیں جلیں۔ عورتوں پر اعتبار کرنے یا نہ کرنے کی تو بحث ہی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر عورتیں معتبر نہ سمجھی جاتیں تو ان کو محض گھروں میں بٹھائے رکھنا بھی کافی نہ ہوتا۔ اور ان کی عصمت کی نگرانی کے لئے کسی اس سے بھی زیادہ سخت قید کی ضرورت ہوتی۔ لیکن عورتوں پر تو کوئی شبہ کیا ہی نہیں گیا۔ البتہ چونکہ مرد پورے طور پر قابل اطمینان نہ سمجھے گئے۔ اور انہی کی طرف سے شرارت کی ابتدا اور چھیڑ چھاڑ کا آغاز ہوا۔ اس لئے یہ حکم دیدیا گیا کہ۔

يَآ أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَابِيبِهِنَّ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَن يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ (۲۲ع ۲)	اے نبی تو اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہدے کہ وہ اپنی اوڑھنیوں کے گھونگٹ نکال لیا کریں۔ اس سے غالباً وہ پہچان لی جائیں گی اور وہ ستائی نہ جائینگی۔

ممکن ہے کہ یہاں یہ کہا جائے کہ اگر اسلام کا نکتہ خیال فی الواقع یہی ہے۔ تو پھر مردوں کی بدکاری اور بے اعتباری کی سزا میں عورتیں کیوں پابند

فَاِنْ لَّمْ یَکُوْنَا رَجُلَیْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ۔ | پس اگر دو مرد نہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ ہوں۔

اس سے یہ نتیجہ کسی طرح بھی نہیں نکلتا کہ عورت کو مرد کے مقابلے میں ناقص العقل قرار دیا ہے۔ بلکہ محض ان کے لئے ایک قسم کی رعایت اور سہولیت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ کیونکہ اس کے مقابلے میں ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے امور معاہدات میں ایک ہی عورت کی شہادت فیصلے کے لئے کافی سمجھی گئی ہے۔

یہ تو خفیف شبہات تھے۔ اسلام پر مخالفین کا بڑا اعتراض تو یہ ہے کہ اس نے ایک طرف تو عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں قید کر کے ان کو ہر قسم کی ترقی اور آزادی سے محروم رکھا۔ اور دوسری طرف مردوں کو طلاق اور تعدد ازدواج کی اجازت دے کر عورتوں کو محض ان کا تختۂ مشق ہوس بنا دیا۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام نے عورتوں کو گھروں میں رہنے کی ہدایت کی اور ان کو عام طور پر مردوں سے خلا ملا رکھنے سے منع فرمایا۔

وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى۔ (الآیۃ) ع دپ ۲۲ | اور اے پیغمبر کی بی بیو تم اپنے گھروں میں رہا کرو اور گذشتہ زمانہ جاہلیت کی طرح بناؤ سنگار دکھاتی نہ پھرو۔

لیکن پھر بھی شرعی پردہ اتنا سخت نہیں ہے۔ جتنا آج کل کا رسمی پردہ اور اگرچہ ہم اپنی موجودہ معاشرت کی وجہ سے اسی رسمی پردے کو اپنے لئے نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔ تاہم چونکہ وہ ایک تمدنی مسئلہ ہے۔ اس لئے یہاں

بچے غیر مردوں سے الگ تھلگ گھر کے بالائی حصہ میں رہتے تھے.....
اور ان کی زندگی اسی زمانے کے بت پرست جاپان اور مسلمانانِ اندلس کی عورتوں کے مقابلے میں ایک طرح کی غلامی ہوتی تھی۔"[۵۱]

مگر آج کل نکتۂ خیال کے بدلجانے کی وجہ سے اس حکم میں طرح طرح کے مغالطے اور شکوک پیدا ہو گئے۔ اور دوسروں کے بُرا کہنے سے ہم خود بھی اسے بُرا سمجھنے لگے۔ لیکن اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ یہ ایک قسم کی قیدی ہے۔ تب بھی تمام نظام تمدن کو بدلے بغیر عورتوں کو باہر نکلنے کی اجازت دینا اور مردوں کو گھروں میں بند رکھنا ممکن نہ تھا اور اگر کسی طرح ایسا ہو بھی سکتا۔ تو شائد اسے مرد کچھہ زیادہ پسند نہ کرتے۔ اسلئے صرف یہی ایک صورت باقی رہ گئی کہ مردوں اور عورتوں کو بے تکلف باہم ملنے جلنے کی اجازت دیجاتی۔ اور اصل بات یہ ہے کہ یورپ کی یہی آزادی ہے جس کے شوق میں ہم کو اپنے ہاں کی عورتوں کی خانہ نشینی اور پردہ گزینی بھی ایک آنکھہ نہیں بھاتی۔ اور بلا تامل عواقب یہاں بھی اسی بیحجابی کی آرزو کیجاتی ہے لیکن اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو خود یہ شوق اور آرزو ہی پردے کے وجوب کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ یورپ کی مثال جو حقیقت میں پردے کی ضرورت کا قطعی ثبوت ہونی چاہیے تھی اس کی مخالفت کی محرک ہورہی ہے۔ حالانکہ اب تو بفضل خدا ہمارے ہاں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ جو وہاں کی بے پردگی کے نتائج

[۵۱] - ماخوذ از دی ریلیجن آف دومین" باب چہارم صفحہ ۳۷ ۔

کی گئیں - اس اعتراض میں اول تو یہی بات بحث طلب ہے کہ آیا باہر آنے جانے کے مقابلے میں گھروں میں رہنا بُرا ہے بھی یا نہیں - مخالفین پردہ تو اسے قید اور غلامی سمجھتے ہیں مگر ہم ان کے ہم خیال نہیں ہیں - ہمارے نزدیک تو بسا اوقات گھروں میں رہنا باہر جاکر تلاش معاش اور افکار روزگار میں سرگرداں ہوجانے کی نسبت بہت زیادہ موقر اور وقیع ہے - غور کیا جائے تو خود ہمارے ہاں بھی پردے کی رسم صرف ایک محدود طبقۂ شرفا میں رائج ہے - جو ساری آبادی کے مقابلے میں بہت قلیل التعداد ہیں - دیہات میں بالعموم عورتیں کام کاج کے لئے باہر آتی جاتی ہیں - شہروں میں بھی اکثر ادنی درجے کی عورتیں نہ پردہ کرتی ہیں نہ کرسکتی ہیں - لیکن اگر اسی معیار کے مطابق دیکھا جائے تو خود فرقۂ اناث ہی میں ہر ملک اور ہر قوم میں باہر پھرنے والیوں کی نسبت گھروں میں رہنے والیاں زیادہ معزز سمجھی گئی ہیں - اور یوں کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ گھروں میں رہنے کا حکم عورتوں کو کسی طرح کی سزا کے طور پر دیا گیا ہے - جس سے ان کی کسی قسم کی بے اعتباری یا تذلیل و توہین مقصود ہو - بلکہ حقیقت میں یہ امراء کے لئے نشان امتیاز اور تمغائے افتخار ہے - قدیم تاریخوں کو اٹھا کر دیکھئے تو وہ بھی اسی کی تائید کرتی ہیں - مصر قدیم میں عورت گھر کی مالک سمجھی جاتی تھی - اور باہر کام کاج کے لئے بہت کم نکلتی تھی - یونان میں بھی شریف عورتیں گھروں ہی میں رہتی تھیں - اور خود انگلستان میں بھی قرون وسطےٰ میں زمینداروں کی بیویاں اور ان کے

دقتوں اور برائیوں کے باوجود بھی اسکو خواہ مخواہ جائز کرتا۔ مساوات کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو کام مرد کرتے ہیں۔ وہی عورتیں بھی کریں۔ یا جو کام عورتوں سے مخصوص ہیں ان میں مرد بھی حصہ لیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ مدعیان مساوات اس مسئلے کو کہاں تک طول دینگے کیونکہ وہ خواہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کریں تھوڑی دور چلکر قدرت خود عورتوں اور مردوں میں تفریق کردے گی۔ اور اس حد فاصل کے آگے دونوں ایک قدم بھی نہیں بڑھا سکیں گے۔ اصلی مساوات یہ ہے کہ مرد اپنے کام انجام دیں۔ اور عورتیں اپنے فرائض بجالائیں۔ اب اسلام نے مردوں کے سپرد اہل وعیال کی حفاظت اور کسب معیشت کی خدمت کی ہے۔ اور عورتوں کے ذمے گھر کے کام کاج کی دیکھ بھال اور بال بچوں کی پرورش اور نگہداشت رکھی ہے۔ چنانچہ اسی لحاظ سے ان کے کام بھی معین کئے ہیں۔ اور ان میں نہایت اعلیٰ درجے کی مساوات اور ہمسری قایم رکھی ہے۔ لیکن ہاں چونکہ ان کو ایک دوسرے کے کام میں مداخلت اور دست اندازی کی کچھ ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی اس لئے ان کے باہمی خلاملا کو ان کے تزکیۂ نفس اور حفظ ناموس کے خیال سے جائز نہیں رکھا۔ پردے کا اصلی منشا پاکدامنی ہے۔ اس لئے فی الواقع اسکی تاکید عورتوں سے پہلے مردوں پر کی گئی ہے۔ ارشاد پاک ہے کہ۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ	اے نبی تو مسلمان مردوں سے کہدے کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور پاکدامن رہیں۔ یہ

بچشم خود دیکھ آئے ہیں۔ وہاں حالت اب اس درجے کو پہنچ چکی ہے کہ لوگ سرے سے عصمت و عفت کے صفت حسنہ ہونے ہی پر بحث کرنے لگے ہیں۔ اور اکثر اہل الرائے کا یہ خیال ہو چلا ہے کہ یہ ایک بے معنی اور غیر ضروری قید ہے۔ جو بلاوجہ آزادی میں مخل اور حارج ہے۔ یہاں اس بحث کو چھیڑنے کا موقعہ نہیں ہے۔ اور ہم ناظرین کی اجازت سے یہ فرض کئے لیتے ہیں کہ عصمت ایک اچھی چیز اور قابل قدر خوبی ہے۔ تو پھر جس مذہب کی اخلاقی حس اتنی قوی ہو کہ اس نے فعل زنا کو ہی جرم اور گناہ نہ ٹھہرایا ہو۔ بلکہ غیر عورت کو ایک اتفاقی نظر کے بعد دوبارہ نظر بھر کر دیکھنے کو بھی آنکھ کا گناہ قرار دیا ہو اور جس نے اعمال کو ہی نہیں بلکہ ارادوں اور نیتوں پر بھی مواخذہ کیا ہو۔ جس کا ارشاد یہ ہو کہ۔

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا (ع ۳ پ ۱۵)	بیشک کان اور آنکھ اور دل سب سے پوچھ گچھ ہوگی۔

وہ مذہب عورتوں کو مردوں کے گلے میں ہاتھ ڈال کر ناچنے اور مردوں کو نیم برہنہ اجنبی عورتوں کی کمر پکڑ سینہ بسینہ ولب بلب تھرکنے کی کیونکر اجازت دے سکتا تھا۔ اور اگر وہ ایسی بے حیائی اور بے حجابی کو جائز رکھتا تو اپنے اعلیٰ اخلاقی معیار کو کس طرح قایم رکھ سکتا تھا۔ پھر تو ہر ایک کو عذر صریح ہوتا کہ ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ای	باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

اس کے علاوہ آخر اس خلاملا کی ضرورت ہی کیا تھی کہ اسلام ان تمام

اگر کہیں نتائج کی عمدگی سے احکام کی خوبی پر استدلال ہو سکتا ہے تو یقیناً ہماری خواتین کی پاکدامنی اور پاکیزہ اخلاقی اس پریشان حالی کے زمانے میں بھی عورتوں کے متعلق اسلام کے نہایت معقول اور مطابق فطرت قوانین کی قطعی اور عینی شہادت ہے۔ ع

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

وہ لوگ جن کے نزدیک مساوات کے معنی یہ ہی ہیں کہ ان کی خواتین بھی ان کے ساتھ کارخانوں میں کام کریں۔ یا ڈاکئے اور چوکیدار اور چپراسی اور محرر کی قابل فخر خدمات انجام دیں وہ اس عزت واحترام کا کیا تصور کر سکتے ہیں جو ہر ایک سچے اور پکے مسلمان کے دل میں اس کی پیاری بیوی یا اس کی مقدس ماں کی ہے۔ اسے اپنے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد یاد ہے کہ

اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُہُمْ خُلُقًا۔ وَاَلْطَفُہُمْ بِاَھْلِہٖ (ترمذی)	بلحاظ ایمان سب مسلمانوں میں کامل وہ ہے جو خوش خلقی میں سب سے بڑھا ہوا اور اپنے گھر والوں کے ساتھ نہایت نرم اور نیک خو ہو۔

اور اس کا پختہ عقیدہ ہے کہ۔

اَلْجَنَّۃُ تَحْتَ اَقْدَامِ اُمَّھَاتِکُمْ۔	جنت تمہاری ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے یعنی یہ انکی فرمانبرداری اور اطاعت گزاری کا صلہ ہے۔

ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ - وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ - الآية (ع ۳ پ ۱۸)

ان کے لئے زیادہ پاکیزہ ہے - اور وہ جو کچھ کرتے ہیں اللہ اسے جانتا ہے - اور تو مسلمان عورتوں سے بھی کہدے کہ وہ اپنی نظریں نیچے رکھیں اور پاکدامن رہیں اور اپنے زینت کے مقامات کو دکھاتی نہ پھریں - سوائے اسکے کہ جو مجبوراً کھلا رہتا ہو - اور سینوں پر دوپٹوں کے بکل مارے رہیں

پردے کے یہ احکام تو یقیناً بہت ہی نرم ہیں - اور کسی طرح بھی ان سے عورتوں کی تذلیل و توہین مستنبط نہیں ہو سکتی - نہ اس سے ان کی آزادی میں خلل آتا ہے - نہ ان کا مردوں سے دعوی ہمسری ٹوٹتا ہے - پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلام پر ناکردہ گناہ کیوں یہ اتہام لگایا جاتا ہے - سچ یہ ہے کہ اس گئی گذری حالت میں بھی جو عزت عورتوں کو مسلمان گھروں میں حاصل ہے - یورپ اور امریکہ اپنے سارے ادعائے مساوات و انصاف کے باوجود بھی اس کی نظیر نہیں دکھا سکتا - اب بھی ہمارے ہاں بیویاں گھروں کی مالک و مختار رہتی ہیں - اور انہی کا مبارک اور پاکیزہ اثر ہے - جس نے ابتک ہمکو عقائد و احکام مذہب سے بالکل بیگانہ ہونے سے بچا رکھا ہے کیونکہ خدا کا شکر ہے کہ کفر و الحاد کی سموم مسموم ابھی تک ہمارے گھروں کی چار دیواری میں گھس کر ان حجلہ نشینان عفت اور گوشہ گزینان عصمت کے پاک دامنوں کو غبار آلود نہیں کر سکی -

اسکی بجا آوری سے وہ پہلوتہی نہیں کر سکتیں اور ان کو طوعاً و کرہاً یہ فرض ادا کرنا پڑتا ہے۔ اگر مردوں کا کام بٹا لینے سے کم سے کم اسی ایک معاملے میں ان کی مشکلات کچھ کم ہوجاتیں تو خیر ہم سمجھتے کہ اتنی محنت کا کچھ عوضہ مل گیا۔ مگر یہ مصیبت تو بدستور رہتی ہے۔ ہاں آزادی کے صدقے میں اتنا اور ہوتا ہے کہ وہ پرورش اولاد کی اس سچی خوشی سے بھی محروم رہجاتی ہیں جسے حقیقت میں قدرت نے ماں کی ساری جانکاہ محنتوں کا اصلی صلہ بنایا ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ جو عورت کارزار ہستی میں مردوں کی صف میں جگہہ لیگی اور حصول معاش میں ان سے بے نیاز رہنا چاہے گی۔ اسے بچوں کی پرداخت اور گھر بار کے جھگڑوں میں پڑنے کی فرصت کہاں۔ بلکہ گمان غالب تو یہ ہے کہ چونکہ وہ نہ تو مرد کی حوائج خانہ داری کو پورا کر سکتی ہے۔ نہ اپنی آزادی اور مساوات کو شادی کی پابندی پر قربان کرنا چاہتی ہے۔ اس لئے شاید اسے وہ دلی مسرت اور حقیقی راحت کبھی نصیب ہی نہو جو زنانہ تمناؤں کی معراج کمال اور نسوانی زندگی کی غایت الآمال ہے۔ انہی خیالات کا نتیجہ ہے کہ اب گھر کو علی العموم حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور بقول مسٹر برنارڈ شا "گھر لڑکی کا زندان اور عورت کا دارالمحن ہے"[1] لیکن یہ بھی قدرت نے اس کو اتنا دلچسپ بنایا ہے کہ اب یہ آزاد اور روشن خیال خواتین مغرب کی زندگی کا سب سے زیادہ اہم مسئلہ اسی زندان اور

[1] ماخوذ از "ماڈرن میرج"

وہ یہ بھی نہیں سمجھتے کہ پردے کی شدت اکثر و بیشتر جوشِ حمیت اور فرداً عصمت کی دلیل ہوتی ہے۔ ۵

باسایہ ترا نمی پسندم	عشقست و ہزار بدگمانی

بلکہ ہم کو تو اس پر تعجب ہوتا ہے۔ کہ اہلِ مغرب میں زن و شوہر کی وہ محبت کس تماشے کی ہے۔ جس میں رقابت کو مطلق دخل نہیں ہے۔ البتہ تو قرینِ قیاس ہے کہ جہاں عفت و عصمت کا وجود ہی موہوم سمجھا جانے لگے۔ وہاں غیرت و حمیت کا معدوم ہو جانا لازمی اور ظاہری ہے۔ ا ان لوگوں کے نکتۂ خیال سے پردے کا مکروہ و معیوب ہونا بھی بالکل بجا اور درست ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ وہاں کی عورتوں کو اس آزادی سے فائدہ کیا ہوا؟ کیا محض سوسائٹی میں شرکت اور مردوں سے بے حجابا ملاقات اور بیباکانہ مکالمت اس تمام جسمانی تکان اور دماغی کوفت کی تلافی کر دیتی ہے جو کسبِ معاش کے میدان میں مردوں کے مقابلے میں کشاکشی سے ان کو برداشت کرنی پڑتی ہے۔ اور ان ساری خانگی خوشیوں اور کنبہ داری کی مسرتوں کا نعم البدل بن جاتی ہے۔ جن کو وہ اس آزادی اور برابری کے نام پر قربان کر دیتی ہیں۔ اور پھر وہ آزادی اور برابری ہی کیا ہے؟ وہ خواہ گھر کی چار دیواری میں ملکہ بن کر رہیں اور اس چھوٹی سی سلطنت کا انتظام کریں۔ یا اس کی تنگنائی سے تنگ آ کر گلی کوچوں میں گشت لگائیں اور خود اپنی قوت بازو سے کسب معاش کریں۔ بہر حال قدرت نے ابقائے نسل کی جو خدمت ان کے سپرد کی

معاشرت کی غلطیوں کو ایک حد تک سنبھال بھی لیا ہے۔ اور تمول اور دولت نے ان دل شکن ناکامیوں اور شرمناک بداعمالیوں[۱] کو کسی قدر چھپا بھی رکھا ہے۔ جو اس طرز تمدن کا لازمی نتیجہ ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی مفلس اور نادار قوم میں اس پردہ داری کا جو نتیجہ ہو گا اس کو خدا ہی خوب جانتا ہے۔ لسان العصر اکبر نے خوب کہا ہے ؎

نہ یہ قید شریعت ہے نہ یہ غفلت کا پردا ہے	رواج و مصلحت کی بات ہے حکمت کا پردا ہے
تمہیں دھوکے میں ڈالا ہے مثال اہل یورپ نے	ادھر سایہ حکومت کا ہے یہاں غیرت کا پردا ہے

ہمنے جو کچھ کہا ہے وہ اس قدر بدیہی ہے کہ اس کے لئے کسی تصدیق اور تائید کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ مگر پھر بھی اس احتمال سے کہ شائد

[۱] اسی کتاب "ماڈرن میرج" میں جس کا حوالہ میں نے اوپر دیا ہے ایک جگہ (حصہ سوم باب ۳ صفحہ ۱۴۲) لکھا ہے کہ "سنہ ۱۹۰۵ء میں صرف انگلینڈ اور ویلز میں ۳۷ ہزار ۳ سو بچے ناجائز تعلق کا نتیجہ تھے" یہ تو وہ تعداد تھی جو ظاہر کر دی گئی۔ حقیقت میں تو معلوم نہیں ایسے بچے وہاں ہر سال کتنے ہوتے ہونگے۔ چنانچہ اسی کثرت کی بنا پر کتاب مذکور کی مصنفہ گناہ کے ان ناکردہ گناہ نتائج کے ساتھ سوسائٹی کی عام بدسلوکی کی شکایت کرتی ہے اور درخواست کرتی ہے کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ اولاد زنا کو بھی جائز اولاد سے ادنی درجہ کا نہ سمجھا جائے اور اوسکے ساتھ بھی زیادہ وسعت نظر اور فراخ حوصلگی سے برتاؤ کیا جائے"

دار المحن کو پانے کی کوشش ہے جس سے نکل بھاگنا ابھی چند سال قبل ان کی ساری آزادی اور روشن خیالی کا نصب العین تھا۔ آہ افسوس ہے اس قوم پر جس کی عورتوں کو محض ظاہری برابری اور نمائشی آزادی حاصل کرنے کے واسطے اتنی گراں قیمت دینی پڑی ہو۔ اور اس سے ہزار گنا زیادہ افسوس ہے اس قوم پر جو اس ظاہری برابری اور نمائشی آزادی کے لئے اپنے سچے مذہب کے نہایت ہی معقول اور منصفانہ اصول کو چھوڑنے پر آمادہ ہو۔ الاساءَ مَا یَحکُمُونَ کیا یہی ہے وہ تہذیب و تمدن جس کے ہم اتنے گرویدہ ہو رہے ہیں۔ کیا اسی مساوات اور حریت کے اعلیٰ رتبہ پر ہم اپنی مستورات کو بھی پہنچانا چاہتے ہیں ؎

نزد ما حیف ست گو تر دز لیخا میں باش | جذبہ کز چاہ یوسف را بہ بازار آورد

اہل یورپ اگر حرم کے نام پر ناک بھوں چڑھائیں تو بجا ہے کیونکہ اسلام کے احکام اور پردے کی سختی نے نہیں بلکہ خود ہماری بے عنوانیوں نے اس معزز اور محترم شئے کی نہایت بدنما تصویر ان کے سامنے پیش کی ہے۔ لیکن وہ لوگ جو ان کے مقدس مفہوم کو سمجھتے اور صحیح معنوں کو جانتے ہیں۔ اگر وہ اوسکی محفوظ اور پر اطمینان زندگانی پر مغربی معاشرت کے گرداب سرگردانی کو ترجیح دیں تو ان کے لئے اس کورانہ تقلید کا کچھ عذر نہیں ہے۔ اور اگر مساعدت زمانہ سے ان کی کوششیں بار آور ہوگئیں تو آیندہ نسلوں کی دقتوں اور پریشانیوں کا وبال انہی کی گردنوں پر ہوگا۔ کیونکہ یہ یقینی بات ہے کہ یورپ میں تو حکومت اور طاقت نے

کا مبنیٰ اور موقوف علیہ سمجھے ہوئے ہیں حقیقت میں مسلمان مستورات کے اطمینان و عافیت کے حق میں نہایت ہی مضر اور مہلک ہے چنانچہ آخر میں سارے یورپ کی سیر اور تجربے کے بعد ایک جگہہ وہ لکھتی ہے کہ "اگر ہمارے مشرقی ملک بھی ایک دن ایسے ہی ہو جائیں۔ اگر ان میں بھی یوریین تہذیب کے ساتھ اس کے وہ ساری عیوب و نقائص آجائیں جن سے یہ تہذیب چھدری پڑی ہے تو ان کے ہونے سے نہ ہونا اچھا ہے۔ اور بہتر ہے کہ وہ آج ہی مٹ جائیں" اس شہادت کے بعد شائد میرا مذکورہ بالا قول محض تعصب و سخن پروری پر محمول نہ کیا جائے۔

آخر میں ہمیں صرف اتنا اور کہنا ہے کہ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ یوریین معاشرت کی یہ ساری مشکلات محض بے پردگی کا نتیجہ ہیں۔ اور چونکہ وہاں تو ابتدا سے پردہ کا رواج ہی بہت کم رہا ہے اس لئے وہاں ناگہانی تغیرات سے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اس کے برخلاف جہاں فی الحال پردہ قایم ہے وہاں اب اس کو توڑ دینے سے شروع میں ایک دو پشتوں تک جو دشواریاں اور جو ناخوش آیند واقعات پیش آئیں گے ان کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور ان کے بعد پھر وہ دقتیں تو حل کرنی ہی ہوں گی۔ جو اس وقت مغربی تمدن کو متزلزل کئے ہوئے ہیں۔ اِس لئے اِن مسائل کو سرسری طور پر یہ کہکر ٹال دینا ٹھیک نہیں کہ ان خرابیوں میں بے پردگی کو کچھہ دخل نہیں ہے۔ یا یہ کہ

ملہ۔ ملاحظہ ہو کتاب مذکور کا صفحہ ۲۲۷۔

بعض اصحاب ان خیالات کو ہماری تنگ نظری اور عصبیت کا نتیجہ سمجھیں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم انکا استشہاد کسی ایسے قول سے کریں جس پر یہ الزام قطعاً کسی طرح عائد ہی نہ ہوسکے۔ دو ترکی عورتیں (لیکن ان کو ترکی کیوں کر کہہ سکتے ہیں جبکہ ان کی رگوں میں نصف سے زیادہ فرنچ خون تھا اور جن کو یورپین تعلیم نے اسلامی رسم ورواج سے اور بھی زیادہ متنفر کر دیا تھا۔) سلطان عبدالحمید خاں ثانی کی زیادتی اور حرم کے پردے کی سختی سے تنگ آکر قسطنطنیہ سے نکل بھاگیں اور یورپ کے سایۂ امن میں پناہ لی وہاں انہوں نے اپنی مطلوبہ آزادی اور مرغوبہ مطلق العنانی کا اسوقت تک خوب لطف اٹھایا جب تک کہ ان کے والد کی مالی اعانت سے جو ان کی اس گریز پائی اور احسان فراموشی کے بعد بھی بدستور جاری تھی ان کو افکار دنیا سے بالکل محفوظ رکھا۔ اور یورپین تہذیب کا صرف روشن رخ ان کے پیش نظر رہا۔ مگر جب موت نے ان کے اس دروازۂ رزق کو بند کر دیا تو پھر ان کو اسلامی اور مسیحی اخلاق کا فرق اور مشرقی اور مغربی تہذیب کا تفاوت معلوم ہوا۔ اور چند ہی دن کے تلخ تجربے نے ان سے اس بات کا تحریری اقبال کرالیا کہ وہ یورپین آزادی جو آج کل کی ترکی عورتوں کی نصب العین بنی ہوئی ہے۔ اور جس کو بھی خواہان ملک اپنی قومی ترقی

لہ یہ مضمون زینب خانم کے ان خطوط کا ملخص ہے۔ جو انگریزی میں "ایک ترکی خاتون کے یوروپین اثرات" کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔

قانون ازدواج

رسم پردہ کی بابت تو ہم کو جو کچھ کہنا تھا ہم گزشتہ باب میں لکھ چکے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ تعدد ازدواج اور طلاق کے اسلامی احکام کہاں تک قابل اعتراض ہیں۔ مخالفین نے اسلام کے مقرر کردہ قانون ازدواج پر بھی بہت کچھ لے دے کی ہے۔ یہاں تک کہ خود مسلمانوں کو بھی یہ سمجھانا چاہا ہے کہ ان کے ہاں کی رسوم تعدد ازدواج و نکاح و طلاق وغیرہ میں صنف نازک کی۔ اسرتذلیل و توہین ہوتی ہے۔ اگرچہ حقیقت میں یہ اعتراض انجیل مقدس کے اس فقرہ کی تصدیق کرتے ہیں کہ آدمی دوسرے کی آنکھ کا تنکا دیکھتا ہے۔ مگر اسے اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔" لیکن چونکہ تعلق ازدواج تمام معاشرت اور تمدن کا سرچشمہ اور منبع ہے اس لئے رعایت حقوق کے ضمن میں اس مبداء حقوق و فرائض کے متعلق بھی اتنا دیکھ لینا ضروری ہے۔ کہ اسلام نے اس کے لئے جو احکام نافذ فرمائے ہیں وہ کس قدر سنجیدہ اور معقول ہیں۔ اور ان پر مخالفوں کے اعتراض کتنے بیہودہ اور فضول ہیں۔

تعلقات زناشوئی کی ابتدا تو شاید ہبوط آدم کے ساتھ ساتھ ہی ہوئی ہو۔ لیکن رسوم ازدواج اس کے بہت دن بعد پیدا ہوئیں۔ اور ان میں امتداد زمانہ و اقتضائے حالات کے ساتھ ساتھ تغیر و تبدل بھی بہت

آہستہ آہستہ زمانہ انکی خود ہی اصلاح کرے گا۔ بلکہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس مہلکے کی طرف قدم اُٹھانے سے پہلے ان عواقب پر بھی اچھی طرح غور کریں جن کا عبرت ناک سبق ہم کو یورپ کا موجودہ تمدنی اضطراب اتنی صراحت ووضاحت سے دے رہا ہے۔ مگر ع۔

گوشِ سخن شنو کجا۔ دیدۂ اعتبار کو

اسی کے ساتھ یہ بھی تھا کہ کہیں ایک عورت کا متعدد مردوں کے ساتھ رہنا جائز تھا کہیں ایک مرد کئی کئی عورتیں رکھ سکتا تھا۔ اور کہیں کہیں یا ایک مرد اور ایک ہی عورت ہونے کی قید تھی۔ اور یہی صورتیں کم و بیش اب بھی دنیا میں جاری ہیں فرق صرف اتنا ہوا ہے کہ مختلف تمدنوں کے باہمی تصادم سے جو رسمیں کثرت رائے سے زیادہ معیوب اور مکروہ ثابت ہوئیں۔ وہ کم ہوتی گئیں۔ اور ایسے کونوں میں چھپ گئیں جہاں وہ بیرونی دنیا کی انگشت نمائی سے محفوظ ہو گئیں۔

یہ ہے ارتقائے رسم ازدواج کا ایک نہایت ہی مختصر سا خاکہ۔ اور اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ اسلام کا طریقۂ نکاح اور احکام ازدواج کیا ہیں اور بلحاظ مدارج ارتقا کس درجے کے ہیں۔

اسلام جس طرح اور تمام لایعنی رسموں سے پاک ہے اسی طرح اس کے مطابق تعلقات زناشوئی قایم کرنے کے لئے بھی کسی خاص اور پیچیدہ رسم کی ضرورت نہیں ہے۔ مسلمانوں میں ازدواج کا اصل اصول نکاح ہے۔ اپنی اصلی اور سادہ صورت میں نکاح ایک بالغ مرد اور عورت کے باہمی ایجاب و قبول یعنی ایک دوسرے کے ساتھ بلا تعین مدت تک رہنے کے معاہدے کا نام ہے۔ اور اس معاہدے کی تکمیل کے لئے صرف فریقین کی باہمی رضامندی رقم مہر کی تعین اور دو گواہوں کی شہادت کی ضرورت ہے۔ اور کسی قسم کی رسم ادا ہونے کی حاجت نہیں۔ صرف انہی دو بول میں دو غیر اجنبی آدمیوں میں وہ گہرا لگاؤ ہو جاتا ہے۔ دونوں کا

کچھ ہوا۔

اکثر ملکوں میں بہت دن تک بلکہ کہیں کہیں اب تک عورت مختلف طریقوں سے اپنے آیندہ شوہر کے ہاتھ بیچدی جاتی تھی۔گو قیمت کی ادائیگی وقتاً فوقتاً جدا جدا صورتوں سے ہوتی تھی۔مگر اس تمام ظاہری فرق کے باوجود بھی نفس الامر میں عورت کے اولیا اور اس کے آیندہ شوہر کے مابین یہ محض بیع وشرا کا ایک معاملہ ہوتا تھا (بعض کوتاہ بینوں نے زر مہر کو بھی عورت کی قیمت سمجھ کر اسلامی نکاح کو بھی اسی قسم کا ایک سودا قرار دیا ہے۔لیکن یہ ان کی صریح غلطی ہے۔ہم آگے چلکر اس پر بحث کریں گے۔) کہیں عورتیں زبردستی چھین کر لیجائی جاتی تھیں اور اگرچہ لڑائی کی نوعیت مختلف ہوتی تھی۔مگر بہرحال اس میں مرد کا عورت پر تحکم اور تسلط ضرور مد نظر ہوتا تھا۔اور گو بعد میں یہ محض ایک رسم بن گئی مگر اس میں شک نہیں کہ یہ اس زمانہ کی یادگار تھی جبکہ حقیقت میں عورتیں قتل وخونریزی کے بعد لڑائی ہی میں ہاتھ آتی ہونگی۔اسیران جنگ کو لونڈی غلام بنانے کا رواج جو اسلام میں بھی جاری رہا۔اسی کی ایک صورت تھا۔اور یورپ کے قرون وسطی کا یہ قاعدہ بھی اسی کی یادگار تھا کہ جب کسی خاتون کے بہت سے خواستگار ہوتے تھے۔تو ان میں سے جو شخص اپنے سب حریفوں کو زیر کرکے معرکۂ شہسواری کا یکہ تاز ثابت ہو وہی اس انعام مجسم کا مستحق ہو۔کہیں شروع ہی سے اس تعلق میں ایک تمدنی معاہدے کا رنگ اور ایک مذہبی وابستگی کی جھلک آگئی تھی

جان ڈال دی ہے۔ اور معمولی سے معمولی روزمرہ کے معاملوں سے لیکر اہم سے اہم ملکی اور سیاسی معاہدوں تک ہر ایک عہد و پیمان کو مذہبی تقدس کی شان دیدی ہے۔

لیکن خیر ہم نے مان لیا کہ نکاح مذہبی نہیں تمدنی معاہدہ ہی سہی تو اسمیں قباحت ہی کونسی ہے۔ آخر ازدواج بھی تو ایک تمدنی تعلق ہی ہے۔ مذہبی معاملہ تو ہے ہی نہیں۔ تو پھر اگر اس کا معاہدہ تمدنی ہے تو کیا نقصان ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس تعلق کا اعلان ہوجائے تاکہ کسی کو مغالطہ نہ ہو۔ اس کے لئے گواہوں کی موجودگی ضروری کردی گئی اور کہدیا گیا کہ اگر یہ کارخیر مسجد میں ہو تو اور بھی بہتر ہے تاکہ اعلان زیادہ عام ہوجائے۔ اب رہا مہر کا جھگڑا۔ کہتے ہیں کہ رقم مہر عورت کی قیمت ہے اور یوں گویا بیوی کا درجہ باندی کے برابر ہوجاتا ہے۔ یہ سراسر کج فہمی ہے حقیقت میں مہر ایک ذریعہ ہے عورت کی آزادی کا کہ وہ محض اپنے شوہر کی دست نگر نہ رہے۔ اور اس کے پاس ایک طرح کا سرمایہ ہو۔ نقد یا موجل۔ نقد ہو تو سب سے بہتر۔ ورنہ کم سے کم شوہر اوس کا مقروض تو رہے گا۔ اور اگر اسے ضرورت ہو تو وہ جب چاہے اس سے لے سکتی ہے اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی اختیار ہے کہ یہ قرض معاف کردے اور یہ یقیناً اس کا احسان ہوگا۔ لیکن رقم مہر کے زرثمن نہ ہونے کی قطعی دلیل یہ ہے کہ عورت مہر لینے کے بعد بھی ہر حال میں اور ہمیشہ اپنی مرضی کے خلاف اس مرد کے پاس رہنے پر مجبور نہیں ہوجاتی۔ اسی خلاف طبع

ایک کر دیا۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ | وہ تمہاری پوشش ہیں اور تم اون کی پوشاک ہو

اس لئے بعض نکتہ چین کہتے ہیں کہ اسلام میں شادی کوئی مذہبی معاملہ نہیں ہے بلکہ محض ایک معاشرتی معاہدہ ہے۔ بلاشبہ اس لحاظ سے تو یہ قول بالکل درست ہے کہ اسلامی نکاح کی تکمیل کے لئے نہ تو یہ امر ضروری ہے کہ دولھا دلھن پہلے سے اجازت لیکر کسی گرجا میں جائیں اور وہاں کوئی ستر یافتہ پادری ان دونوں کے ہاتھ ملائے۔ اور نہ یہ بات لازمی ہے کہ کوئی پنڈت خاص خاص اشلوک اور مقررہ منتر پڑھ کر دولھا دلھن کو ایک دوسرے کے گرد پھیرے دے۔ لیکن اگر پادری یا پنڈت کی وجہ سے ہی غیر اسلامی شادیوں میں مذہبی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اسلامی نکاح اس سے محروم رہجاتا ہے۔ تو یوں تو سرے سے اسلام کی کوئی بات بھی مذہبی بات نہ رہے گی۔ کیونکہ اسلام وہ مذہب ہے جس نے خدا اور اوس کے بندوں کے درمیان میں سے خودی کے سوا اور سارے پردے اور تمام واسطے اُٹھا دئے ہیں۔ لیکن حقیقت میں معترض کا نکتہ خیال ہی غلط ہے۔ بے شک نکاح کے لئے قاضی کا ہونا لازمی نہیں ہے لیکن اسلام نے ایک بار

اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا۔ | بیشک معاہدوں کی بابت پوچھا جائے گا کہ کہاں تک ان کی ایفا اور پابندی کی گئی۔

کا اعلان عام نافذ فرما کر قیامت تک اپنے ہر ایک شیدائی کے قول میں

مگر بیع و شری کا کچھ تعلق نہیں ہے - اور اس رقم کی ادائیگی سے عورت کی تذلیل ہونے کی بجائے اس کی اور بھی توقیر ہو جاتی ہے - اس میں مذہبی تقدس ہے مگر وہ مذہبی الجھن اور پیچیدگی نہیں ہے - جس سے بیجا رکاوٹیں اور بیکار دقتیں پیدا ہوں - اور کسی قسم کا مفید نتیجہ نہ نکلے۔

لیکن معترض کا بڑا اعتراض اسلام کی عطا کردہ اجازت طلاق پر ہے - غیر مذہب والوں کو بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام جس بے تکلفی اور آزادی سے نکاح کی گرہ لگا دیتا ہے - ویسی ہی لاپرواہی اور آسانی سے اسے کھول بھی دیتا ہے - مگر یہ ان کی غلطی ہے - بے شک یہ سچ ہے کہ اسلام نے طلاق کی اجازت دی ہے اور طلاق کا مدار صرف مرد کی زبان پر رکھا ہے جس کے لئے نہ قرار داد جرم کی ضرورت ہے - نہ ثبوت کی حاجت ہے - نہ گواہ طلب ہوتا ہے - نہ قاضی بلایا جاتا ہے - یہاں تک کہ پھر اسکی کوئی اپیل - کوئی استغاثہ تک نہیں ہے - اس کے برخلاف اور بڑے بڑے مذہبوں میں بالعموم تعلق زناشوئی کا انقطاع ممکن نہیں ہے تاوقتیکہ مقراض اجل ایک دوسرے کو جدا نہ کرے - یہودیوں میں طلاق کی اجازت تھی مگر حضرت عیسیٰؑ نے اسے بڑی سختی سے روک دیا - اور ایک جرم زنا کے سوا اور کسی وجہ سے طلاق دینے کی قطعی ممانعت فرما دی - اور مطلقہ عورت کے ساتھ نکاح کرنے کو بھی حرام ٹھہرا دیا - اسی طرح ہندوؤں میں بھی طلاق ممکن نہیں ہے - یہی وجہ ہے کہ ان مذاہب کے پیروؤں کو اسلام کی اجازت طلاق بہت عجیب اور ہمارا رشتۂ نکاح بہت ضعیف معلوم ہوتا ہے -

واقعات پیش آنے پر خلع کرانے کا اختیار ہے۔ اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ مہر کے عوض اپنے شوہر کے ہاتھ بکی نہیں۔ بلکہ حقیقت میں یہ ضمانت ہے اسبات کی کہ شوہر کبھی اپنے حدود سے تجاوز نہ کرے۔ اس کے علاوہ اس کی ایک اور بھی دلیل ہے۔ ہر شخص کو اپنی خرید کردہ شئے کو بیچنے اور الگ کر دینے کا اختیار ہوتا ہے۔ پس اگر اسلام نے مہر کو عورت کی قیمت قرار دیا ہوتا۔ تو از روئے انصاف شوہر کو اپنی بیوی کے بھی کبھی بیچنے یا ہبہ کر دینے کا بھی اختیار ہوتا۔ لیکن استغفر اللہ اس سے بڑھکر مکروہ اور کیا بات ہوسکتی ہے۔ مہر ادا کر دینے سے تو اتنا بھی نہیں ہوا۔ کہ اسلام کے نزدیک مردوں کے حقوق عورتوں سے کچھ زیادہ ہو جائیں ارشاد ہوا تو یہی ہوا کہ۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ	اور جو حق مردوں کے عورتوں پر ہیں ویسے ہی عورتوں کے مردوں پر ہیں۔
ع ۲ پ	

بہر حال یوں ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی نکاح ازدواج کی مذکورہ بالا تینوں ارتقائی صورتوں سے افضل اور اعلیٰ ہے۔ اس میں عورت پر کسی طرح کا ظلم وجبر ممکن نہیں۔ کیونکہ رضامندی جانبین نکاح کی لازمی شرط ہے۔ البتہ بلاد اسلام میں ممالک یورپ سے کورٹ شپ کا دستور نہیں ہے۔ لیکن اسلام نے پردہ کے حکم کے باوجود بھی نکاح سے قبل فریقین کو ایک دوسرے کو دیکھ لینے کی اجازت دی ہے۔ اور بہر حال باہمی رضامندی کے بغیر تو نکاح ہو ہی نہیں سکتا۔ اس میں اگرچہ رقم مہر واجب الادا ہوتی ہے

اس کے ساتھ ہی جوشِ حمیت اور جذبۂ رقابت بھی معائدہ ازدواج کا بہت بڑا محافظ ہے۔ لیکن اگر کہیں خدانخواستہ ایسی صورتیں پیدا ہوجائیں کہ میاں بیوی کا ساتھ رہنا مشکل ہوجائے۔ اور ایسی صورتیں آئے دن پیش آتی رہتی ہیں۔ تو پھر کیا کیا جائے؟ اگر محبت کا طلائی رشتہ گلے میں پھانسی کا پھندا بنکر جان کا جنجال ہوجائے تو پھر تو اس سے گلوخلاصی کی کوئی نہ کوئی تدبیر ہونی چاہیئے۔ اسلام نے اس کا علاج طلاق تجویز کیا ہے اور جس طرح نکاح کو محض ایجاب و قبول پر منحصر رکھا تھا اسی طرح طلاق کو بھی صرف قول ہی پر موقوف رکھا ہے۔ اور یہ امر نہایت ہی معقول ہے کیونکہ جب ایک بار دلوں میں فرق آگیا تو پھر دونوں کو مار باندہ کر اکھٹا رکھنے کی کوشش بیکار ہے۔ اور انکی علیحدگی میں بیرونی دشواریاں اور دقتیں پیدا کردینے سے بجز اسکے کہ دلی رنجش اور کوفت اور بھی زیادہ بڑھے۔ اور کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا وہ اصحاب جو طلاق پر اعتراض کرتے ہیں۔ ذرا تاریخ اُٹھا کر دیکھیں یا اُن اقوام کے حالات پر غور کریں جن میں طلاق کا رواج نہیں ہے۔ اور بتائیں کہ آیا ان میں بھی ایسے ناگزیر واقعات پیش آجاتے ہیں یا نہیں جبکہ میاں بیوی ساتھ رہنے کی بجائے مرجانا پسند کرتے ہیں مگر کسی طرح اس صحبتِ ناموافق کے عذابِ الیم سے نجات نہیں پا سکتے ؎

غم نیست کہ مے میرم و مردن نتوانم		در کشور بیداد تو فرمان قضا نیست	

یورپ میں اگرچہ مذہبًا اور قانونًا اور رواجًا ہر طرح طلاق ناجائز ہے۔ مگر

اگرچہ حقیقت الامر یہ نہیں ہے -

یہ ظاہر ہے کہ زوجیت کا رشتہ اس قدر گہرا اور قریبی تعلق ہے کہ دنیا کا اور کوئی رشتہ اسکی برابری نہیں کرسکتا - اس کا تمامتر دارومدار صرف دلی الفت و محبت پر ہے اور یہ ایسی چیز ہے کہ جو نہ کسی تمدنی معاہدے سے پابند ہوسکتی ہے نہ کسی مذہبی قید میں جکڑی جاسکتی ہے ۵

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب	کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

اسی مصلحت کو مد نظر رکھکر اسلام میں ازدواج کا سارا انحصار باہمی خلوص و محبت پر رکھا ہے اور اسکی ترغیب و تحریص کے لئے خدا کی خوشنودی کو اسکا صلہ ٹھہرایا ہے - اس کے علاوہ فطرت کا رمز شناس یہ بھی جانتا ہے کہ عورت اور مرد میں ایک ایسی مقناطیسی کشش ہے کہ کوئی خاص اسباب ناموافقت و منافرت نہ ہوں تو طبعاً ان میں موانست اور دلبستگی پیدا ہوجاتی ہے اور یہ اللہ کی ایک بڑی مہربانی اور احسان ہے -

وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا وَجَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ؕ	اور خدا کی قدرت کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اسنے تمہارے لئے تمہاری ہم جنس بیبیاں پیدا کیں تاکہ تم کو ان سے راحت ملے اور تم میں باہم محبت و الفت ڈالی -

اور ارشاد نبوی ہے کہ

خِیَارُکُمْ خِیَارُکُمْ لِنِسَاءِکُمْ	تم میں سے اچھے وہی ہیں - جو اپنی عورتوں کے ساتھ اچھے ہیں -

اسے دیکھکر بھی مجھے بڑی مایوسی ہوئی - افسوس ہے کہ ان میں ایک دوسرے کو کس قدر بدنام اور رسوا کیا جاتا ہے - اور کیسے کیسے شرمناک الزام لگائے جاتے ہیں اور پھر ان میں کتنا روپیہ صرف ہوتا ہے - کتنا وقت ضایع ہوتا ہے اور کتنی پریشانی اور دوا دوش ہوتی ہے - اور یہ سب کچھ محض اتنی سی بات ثابت کرنے کے لئے کہ دو آدمی ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کے لئے مناسب نہیں ہیں - یہ کتنا دردناک ہے اور ہمارے سارے ایسے قانونوں سے کیا فائدہ جو ہماری مصیبتوں میں ہماری مدد کرنا تو کجا - اتنا بھی نہیں کرتے کہ اگر ہم ان تکلیفوں کو کچھ کم کرنا چاہیں تو کم سے کم ہم پر ذرا رحم تو کریں اور ہم کو معاف تو کردیں "

البتہ اگر طلاق کی اتنی آسانی سے مسلمان خاندانوں میں علی العموم ناچاقی اوسط سے زیادہ ہوتی - یا اس کے برخلاف طلاق کی دشواری کی وجہ سے دیگر اقوام میں زن و مرد کے باہمی تعلقات غیر معمولی طور پر زیادہ مسرت بخش ہوتے - تو ہم اسلام کے اس حکم کو قابل اعتراض سمجھتے - مگر واقعات اس کی تصدیق نہیں کرتے اور نہ از روئے قیاس ایسا ہونا چاہیئے کیونکہ قیاس یہ چاہتا ہے کہ جہاں عورت کو طلاق کا اور مرد کو خلع کا خوف ہوگا وہاں جب تک اختلاف اور ناموافقت کے قوی اسباب نہونگے تب تک عورت اور مرد دونوں اپنی اپنی طرف سے اس بات کا خیال رکھیں گے کہ حتی المقدور تفریق کی کوئی وجہ پیدا نہ ہو - اس کے برخلاف جہاں اس گتھی کا سلجھنا جیتے جی ممکن نہیں ہے وہاں موافقت کے لئے کوئی خاص

پھر بھی عدالتہائے طلاق کی گرم بازاری بے فکروں کے لئے قابل دید تماشا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ایسے دلی تعلقات کے بعد زن وشوہر میں تفریق حقیقت میں اہل حمیت کے لئے۔ بڑی غیرت کی بات ہے اور جن مذاہب نے طلاق کو جائز نہیں رکھا۔ ان کا نکتۂ خیال بھی یہی تھا اور یہی وجہ ہے کہ اسلام نے بھی اگرچہ طلاق کو جائز کیا ہے مگر ساتھ ہی ارشاد نبوی یہ بھی ہے کہ

اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَی اللّٰہِ الطَّلَاقِ۔	حلال چیزوں میں سے سب سے زیادہ مکروہ اور ناپسندیدہ چیز اللہ تعالیٰ کے نزدیک طلاق ہے۔

اس سے ہی یہ بات ثابت ہے کہ اسلام نے طلاق کی نہایت ہی مجبوری کی حالت میں آخری درجے کی تدبیر سمجھ کر اجازت دی ہے۔ جیسے جراح کسی لاعلاج مرض کی دوا قطع عضو تجویز کرے۔ حقیقت میں خانہ داری کی کل کا سیفٹی والو طلاق ہے اور اگر ذرا احتیاط سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ مسلمانوں میں بھی اس کا استعمال اسی اصول پر ہوتا ہے۔ اور طبقہ شرفا میں تو یقیناً اس کا رواج بہت کم ہے۔ مگر اس ضمن میں اسلام کی یہ آل اندیشی اور مصلحت بینی کس قدر قابل تعریف ہے کہ اسنے ان خانگی جھگڑوں کا مضحکہ عدالتوں میں اُڑنا روا نہ رکھا ۵

جذبۂ کز چاہ یوسف را بہ بازار آورد	نزد ما حیف ست گو نزد زلیخا میل باش

زینب خانم نے اپنی سیاحت یورپ میں ایک جگہ طلاق کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انگلستان میں طلاق کے مقدمات جس طریقہ پر طے کئے جاتے ہیں

بعض اصحاب نے اس اجازت صریح کی طرح طرح تاویلیں کرنی چاہی ہیں تاکہ یہ رسم جو بدقسمتی سے یورپ کے رواج کے مطابق نہیں ہے اگر مسلمانوں میں سے نہیں تو کم سے کم احکام اسلام ہی میں سے خارج ہو جائے۔ لیکن محض یورپ کی تقلید سے تو ایسا کرنے کی کوشش حقیقت میں انکار اسلام سے کم نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ چونکہ اس اجازت کے ساتھ ہی یہ بھی ارشاد باری ہے کہ

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ لَّا تَعُوْلُوْا۔	اور اگر تم کو یہ ڈر ہو کہ تم انصاف نہ کر سکو گے تو ایک ہی بی بی پر یا اپنی لونڈی پر قناعت کرو تاکہ تم بے انصافی نہ کر سکو۔

اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ تعدد ازدواج کی اجازت قابلیت انصاف پر موقوف ہے اور یہ ممکن نہیں چنانچہ خود کلام پاک ہی میں کچھ آگے چلکر یہ ارشاد صریح ہے کہ

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ	اور تم اگر چاہو بھی تو تم عورتوں میں پورا عدل تو کر نہیں سکتے لیکن کسی ایک ہی طرف بالکل مت جھک جاؤ اور اسے ادھر میں لٹکا ہوا نہ چھوڑ دو۔

اس لئے واقع میں اسلام نے ایک وقت میں ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ کیونکہ اِذَا فَاتَ الشَّرْطُ فَاتَ الْمَشْرُوْطُ ظاہر میں تو استدلال بہت معقول معلوم ہوتا ہے۔ مگر فی الحقیقت بالکل غلط ہے۔ اور

کوشش کرنا بھی چنداں ضروری نہیں ہے۔ اور جب کوئی ایک گرہ دل میں پڑی تو پھر اس صحبت ناموافق کو عمر بھر نباہنے کا خیال لطف و مراعات کی طرف راغب کرنے کی بجائے خود ایک سوہان روح ہو کر تعلقات کو اور بھی زیادہ ناخوشگوار کر دیتا ہے اور یوں معاملات کی اصلاح مشکل سے محال ہو جاتی ہے ع

ہوش میں آؤ کہیں جڑتے ہیں دل ٹوٹے ہوئے

ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے ہمکو تو سب سے زیادہ یہی صورت معقول معلوم ہوتی ہے جو اس معاملے میں اسلام نے اختیار کی ہے۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا اس سلسلے میں احکام اسلام پر ایک اور اعتراض کیا جاتا ہے اور وہ ایک وقت میں ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت پر ہے۔ یہاں تک کہ بعض مدعیانِ خرد نے تو اسلام کی تمام خوبیوں پر خاک ڈال کر اس کی اشاعت کا سبب ہی یہ قرار دیا ہے کہ اس میں کثرت ازدواج کو جائز رکھکر ہوس پرستی کا موقعہ دیا گیا ہے۔ سبحان اللہ اسمیں کلام نہیں کہ اسلام نے تعدد ازدواج کی اجازت دی ہے۔

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۔	تو تم دو دو تین تین چار چار عورتوں سے جو تم کو اچھی لگیں نکاح کرلو۔

اور اگرچہ آج کل ۔ کہ بقول شبلی مرحوم ؎

اب کہ ہر بات میں ہے شان تفرج پیدا ہیں شریعت کے مسائل بھی وہیں تک مقبول	اب کہ ہر رنگ میں یورپ کا نمایاں ہے شعار کہ جہاں تک انہیں معقول بتائیں اغیار

سے گویا بالکل ممانعت ہو جاتی تھی۔ اس لئے ان خاص ضرورتوں کو پیش نظر رکھکر تعدد ازدواج کی اجازت دیدی اور یوں فرمادیا کہ شرط انصاف جو اجازت تعدد ازدواج کے لئے لازم کی گئی تھی وہ تو کلی طور پر پوری ہونی ممکن نہیں ہے اور اجازت نہ ہونے میں بہت خرخشوں اور دقتوں کا احتمال ہے اس لئے کم سے کم اتنا تو ضرور ہو کہ ظلم کھلا تو کسی ایک بیوی کی حق تلفی نہ کیجائے اور آپس میں صلح اور اتفاق رہے۔ اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو خیر پھر آخری صورت یہی ہے کہ دونوں میں تفریق ہو جائے۔ تاکہ مزید ناچاقی سے عورت کی اور زیادہ حق تلفی نہ ہو۔ بہر حال یہ تو تمہیدی بحث تھی اور اس سے یہ مطلب تھا کہ جو اعتراض تعدد ازدواج پر کیا جاتا ہے اس کا جواب یہ نہیں ہے کہ سرے سے اسلام کی اس اجازت سے ہی انکار کر دیا جائے۔ نہیں بلکہ ہم کو اس اعتراض کا کوئی اور معقول جواب دینا چاہیئے۔ یا لاجواب ہونا چاہیئے۔

اعتراض یہ ہے کہ ایک وقت میں ایک مرد کی ایک سے زیادہ بیبیاں ہونا معیوب اور مکروہ ہے۔ اور جو قانون اسکی اجازت دیتا ہے وہ بھی غلط اور ناقابل قبول ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ امر محض رسم و رواج پر موقوف ہے۔ اور اس کا حسن و قبح صرف ایک نکتۂ خیال پر منحصر ہے۔ ہندوؤں میں تو تعدد ازدواج بالکل بلا قید عام طور پر جائز ہے اور انجیل میں اس کا کچھ ذکر ہی نہیں ہے۔ البتہ چونکہ مذہب مسیحیت کے ابتدائی بزرگ سرے سے شادی ہی کو نہایت مکروہ اور معیوب سمجھتے تھے۔ اور

اس میں تو کچھ شک ہی نہیں کہ یہ توجیہ گزری ہی صرف ان دماغوں میں ہے جو یورپ کی تعلیم کے نشے میں اتنے سرشار ہو گئے ہیں کہ اس کے مقرر کردہ حدود سے سرمو تجاوز نہیں کر سکتے۔ یقیناً ان سے پہلے بھی ایسے لوگ گزرے ہیں جنہوں نے کلام مجید پڑھا تھا اور جو عربی جانتے تھے اور اس کا مطلب سمجھ سکتے تھے اور جن کے دلوں میں اسلام کا اتنا خیال بھی تھا کہ وہ اس کے احکام کی خلاف ورزی کسی حال میں کرنا نہیں چاہتے تھے یہی نہیں بلکہ خود عہد رسالت ہی میں تعدد ازدواج کی ممانعت نہیں کی گئی اس لئے اب آیاتِ قرآنی کی یہ تاویل کرنا کسی اسلامی جوش پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن نہیں ہم کو گزشتہ طرز عمل اور ائمہ سابقہ کی تفسیروں کے صحیح تسلیم کر لینے کی ضرورت نہیں۔ ذرا غور سے دیکھئے تو وہی ارشاد باری جس سے مخالفین تعدد ازدواج شرط انصاف کے فوت ہو جانے سے ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی ممانعت مستنبط کرتے ہیں حقیقت میں اس کی تائید کرتا ہے۔ کیونکہ مذکورہ بالا آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے ظلم و زیادتی کے خوف سے ایک ہی شادی کرنے کو پسند فرمایا ہے۔ مگر چونکہ بہت سی صورتیں ایسی پیش آجاتی ہیں جبکہ ایک بیوی کے ہوتے ہوئے بھی دوسری شادی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً۔	پس اگر تم کو یہ ڈر ہے کہ تم انصاف نہ کر سکو گے تو ایک ہی بہتر ہے۔

ہیں - اور وہاں مجمع عام میں سر و سینہ برہنہ غیروں کے گلے میں ہاتھ ڈالکر ناچنا داخل ہنر ہے - اس نکتہ خیال میں مشرق و مغرب کا فرق ہے - ایک جگہہ تو یہ حالت ہے کہ ؎

زناز کی نہ تواند نہفت راز مرا | خیال بوسہ براں لب کے بے نشان ہو د

اور دوسری جگہہ یہ کیفیت ہے کہ ؎

تہذیب مغربی میں ہے بوسہ تلک معاف | اس سے اگر بڑھو تو شرارت کی بات ہے

اس ذکر سے میرا مقصود یورپ کی تہذیب و اخلاق پر طعن زنی نہیں ہے بلکہ صرف یہ دکہانا منظور ہے کہ جن دو جگہوں کے حالات میں اتنا تفاوت ہوگا کیا ان کی ضرورتوں میں کچہہ فرق نہ ہوگا ؟ مقتضائے قیاس تو یہی ہے کہ ہوگا اور ضرور ہوگا - بلا شبہ اسلام نے تعدد ازدواج کی اجازت دی لیکن صرف اجازت دی - حکم نہیں دیا - اور اجازت بہی ایک حدتک مشروط - اچہا تو پہر اس میں گناہ کیا کیا - کیا اس کی ضرورتیں پیش نہیں آتیں - ایک عام اور روزمرہ کی صورت تو یہی ہے کہ اولاد نہ ہو - انسان ہی میں نہیں بلکہ تمام حیوانات اور نباتات میں ازدیاد نسل کی طبعی خواہش قدرت نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے ودلیعت رکھی ہے - انسان میں اس خواہش کے طبعی ہونے کے علاوہ اور بہی بہت سے خیال اس کے محرک ہوتے ہیں - اسلام نے دوسری شادی کی اجازت دیکر اس کا علاج کر دیا ہے - ہندوؤں میں اس کے لئے نیوگ تجویز کیا ہے - مسیحیت کو تو ان دنیوی آلودگیوں سے سروکار ہی نہیں -

اُنھوں نے یہ خیال خود حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریم کی مثال لیکر خدا کی خوشنودی کو تجرد اور دوشیزگی پر ہی منحصر سمجھ رکھا تھا - اس لئے ظاہر ہے کہ ان کے مقلدوں میں تعدد ازدواج جتنا بُرا سمجھا جائے - کم ہے - بلکہ تعجب تو اس وقت ہوتا ہے - جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ "مذہب مسیحیت کے مشہور مجدد و مصلح لوتھر اور اس کے ساتھ بعض اور اہل الرائے نے انجیل کی خموشی اور توریت کی صریح اجازت کی بناپر تعدد ازدواج کو جائز کرنا چاہا تھا۵؎" بہرحال چونکہ یورپ کے تمام آئین اسی مذہبی قانون کے مطیع رہے - اس لئے وہاں ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرنا ایک قانونی جرم ہوگیا - اور امتداد زمانہ نے اہل فرنگ کو اس کا اتنا خوگر بنادیا کہ اب وہ اسے طبعاً مکروہ سمجھنے لگے - اور اسلام کی یہ اجازت ان کے نکتۂ خیال کے بالکل برخلاف ہوئی - حالانکہ حقیقت الامر یہ ہے کہ در پردہ ان میں کثرت ازدواج ہماری نسبت بہت زیادہ عام ہے اور اس میں ان کو اتنا آرام ہے کہ اب بالعموم وہ سرے سے شادی ہی کرنا نہیں چاہتے - اور اگر یہ ہی کیفیت رہی تو غالباً چند دن میں ایک شادی بھی معیوب ہوجائے گی - چنانچہ یہ تجویز تو اب بھی پیش ہے کہ شادی کی ترغیب دینے کے لئے مجردوں پر ایک خاص ٹکیس لگایا جائے تاکہ لوگ تجرید کی جانب زیادہ مائل نہ ہوں - ادہر عورتوں کی حالت دونو جگہہ اتنی متفاوت ہے کہ ہمارے ہاں اِن کے سر کے بال تک داخل ستر

۵؎ ملاحظہ ہو "دی ریجن آف دومین" مصنفہ جوزف میک کیب - باب پنجم -

بڑا زور رہا - مگر جو کچھ نتیجہ ہوا وہ ظاہر ہے - اور یہاں ہم کو ان شرمناک
سیاہ کاریوں کے ذکر سے روئے کاغذ سیاہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے -
جو مسیحیت کی آڑ اور رُہبانیت کے پردے میں صدیوں تک ہوتی رہیں -
حقیقت میں اسلام نے نہایت مصلحت بینی سے تعدد ازدواج کی اجازت
دی ہے زمانۂ جاہلیت میں بیویوں کی تعداد غیر محدود تھی جس کا جتنی جی
چاہتا تھا شادیاں کرتا چلا جاتا تھا - جس سے عورتوں کو طرح طرح کی مشکلات
کا سامنا ہوتا تھا - اسلام نے اس کی انتہائی تعداد معین کر دی اور چار سے زیادہ
بیویوں کا جمع کرنا حرام کر دیا - اور پھر اس میں بھی عدل و مساوات کو نہایت
ضروری اور تاکیدی شرط ٹھیرایا - اس کے ساتھ ہی مہر کو ایک طرف تو عورت
کی عزت اور خود مختاری کا ضامن کیا - اور دوسری طرف اسے کثرت ازدواج
میں حارج اور عمومیت طلاق میں مانع بنایا - اسلام کو انسانی طبیعت کا یہ راز
بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ جب تک میاں بیوی میں اخلاص اور اتفاق ہے
تب تک کوئی مرد بلا وجہ دوسری بیوی کا بار گراں اپنے اوپر لینا قبول نہیں
کرے گا - کیونکہ حالت تو یہ ہے کہ ایک ہی شادی کرنے کی ترغیب دینے کے
لئے اللہ تعالیٰ کو یہ بشارت دینی پڑی کہ

اِنْ یَّکُوْنُوْا فُقَرَآءَ یُغْنِہِمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ ؕ	اگر وہ غریب ہوں گے تو اللہ بوجہ نکاح ان کو اپنے فضل سے غنی کر دیگا -

اور غیر مسلم اقوام میں اب سلطنتوں کو اس کے لئے قانون بنانے کی ضرورت
پیش آئی - اور ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کے لئے تو تمول اور دولت کے

البتہ یورپ نے اس کا تدارک آزادی اور مطلق العنانی سے کیا ہے۔ کیونکہ اس کے ہوتے ہوئے ان کو خواہ مخواہ ایک اور بیوی کا بوجھ اپنے سر لینے کی مطلق حاجت نہیں رہتی۔ اور ان کی ساری ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں۔ اب اہل نظر دیکھ لیں کہ ان میں سے سب سے اچھی اور پاکیزہ صورت کونسی ہے۔ ورنہ ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم	چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

لیکن یہ تو تعدد ازدواج کی بہت سی ضرورتوں میں سے صرف ایک ضرورت ہے ممکن نہیں۔ بلکہ قرین قیاس ہے کہ خواہش اولاد کے علاوہ اور بھی ایسے اسباب ہوں جن کی وجہ سے آدمی کو ایک بیوی کی موجودگی میں بھی دوسری شادی کرنے کی ضرورت ہو۔ ممکن ہے کہ بیوی کمزوری یا بیماری کی وجہ سے ادائے وظائف زوجیت کے قابل نہ ہو۔ یا مرد باوجود ضبط نفس ایک بیوی پر قانع نہ ہو سکتا ہو تو پھر ان صورتوں میں وہ قانون کیا حکم دے گا۔ جس میں ایک طرف طلاق ناجائز اور دوسری طرف تعدد ازدواج حرام ہے۔ وہ یہی کر سکتا ہے کہ ان طبعی خواہشوں کو خلاف فطرت دبانے اور ضبط کرنے کی تاکید کرے لیکن واقعات شاہد ہیں کہ ع

حریف جوشش دریا نہیں خودداری ساحل

اور اس قدرتی سیلاب کو مصنوعی پشتوں سے روکنا کسی طرح ممکن نہیں ہے مسیحیت نے اپنی اور غلطیوں کے علاوہ اس خلاف فطرت بندش پر بھی اپنی ساری قوت صرف کی اور تقریباً ڈیڑھ ہزار برس تک رہبانیت کا

اور مجروحین کی شفایابی سے اس خوفناک تعداد میں کچھہ کمی ہو جائے لیکن پھر بھی ان لوگوں کی تعداد کچھہ کم نہیں ہے جو کارزار ہستی سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکے ہیں۔ وہ تو اپنی قوم اور ملک پر قربان ہو گئے۔ اور سچ یہ ہے کہ اچھے رہے مگر ہم یہ پوچھتے ہیں کہ یورپ کا قانون ازدواج ان کردروں تو خیر اور کمسن عورتوں کی قسمت کا کیا فیصلہ کرے گا۔ جن کے دل و دماغ ان جوان مرگوں کے نذر اجل ہو جانے کی وجہ سے جوش شباب اور فوج حسرت و یاس کی رزمگاہ بنے ہوئے ہیں۔ اور جن کو ان نوجوانوں پر گریۂ وزاری کرنے کے لئے علاوہ اپنی نوجوانی کا بھی ماتم کرنا ہے۔ کیونکہ اب ان کو قلت ذکور کی وجہ سے شوہر ملنا محال ہے ۵

فوج اندوہ و الم ٹوٹ پڑی دھوکی میں	آرزوئیں ہوئیں سب قتل بڑا رن کیسا

ممکن ہے کہ اللہ ان کے لئے بھی کوئی صورت نکالدے مگر مسیحیت کا سکوت اور یورپ کا قانون تو ان کو صرف ایک ہی راستہ بتاتا ہے اور اس راستے سے خدا بچائے۔

اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا ـــ	بیشک وہ کھلی ہوئی برائی۔ اور بہت ہی برا راستہ ہے۔

سوا اور بھی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن جب ایسی صورت آپڑے کہ مرد اسپر آمادہ ہی ہوجائے تو پھر پہلی بیوی سے مزید کشیدگی اور رنجش ہونے کے سبب سے اچھی روک یہی ہے کہ اسے بہ آسانی دوسری شادی کی اجازت دیجائے۔ کیونکہ ایسی حالت میں اسے اس سے روکنا ان دونوں کی زندگی خراب کرنا اور دونوں کو شیطان نفس کے حوالے کرنا ہے۔ ایسی ہی ضرورتوں کو پیش نظر رکھکر اسلام نے تعدد ازدواج کی اجازت دی ہے اور پھر اس اجازت کو ایسے طبعی اور قدرتی طریقے سے عام ہونے سے بچایا ہے کہ اگرچہ ظاہر میں کسی کو کوئی ممانعت نظر نہیں آتی۔ لیکن پھر بھی آج کم سے کم ۹۵ فیصدی گھروں میں ایک ہی ایک بیوی ہے۔ بلاشبہ اسلام ناقص اور نا تمام ہوتا اگر وہ بھی مسیحیت کی طرح معاملات زندگی کی ایسی صورتوں کی بابتہ ساکت رہتا۔ اور صرف چند عام اور موٹے موٹے اخلاقی اصول کی تاکید کو اپنا فرض منصب بنائے رکھتا۔ لیکن نہیں اس نے ایسا نہیں کیا اور نہ ایسا ہونا ممکن تھا۔ اسنے عبادات سے پہلے معاملات کو لیا۔ اور طبیعت انسانی کے ہر ایک پہلو پر غور کر کے اس کے مناسب ایسے معقول اور منصفانہ حکم صادر فرمائے کہ آج دنیا لاکھ کوشش کرتی ہے کہ ان میں اصلاح کرے۔ مگر نہیں کر سکتی یا یہ نہیں تو ان پر اعتراض ہی کرے مگر نہیں ہو سکتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ میں تقریبًا دو سال سے ایک ہولناک لڑائی کا تلاطم برپا ہے جس میں اب تک فریقین کے تقریبًا دو کروڑ نوجوان اور ہونہار مرد ضائع ہو چکے ہیں ممکن ہے کہ اسیران جنگ کی واپسی

تجارت میں حارج ہے - اور اسکی وجہ سے مسلمان مشترکہ سرمائے کی کمپنیاں قایم کرکے شاندار پیمانہ پر کوئی کام نہیں کر سکتے - یہ تو سچ ہے کہ آجکل تمام لین دین اور بیوپار کا مدار سود پر ہے - اور تجارتی دنیا کے سارے بڑے بڑے کام بنکوں کے ذریعہ سے ہوتے ہیں - اور اس میں بھی شک نہیں کہ اس میدان میں مسلمان دنیا کی ساری قوموں سے پیچھے ہیں - لیکن اس پستی کی اصلی وجہ ہماری خود غرضی - بدعہدی - اور نفس پرستی ہے - حرمت ربوا اور ممانعت سود نہیں ہے -

اس دعوے کی تصدیق کے لئے سب سے پہلے تو ہم کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ ربا کے ممنوع ہے کیا چیز؟ - ربوا کے لغوی معنے ایزادی اور بیشی کے ہیں اور عرف عام میں اس کا اطلاق اس بیشی پر کیا جاتا ہے جو کسی قرض دی ہوئی رقم پر لیجائے - اسلام نے اس قسم کی بیشی کو اپنے اصول و مقاصد کے منافی سمجھکر اس کے لینے کو ناجائز قرار دیا ہے - لیکن آخر یہ کیوں؟ غالباً اس لئے کہ اسلام کا سب سے بڑا اور اہم مقصد یہ تھا کہ اپنے تمام پیرووں کو اخوۃ مذہبی کے رشتے اور اتحاد قومی کی زنجیر میں جکڑ دے - اسی لئے ارشاد ہوا ہے کہ -

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ إِخْوَانًا (ع پ ۴)	اور تم سب اللہ کی رسی کو پکڑے رہو اور ایک دوسرے سے الگ مت ہو اور اللہ کی اس مہربانی کو یاد کرو جب تم باہم دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت

حرمت ربوا

مختصر طور پر تو ہم نے دیکھ ہی لیا کہ اسلام نے تمام دینوی معاملات کی ہی نہیں بلکہ ساری مذہبی نیکیوں کی بنیاد بھی عدل و انصاف پر رکھی ہے۔ اور ہر پہلو سے معاملہ کی صفائی کی بے انتہا تاکید کی ہے اور ہم اس کی توضیح کے لئے جتنی چاہیں مثالیں پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ باتیں عام اصول اخلاق میں شامل اور تقریباً تمام بڑے بڑے مذہبوں کے احکام میں داخل ہیں۔ اسلئے یہاں اس ضمن میں ہم خصوصیت کے ساتھ صرف ایک حکم کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ جو اسلام کے سوا اور کسی مذہب میں نہیں پایا جاتا۔ ہمارا مطلب حرمت ربوا سے ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوا اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً	اے ایمان والو دونا دون سود مت کھاؤ۔

اس حکم پر اخلاقی پہلو سے تو اعتراض ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ اس کی بناہی ایثار اور ہمدردی پر ہے۔ اس کے سوا سود لینے کو کوئی قوم خواہ کتنا ہی پسند کیوں نہ کرتی ہو لیکن سود دینا کسی کو بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اسلئے جہاں سود خواری جائز بھی ہے وہاں بھی یہ کچھ بہت زیادہ مستحسن فعل نہیں ہے۔ لیکن اس کے متعلق یہ غلط فہمی بہت عام ہے کہ یہ ممانعت ترقی

وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (ع ۳ پ) | اللہ تعالےٰ نے تجارت کو جائز اور سود خواری کو حرام کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ربوا کے حرام ہونے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ قرض دیتے وقت فریقین میں اسکی شرح وغیرہ مقرر ہوگئی ہو۔ کیونکہ مدیون کی مجبوری اور محتاجی کا سب سے زیادہ نازک وقت وہی ہوتا ہے اور اسکو اپنی ضرورت کی وجہ سے دائن کی ہر ایک شرط جبراً وقہراً ماننی پڑتی ہے۔ لیکن اگر اس وقت یہ باتیں طے نہیں ہوئیں تو بعد میں مدیون اپنی خوشی سے بطور اظہار احسانمندی وشکرگزاری اصل رقم سے جس قدر زیادہ دینا چاہے دیسکتا ہے۔ اور اس کے لینے میں مطلق کچھہ گناہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے انقطاع اخوۃ کا کچھہ اندیشہ نہیں رہتا۔ اور نہ اس صورت میں طمع زر سے اسلامی ہمدردی کے دب جانیکا احتمال پیدا ہوتا ہے۔ مگر یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ممکن ہے کہ جب کسی قسم کے مالی فائدے کی امید ہی نہ ہو تو لوگ سرے سے قرض دینا ہی بند کردیں اور یوں لوگوں کے بہت سے ایسے کام اٹکے رہجائیں جن کے مقابلے میں سود کا دینا زیادہ گراں نہ ہو۔ یہہ درست ہے۔

وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ | اور کچھہ نہ کچھہ بخل تو سب ہی کی طبیعتوں میں ہوتا ہے۔

ایسا ہونا بالکل قرین قیاس ہے۔ لیکن اس کے روکنے کے لئے اسلام نے اپنی ساری مذہبی طاقت صرف کردی ہے اور ہر ایک پہلو سے اس کا سدِ باب

	پیدا کردی اور تم اس کی عنایت سے بھائی بھائی ہو گئے۔

اور اس مقصد عالی میں اسلام کو اللہ کے لطف و کرم سے کامیابی بھی ایسی ہوئی کہ اسکی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ اور جو یقیناً اور کسی طریقہ سے حاصل ہونی ممکن نہ تھی۔

لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّا اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ اِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ط	اگر تو دنیا بھر کا مال و دولت خرچ کر دیتا تب بھی ان کے دلوں میں اُلفت پیدا نہ کر سکتا تھا۔ لیکن اللہ نے ان میں محبت ڈالدی بیشک وہ بڑی عزت والا اور بڑی حکمت والا ہے۔

ایسی حالت میں اسلام اس بات کو کیونکر روا رکھ سکتا تھا کہ اگر ایک صاحب دولت و ثروت بھائی اپنے کسی محتاج اور نادار بھائی کی کاربراری اور دستگیری کرے تو بہ طمع زر کرے۔ اور ادعائے اخوت کے باوجود بھی اس سے اپنی اصل رقم کے علاوہ سود کا متقاضی ہو۔ اور

اَحْسِنْ کَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَیْکَ	اور تو بھی دوسروں سے بھلائی کر جیسے اللہ نے تیرے ساتھ بھلائی کی ہے۔

کے فرمان واجب الاذعان کو بالکل بھول جائے ؎

خدا بہ مسند فرماند ہیش جا ندہد	کہ آشنا بود و داد آشنا نہ دہد

اس لئے یہ صاف اور صریح حکم ہو گیا۔ کہ

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ
اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَهُمْ بَلْ هُوَ
شَرٌّ لَهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ
يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ
السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ
بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ —
(ع ۱۸ پ ۴)

اور جو لوگ اللہ کے دئے ہوئے مال و دولت
میں بخل کرتے ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ بخل ان
کے لئے اچھا ہے نہیں بلکہ یہ ان کے حق میں
بُرا ہے ضرور وہ قیامت کے دن اوس کا
طوق پہنائے جائیں گے جس پر وہ بخل کرتے تھے
اور زمینوں اور آسمانوں کا وارث اللہ ہی ہے
اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو۔ اُسے جانتا ہے۔

لیکن یہ محض ہمارا قیاس ہی نہیں کہ سود کی ممانعت کی وجہ اخوت اسلامی ہے بلکہ اس کی تائید خود کلام پاک سے ہوتی ہے جس میں ایک جگہہ نہایت ہی فصاحت سے اس کی بابت ارشاد فرمایا ہے۔ کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ
وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ
كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۔ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا
فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ
فَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ
لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ وَ
إِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ
مَيْسَرَةٍ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ
لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ (ع ۳۸ پ ۳)

اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اگر تم سچے
مسلمان ہو تو جو سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے
وہ چھوڑ دو ورنہ اللہ اور اس کے رسول سے
لڑائی کے لئے تیار ہو جاؤ اور اگر تم توبہ کرتے ہو تو
تم اپنی اصلی رقم واپس لے لو جس میں نہ تم کسی
پر ظلم کرو نہ تم پر ظلم ہو اور اگر تمہارا مدیون تنگدست
ہو تو اسے فراخی تک کچھ مہلت دو اور اگر تم
سمجھو تو تمہارے لئے بہتر تو یہ ہے کہ تم بوجہ
ناداری مقروض اپنی اصل رقم بھی اسے بخش دو

باب کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو اسنے فضول خرچی اور اسراف کی بے انتہا مذمت اور ممانعت کی ہے۔ اور کئی جگہہ فرمایا ہی کہ

وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ۔ (ع ۳ پ ۸)

اور تم بیجا خرچ مت کرو۔ اللہ فضول خرچوں کو پسند نہیں کرتا۔

یہاں تک کہ خیرات تک میں بھی اسکی اجازت نہیں دی اور یہ ہی حکم دیا کہ

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّہٗ وَالْمِسْکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیَاطِیْنَ ۔

اور اپنے قرابت دار اور غریب اور مسافر کو اس کا حق دے مگر فضول خرچی مت کر بیشک فضول خرچ لوگ شیطانوں کے بھائی ہیں۔

(بنی اسرائیل ۔ پ ۱۵ ۔)

ان تاکیدی فرمانوں کا یہی مدعا ہے کہ آدمی بہ وجہ اسراف ملوم ومحسور نہو اور اسے اپنی فضول خرچیوں کے سبب سے دوسروں کے سامنے دست سوال نہ پھیلانا پڑے۔ چنانچہ سود دینے کی ممانعت کو بھی اسراف سے روکنے ہی کی تاکید فرد سمجھنا چاہیے دوسری طرف اُس نے ضرورت مندوں کو قرض حسنہ دینے کی جابجا بڑی شدّ ومدّ سے تاکیدیں کی ہیں۔ یہاں تک کہ اس طرح قرض دینے کو اللہ تعالیٰ کو قرض دینے سے تعبیر کیا ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗٓ اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً (ع ۳۲ پ ۲)

تم میں سے ایسا کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے اور پھر اللہ سے چند در چند بڑھا وے۔

اور اس کے مقابلے میں بخل وخست کی نہایت تہدید آمیز الفاظ میں بُرائی کی ہے اور فرمایا ہے کہ۔

اسی واسطے یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰو وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ یعنی سود کے لین دین میں کبھی اللہ برکت نہیں دیتا۔ اگرچہ بظاہر اس میں نفع ہے اور خیرات وصدقات دینے سے روز افزوں ترقی ہوتی ہے گو وہ ظاہر میں قلت مال اور از دیاد خرچ معلوم ہوتے ہیں۔ مگر جب صورت حال یہ نہ ہو تو پھر حکم کی نوعیت بھی بدل جائے گی۔ کیونکہ یہ رعایت صرف ذو عُسْرَۃٍ کے لیے ہے اور وہ بھی فقط حالت تیسر تک۔ اس کے بعد اسے بھی اس سے فائدہ اٹھانے کا حق حاصل نہیں ہے۔ لیکن اگر مدیون مرفہ الحال ہو تو پھر اسے اس ارشاد کے مطابق اپنے قرضے کی معافی کی توقع رکھنا کجا۔ ادائے قرضہ میں تاخیر وتساہل کرنا بھی روا نہیں ہے کیونکہ

مَطْلُ الْغَنِیِّ ظُلْمٌ ۵ | دولتمند کا ادائے قرض میں دیر کرنا ظلم ہے۔

اور اگر وہ ایسا کرے تو اسلام اسکی آبروریزی اور سزا دہی تک کی اجازت دیتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ (حسب تفسیر امام رازیؒ) چونکہ عرب جاہلیت میں صرف سود در سود کا ہی رواج تھا۔ اس لئے کلام مجید میں لفظ ربوا سے اسی قسم کا سود مقصود ہے۔ چنانچہ ایک جگہ تو صریح طور پر ربوا کی تعریف میں لفظ اضعافاً مضاعفہ موجود ہی ہے۔ اور چونکہ ایسا سود ہی نہایت تباہ کن اور نقصان رساں ہوتا ہے۔ جس سے مدیون کی اصل رقم کو کئی کئی بار ادا کرنے کے بعد بھی گلو خلاصی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے قیاس ہوتا ہے کہ غالباً ایسے ہی ظالمانہ سود کی ممانعت کی گئی ہوگی۔ لیکن بہر حال یہ تاویل قابل قبول ہو یا نہ ہو مگر اس میں شک نہیں کہ سود لینے کے ناجائز ہونے کی اصلی

یہاں اللہ تعالیٰ نے صاف صاف فرما دیا ہے کہ انصاف اور ایمان کی بات یہ ہے کہ قرضے میں اصل رقم سے کچھ زائد کا تقاضا نہ کیا جائے۔ کیونکہ سود لینا مقروض پر ظلم ہے اور زیادہ اتقا اور مروت کا تو یہ مقتضا ہے کہ جب مقروض مفلس اور نادار ہو اور تم مستطیع اور متمول ہو تو اوس پر زیادہ تنگ طلبی بھی نہ کرو بلکہ اگر بالکل ہی معاف کر دو تو اور بھی بہتر بات ہے۔ اس ممانعت کے بعد بھی سود لینے کو گویا اللہ اور رسول سے لڑانے سے تعبیر کیا ہے۔ اور ہے بھی یہی بات۔ کہ جب ایسی صریح نافرمانی اور سرکشی ہوگی۔ تو گویا وہ لڑائی ہی ٹھہری۔ لیکن یہ شدتِ تاکید و تہدید ہی اس بات کی دلیل ہے کہ رشتۂ ہمدردی قایم رہے۔ اور ایسی صورت پیدا ہو کہ فریقین میں سے کسی کی بھی حق تلفی نہ ہو۔ فحوائے کلام سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ جو صورت قائل کے پیشِ نظر ہے۔ وہ یہی ہے کہ مدیون نہایت تنگ دست اور پریشان حال ہے اور دائن اسقدر مقدرت اور استطاعت رکھتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو صرف سود ہی نہین بلکہ راس المال بھی معاف کر سکتا ہے۔ اور اس کے تمول پر اپنے ایک غریب بھائی کی اتنی امداد کرنے سے کوئی نمایاں اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ اگر یہ صورت نہ ہو تو اصل رقم کے معاف کر دینے کی سفارش کرنا بھی اوس پر ظلم ہے۔ اور اس احتمال کو پہلے ہی۔ لا تُظلمون کے حکم نے مٹا دیا ہے۔ پس جب دائن و مدیون کی یہ کیفیت ہو تو ایسی صورت میں تمام اسلامی اخوت اور قومی ہمدردی پر خاک ڈالکر تھوڑے سے روپیوں کا منہ کرنا اور مدیون کی محتاجی اور تنگدستی پر رحم نہ کرنا اسلام کی انصاف پسند اور حق پرست طبیعت کو کیونکر گوارا ہو سکتا ہے۔

ہم ہمیشہ آپس ہی میں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے اور بیخکنی کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اور ہم کا تنقصوا المکیال والمیزان کے فرمان کو اس قدر پس پشت ڈال چکے ہیں کہ ہماری کوئی تجارت دھوکے اور فریب سے خالی نہیں ہوتی۔ اور ہمارے ہر ایک معاملے میں بے ایمانی اور بدنیتی کا شائبہ ہوتا ہے۔ یہ ہیں اصلی وجہیں ہماری تجارت کی کم فروغی اور کساد بازاری کی اور جب تک ہم ان خباثتوں سے پاک نہ ہونگے تب تک ہماری ترقی دشوار ہے کیونکہ تجارت کا دارمدار ہے اعتبار پر اور ہمارا اعتبار دنیا میں ذرا بھی نہیں رہا اور حال یہ ہے کہ ؎

غالب یہ دکانے کہ بہ امید کشودیم	سرمایہ ما جز ہوس سود نیابی

لیکن کتنی بے انصافی کی بات ہے کہ ہم اپنی بداعمالیوں کے نتائج کا الزام ایک ایسے حکم پر لگائیں۔ جو اسلام کے عین رافت و رحمت ہونے کی ایک قطعی شہادت ہے۔ اور اگر اسکی وجہ سے کچھ نقصان ہوا بھی ہے تو خود ہماری غلط فہمی کیوجہ سے ہوا ہے حقیقت میں حرمت ربوا کے حکم سے تو اس بات کا اندازہ کرنا چاہیے کہ اسلام نے معاملات کی صفائی اور لین دین میں۔ رعایت و انصاف کی کس قدر تاکید فرمائی ہے۔ اور دوسروں کے حقوق کے لحاظ کا کتنا سخت حکم دیا ہے۔ کہ سود خواری تک کو جو اکثر اقوام عالم کے نزدیک جائز اور بجا ہے۔ حرام اور ممنوع فرما دیا۔ رفق و ایثار کی اس سے زیادہ عمدہ تعلیم اور کیا ہو سکتی ہے؟

وجہ یہ ہی ہے کہ ایسی جابرانہ جذب منفعت اخوت وحمیت اسلامی کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دار الحرب میں غیر مسلموں سے بالاتفاق ہر طرح کا سود لینا جائز اور حلال ہے کیونکہ وہاں فریقین میں ہمدردی اور اتحاد کا تعلق مفقود ہے۔ اس کے برخلاف دار الاسلام میں اول تو تمام احکام اسلام نافذ ہوتے ہیں۔ دوسرے وہاں مسلمان صاحب ثروت واقتدار ہوتے ہیں۔ اسکے علاوہ وہاں کے غیر مسلموں سے بھی ان کے ذمی اور معاہدہ ہونے کی وجہ سے ایک طرح کی ہمدردی ہوتی ہے۔ اسی سبب سے وہاں سود کا لین دین بھی جائز نہیں ہے۔

اس تمام تقریر سے غالباً یہ نتیجہ نکالنا غلط نہیں ہے کہ ربا کے ممنوع صرف وہی فائدہ ہے جو اخوت وہمدردی کے خلاف ظلم وجبر پر مبنی ہو اور جہاں یہ صورت نہ ہوگی۔ وہاں عام طور پر لین دین اور بیع وشریٰ میں ہر جائز طریقے پر حصول منفعت کی کوشش روا اور حلال ہے۔ اسی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ ممانعت سود کا حکم مشترکہ سرمائے کی کمپنیاں قایم کرنے یا اس قسم کے اور ذریعوں سے فائدہ اُٹھا کر کاروبار بڑھانے میں ہرگز حارج اور مخل نہیں ہے اور مسلمانوں کے افلاس اور عسرت کا الزام کسی طرح اس ارشاد کے سر نہیں لگایا جاسکتا۔ جو فی الواقع اسلام کی بے انتہا انصاف پسندی اور غربا نوازی کی ایک نمایاں مثال ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ہم اَوْفُوا بِالْعَهْدِ کے حکم کو اتنا بھول گئے ہیں کہ اب ہمارے حلفی وعدے اور تحریری دستاویزیں بھی پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں۔ ہم اَلْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ کے ارشاد سے اتنے بیگانہ ہوگئے ہیں کہ آجکل ہمارا خود ہم سے زیادہ سخت اور جانی دشمن اور کوئی نہیں ہے۔ اور

بلکہ فریقین کے لئے مفید اور منفعت بخش رسم قرار دیتا ہے - اس کے علاوہ حقیقت میں ابھی تو سو برس بھی پورے نہیں ہوئے کہ تمام یورپ اور امریکہ میں غلامی کو بُرا کہنا بھی جرم تھا - اور خود ان لوگوں کے ناقابل بیان ظلم اور غلاموں کی ناقابل برداشت حالت نے لبعض اہل دل کو اسکی مخالفت پر آمادہ کیا - اور چونکہ رائے عامہ بھی ان مظالم کو دیکھتے دیکھتے تنگ آگئی تھی - اس لئے اللہ نے ان کی کوششوں کو بار آور کیا اور آخر یہ رسم بد دنیا کے پردے سے اُٹھ گئی - گو ممالک اسلامی میں (لیکن اب وہ ہیں کون سے) ابھی تک کسی قدر اس کا رواج باقی ہے - اور ہم فخر یہ کہتے ہیں کہ جہاں اسلام کے احکام جاری ہیں وہاں غلامی کے انسداد کی ضرورت بھی نہیں - مگر اب دنیا کو غلامی کے نام سے چڑھ ہو گئی ہے - اور مخالفین رسم غلامی کا سارا الزام ایسی دریدہ دہنی سے اسلام پر لگاتے ہیں جیسے تو اس کا انسداد اُنہوں نے یا اُن کے مذہبوں ہی نے کیا ہو - حالانکہ اس رسم کے مٹانے کا فخر اگر کسی کو حاصل ہے تو وہ دلبر فورس اور دیگر مخالفین رسم غلامی سے بھی زیادہ امریکہ اور یورپ کے اِن ظالموں کو حاصل ہے - جن کے جور بیجا نے عوام کو غلامی کے رواج سے برگشتہ کر دیا - اس لئے ضرورت ہے کہ ہم اپنے فخر کے وجوہ کی تشریح کریں -

اول تو یہ دیکھیئے کہ اسلام پر الزام کیا ہے ؟ - یہ کہ اس نے غلامی کی ممانعت نہیں کی - تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیجئے کہ ہاں نہیں کی - لیکن کیا کسی اور مذہب نے کی ؟ یقیناً نہیں کی - تو پھر اس حیثیت سے

غلامی اور اسلام

اگر ہم اسلام کے عفو و درگذر رحمدلی اور خوش خلقی کی تعلیم کا صحیح اندازہ کرنا چاہیں تو ہم کو ان احکام کا مطالعہ کرنا چاہیئے جو غلامی کے متعلق دیئے گئے ہیں کیونکہ زبردست کے سامنے تو ایک گال کے آگے دوسرا گال کر دینا کچھ زیادہ داد طلب بات نہیں ہے۔ ہاں البتہ باوجود قدرت و طاقت زیردست کو معاف کر دینا اور مکرر اس پر لطف و مہربانی کرنا حسن اخلاق کا سچا معیار ہے

ہیچ دانی کہ مردمی چہ بود	گاہ قدرت غضب فرو بردن

اور دنیا میں غلاموں سے زیادہ بیکس اور بیچارہ کون ہوگا؟

غلامی کا رواج دنیا میں آغاز تمدن و ابتدائے تاریخ سے رہا ہے۔ بنی اسرائیل کو تو خود ہی صدیوں تک غلامی کے تلخ تجربے برداشت کرنے پڑے۔ عہد عیسوی میں غلامی کا رواج زور شور سے تھا اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اسلام نے بھی فی الفور اسکی قطعی ممانعت نہیں فرمائی۔ اور یہ کچھ تعجب کی بات بھی نہیں ہے۔ گزشتہ زمانہ میں غلامی کی رسم فی الحقیقت ایک بڑی تمدنی اصلاح تھی۔ کیونکہ اس خونریزی اور جنگجوئی کے دور میں اس رسم کی وجہ سے اسیران جنگ کو قتل کر ڈالنے کا رواج کم ہو گیا۔ اسی وجہ سے ارسطو اس کو نہ صرف ایک ضروری اور قدرتی

یں معدوم نہ ہوجانے پر تعجب ہوتا ہے۔ اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اگر اس وقت کی غلامی کے گوناگوں فوائد لوگوں کو خود غلام بننے پر آمادہ نہ کرتے تو یقیناً عہد نبوت ہی میں غلامی کا نام و نشان مٹ جاتا۔

کیونکہ اول تو خیرات و صدقات میں فک رقبہ (لونڈی غلاموں کو آزاد کرنے) کی بیحد ترغیب دی گئی ہے۔ اور بیسیوں حدیثیں اسکی فضیلت میں مروی ہیں۔ پے در پے بارگاہ رسالت سے یہی فرمان صادر ہوا ہے کہ جہاں تک ہوسکے غلاموں کو آزاد کرو۔ دوسرے بہت سے چھوٹے چھوٹے قصوروں (مثلاً قسم کے توڑنے) کا کفارہ یہ مقرر کیا گیا ہے کہ غلام آزاد کیا جائے اس کے علاوہ مکاتبت کی صرف اجازت ہی نہیں دی۔ بلکہ مسلمانوں کو حکم دیا کہ اس سے انکار نہ کریں۔ اور غلاموں کی آزادی حاصل کرنے میں حارج نہوں۔ کلام پاک کا ارشاد ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰكُمْ (ع ۱ پ)	اور تمہارے جو غلام تمسے مکاتبت چاہیں ان سے یہ معاہدہ کرلو۔ اگر تم ان میں کچھ بھلائی پاؤ۔ اور ان کو بھی اس مال میں سے کچھ دو جو اللہ نے تم کو دیا ہے۔

مکاتبت کا مسئلہ خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ اور اصطلاح میں مکاتبت کے یہ معنے ہیں کہ غلام گویا اپنی قیمت خود اپنے مالک سے طے کرکے یہ معاہدہ کرلے کہ جب وہ اپنی محنت مزدوری سے رقم معینہ ادا کردے تو آزاد ہوجائے یہ درست ہے کہ غلاموں کو آزاد کئے جانے کے ایسے طریقے یونان اور روم

تو کسی غیر مسلم کو اسلام پر یہ اعتراض کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ مگر نہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اسلام نے اگرچہ بظاہر غلامی کی ممانعت نہیں کی۔ مگر واقع میں اس کا اتنا عمدہ انسداد کر دیا کہ اس سے بہتر صورت اب بھی پیدا نہیں ہوئی۔ اس دعوے کے ثبوت کے لئے پہلے تو یہ دیکھیے کہ غلامی کا مفہوم کیا ہے۔ "یہ کہ ایک آدمی کے تمام حقوق انسانیت سلب ہو کر کسی دوسرے آدمی کی مرضی کے تابع ہو جائیں۔ یہاں تک کہ اس کی موت و زندگی بھی اسی کے اختیار میں ہو۔ اور غلام کو آقا کے مقابلے میں خود اپنی ذات پر کچھ حق باقی نہ رہے۔" جس کسی نے تاریخ قدیم و جدید میں غلاموں کی حالت کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ تصدیق کرے گا کہ غلامی کا مفہوم ہر زمانے میں یہی رہا ہے۔ اور ہم نے اس کی تعریف میں کچھ مبالغہ نہیں کیا۔ رومتہ الکبریٰ کے ایک اسی قاعدے سے غلاموں کی حالت کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہاں غلام حکماً شب و روز ہر وقت اور ہر حال میں ایک زنجیر پہنے رہتے تھے۔ لیکن جب ہم احکام اسلام کو دیکھتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے کبھی ایسی غلامی کی اجازت نہیں دی۔ کیونکہ اول تو اسلام نے آزاد کو بیچنے کی قطعی ممانعت فرما کر عام رسم غلامی کا سدّباب کر دیا۔ اور یوں صرف انہی لوگوں کا بیع و شرئ جائز رہ گیا جو اسلام سے پہلے ہی کسی وجہ سے اپنی آزادی کھو چکے تھے۔ یا جو لوگ لڑائیوں میں گرفتار ہو کر آئے تھے۔ اگرچہ اسلام نے فوراً ان لوگوں کو آزاد نہیں کیا لیکن پھر بھی انکی آزادی کے لئے اتنے مختلف طریقے مہیا کر دیئے کہ غلامی کے اسی زمانے

کیونکہ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو غلام حق مکاتبت سے کیونکر فائدہ اُٹھا سکتے تھے۔ اور رقم مقررہ ادا کرنے کے لئے روپیہ کیونکر فراہم کر سکتے تھے۔ یہیں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک حد تک غلام اپنی کمائی ہوئی دولت پر قابض رہتے تھے اور معاہدے کے بعد آقا کو ان کی ذاتی املاک پر دست اندازی کرنیکا کچھ حق نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو بیچارہ غلام محنت و مشقت کر کے جو کچھ کماتا وہ سب مالک کا ہو جاتا۔ اور غلام کبھی بھی اپنی آزادی نہ خرید سکتا۔ اب بتائیے کہ اس غلام میں اور آپ کے خدمت گار میں اس کے سوا اور کیا فرق ہے کہ آپ اپنے خدمتگار کو ماہواری تنخواہ دیتے ہیں اور اسی لئے اسے ہر وقت آپ کی ملازمت چھوڑ دینے کا اختیار ہے لیکن غلام کی عمر بھر کی تنخواہ یکمشت پیشگی ادا کی جا چکی ہے۔ اس لئے وہ جب چاہے ترک خدمت نہیں کر سکتا تاوقتیکہ وہ اپنی پیشگی وصول کردہ تنخواہ (جو اس صورت میں اس کی قیمت کہلائے گی) واپس ادا نہ کرے ایسا تو آجکل کی ملازمتوں میں بھی اکثر ہوتا ہے کہ ملازم سے ایک مقررہ مدت (مثلاً تین سال) تک ملازمت ترک نہ کرنے کا عہد کرا لیا جاتا ہے اور اتنے دن تک اسے طوعاً و کرہاً خدمات مقررہ انجام دینی پڑتی ہیں۔ سزائے موت کا اختیار جس طرح آقا کو ملازم پر حاصل نہیں ہے۔ اسی طرح مالک کو غلام پر بھی شرعاً کبھی حاصل نہیں ہوا۔ یہی نہیں بلکہ غلام کو زیادہ مارنا اور سخت سزا دینا بھی احکام اسلام کے بالکل خلاف ہے۔

قدیم میں بھی رائج تھے۔ لیکن وہ محض مالک کی مرضی اور مہربانی پر موقوف تھے۔ اور غلام کو ان سے مستفید ہونے کا کوئی حق نہ تھا۔ اس کے علاوہ اس میں قیود و قواعد اتنے زیادہ تھے کہ اکثر ان کے اجرا میں بڑی دشواری ہوتی تھی۔ اور بہر حال مالک کو غلام پر اس کے آزاد کر دینے کے بعد بھی بہت سے حقوق باقی رہتے تھے۔ اسلام نے ان تمام باتوں کا سدّباب کر دیا۔ چنانچہ شرعی حکم یہ ہے کہ ایسی صورت میں آقا ہرگز اس کا مزاحم نہ ہو بلکہ جہاں تک ہو سکے خود بھی اس کی مدد کرے چنانچہ ایک روایت ہے کہ سیرین نے اپنے آقا انس سے مکاتبت کی درخواست کی۔ سیرین بہت دولتمند تھا مگر اس کے آقا نے انکار کر دیا۔ یہ شکایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لایا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انس کو بلا کر سمجھایا۔ اس پر بھی اسنے انکار کیا تو حضرت عمرؓ نے انس کی نافرمانی کی سزا میں اسے درے لگائے۔ اور مذکورہ بالا ارشاد پاک سنایا۔ تب انس مکاتبت پر راضی ہوا۔

اب اس حکم کو پیش نظر رکھکر مکاتبت کے اصول پر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے غلام کی حالت بالکل ملازم کی سی قرار دی ہے۔ یہاں تک کہ ان کو اوقات مقررہ سے زیادہ کام کرنے کی جدا گانہ اُجرت پانے یا اپنے زائد اور خالی وقت میں کسی دوسرے کا کام کرنے اور کمانے کی بھی اجازت تھی۔ بعینہ جس طرح آج کل کے کارخانوں وغیرہ میں کام کرنے والے مزدور اُوور ٹائم پاتے ہیں یا ملازمت پیشہ لوگوں کو فرائض مفوضہ کے علاوہ کوئی خدمت بجا لانے کا بھتہ اور الاونس دیا جاتا ہے۔

کی اصلاح کے لئے خاص انجمنیں قایم ہیں جو قوم کو انکی مصیبتوں کے دردناک افسانے سنا سنا کر ان کے بیوی بچوں کے واسطے خیراتی مدرسے اور ہسپتال اور غریب خانے بنواتی ہیں۔ مگر پھر بھی ان کی کیفیت ناگفتہ بہ ہے۔ اور یہ حالت ان ملکوں کے باشندوں کی ہے۔ جو علم و ترقی اور دولت و ثروت کی معراج کمال پر پہنچ چکے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ایک اسلامی غلام کو دیکھیے اس کا کام اگر مشکل سے مشکل بھی ہو گا۔ تب بھی جسمانی مشقت ہی کا ہو گا۔ دماغی تکان کا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کو گھر کے معمولی کام کاج کے سوا اور کرنا ہی کیا ہوتا ہے۔ اس کے لئے اسے دن رات میں چھ سات گھنٹے سے زیادہ کام کرنا نہیں پڑتا۔ اس سے زائد اگر وہ کام کرنا چاہے اور کر سکے تو وہ اس کے صلے میں اپنی آزادی حاصل کر سکتا ہے۔ مگر اس کو ایسا کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اسے عام طور پر کچھہ تنخواہ نہیں ملتی۔ لیکن اس کے کھانے پینے کا کل خرچ اس کے مالک کے سر ہے اور وہ کم سے کم اتنا تو کہہ سکتا ہے کہ ؎

اگر نہ بہر من از بہر خود عزیزم دار ۔۔۔ کہ بندہ خوبیٔ او خوبیٔ خداوند است

اگر وہ بیمار پڑے تو مالک اس کا علاج اور تیمارداری کرے گا۔ اور اگر مر جائے تو وہ ہی اسکی تجہیز و تکفین کا ذمہ دار ہو گا۔ غرض غلام کو اپنے مرنے جینے کی کسی بات کا کچھہ فکر نہیں ہے۔ اور اگر وہ کوئی خاص فن جانتا ہے یا کسی خاص کام میں ہوشیار ہے تو وہ بہت آسانی سے خوش حال اور دولت مند ہو سکتا ہے انہی وجہوں سے غیر مسلم مصنف بھی اعتراف کرتے

غرض یوں غلام اور ملازم کی حالتوں میں فقط ایک ہی نمایاں مابہ الامتیاز معلوم ہوتا ہے کہ غلام ہر وقت اپنے مالک کو بدلنے پر قادر نہیں ہوتا اور ملازم کو اکثر و بیشتر اوقات اپنے آقا کے چھوڑنے کا اختیار رہتا ہے لیکن اس کے سوا اور اکثر باتوں میں اس زمانے کی غلاموں کی حالت آج کل کے ملازم سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔ آج کل تمام کارخانوں۔ ریلوں اور اور اکثر صیغوں کے ادنیٰ اور اوسط درجے کے نوکروں کو عموماً روزانہ نو دس گھنٹے سے لیکر ۱۲ اور بعض وقت ۱۵ گھنٹے تک مسلسل کام کرنا ہوتا ہے۔ اور ان میں سے اکثر کام اتنے سخت اور محنت طلب ہوتے ہیں کہ گزشتہ زمانے کا مشکل سے مشکل کام بھی ان کے مقابلے میں نہایت سہل اور آسان معلوم ہوتا ہے۔ آج کل کے کاموں میں چونکہ اکثر ذراسی غلطی بھی مہلک ہوتی ہے اس لئے محنت کے علاوہ ذمہ داری اتنی ہوتی ہے کہ جسم سے بھی زیادہ دل و دماغ تھک جاتا ہے۔ جس سے آدمی پر اور بھی زیادہ مضر اثر پڑتا ہے۔

آج کل کے کام کی سختی اور زیادتی سے زیادہ سخت فرق غلاموں اور ملازموں کی حالت میں یہ ہے کہ اب آقا کو ملازم کی مقررہ تنخواہ ادا کر چکنے کے بعد پھر اس کے نیک و بد سے کچھ سروکار نہیں رہتا۔ اس کی بلا سے نوکر مرے یا جئے۔ اس کے گھر میں فاقہ ہو یا بیماری۔ آقا کو جلاد کی طرح اپنا کام لینے سے کام ہے۔ غرض بحیثیت مجموعی آجکل کے اکثر ملازموں کی حالت سلطنت کی مسلسل کوششوں کے باوجود بھی اتنی ابتر ہے کہ ان کی حالت

کام نہ لیں اور اگر کوئی مشکل کام آپڑے تو خود بھی ان کا ہاتھ بٹائیں - اور کھانے کپڑے میں اپنے آپ کو ان سے ممتاز نہ کریں بلکہ ان کو بھی وہی کھلائیں پہنائیں جو خود کھاتے پہنتے ہیں - ارشاد نبوی ہے۔

هُمْ اِخْوَانُكُمْ جَعَلَهُمُ اللّٰهُ تَحْتَ اَيْدِيْكُمْ فَمَنْ جَعَلَ اللّٰهُ اَخَاهُ تَحْتَ يَدَيْهِ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَاْكُلُ وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ وَلَا يُكَلِّفْهُ مِنَ الْعَمَلِ مَا يَغْلِبُهُ فَاِنْ كَلَّفَهُ مَا يَغْلِبُهُ فَلْيُعِنْهُ عَلَيْهِ - (صحیحین)	لونڈی غلام تمہارے بھائی ہیں جن کو اللہ نے تمہارا زیر دست کیا ہے - تو جس کے بھائی کو اللہ اس کا زیر دست بنا دے تو اُسے چاہیئے کہ جو خود کھائے وہی اسے بھی کھلائے جو آپ پہنے وہی اسے بھی پہنائے اور اسے ایسے کام کی تکلیف نہ دے جسے وہ کر نہ سکے اور اگر کوئی ایسا کام دے جو اسکی طاقت سے باہر ہو تو خود بھی اس میں اسکی مدد کردے -

انصاف شرط ہے کیا آج کل اس حریت اور اخوت و مساوات کے زمانے میں بھی کوئی ملازم ایسے برتاؤ کا مستحق سمجھا جاتا ہے - نہیں کیا کوئی ملازم خود بھی کبھی اس قدر لطف و مراعات کی امید رکھ سکتا ہے ہ

اس مساوات پہ ہے معشر اسلام کو ناز		نہ کہ یورپ کی مساوات کہ ظلم اکبر

یہ ہی اسباب تھے کہ آزادی حاصل کرنے کی اتنی آسانیوں کے باوجود بھی غلاموں کی تعداد میں کمی نہیں ہوتی تھی اور لوگ اسے بہت سے دیگر ذرایع معاش سے بہتر سمجھتے تھے - خود مسلمانوں میں تو شروع ہی سے

ہیں کہ وہ مسلمانوں میں عموماً غلاموں کو کھیتوں کا کام کرنا نہیں پڑتا۔ بلکہ صرف خانگی خدمات انجام دینی ہوتی ہیں۔ وہ خاندان کا ایک فرد سمجھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ محبت اور شفقت کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ (ماخوذ از انسائیکلوپیڈیا برٹینکا جلد ۲۵ طبع جدید) کیا یہ باتیں ملکر آج کل کے ملازم کی تنخواہ کے برابر بھی نہیں ہیں۔

لیکن اسلام نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ یہ بھی حکم دیا کہ لونڈی غلاموں کی شادی کر دی جائے۔ بشرطیکہ وہ شریر اور بدمعاش نہ ہوں

وَانْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَائِكُمْ۔ | اور تم اپنی بیواؤں اور اپنے نیکبخت لونڈی غلاموں کے نکاح کردو۔

اور پھر اس ارشاد کے ساتھ ان کے جذبات محبت کا بھی اتنا لحاظ کیا کہ انکی اولاد کو ماں باپ سے اور بھائی کو بھائی سے جدا کرنے کو منع فرمایا تاکہ یہ دلچسپ تعلقات ہی مصدر مصیبت نہ بنجائیں۔ چنانچہ جس کسی نے انگریزی کی مشہور کتاب "انکل ٹام کیبن" اور اور اسی مضمون کی کتابیں پڑھی ہیں۔ اُس کو معلوم ہے کہ امریکہ میں مسیح کی رحمدل بھیڑوں نے وہاں کے اصلی باشندوں اور افریقہ کے بیکس حبشیوں کے حق میں انہی فطری جذبات محبت کو کسقدر رنج و الم کا سبب بنا دیا تھا اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو ماؤں سے بیبیوں کو شوہروں سے اور بہنوں کو بھائیوں سے جدا کرنا ان کی مشق ستم کی ایک معمولی صورت تھی۔ اسلام نے یہ بھی ہدایت فرمائی ہے کہ غلاموں کے ساتھ شفقت و محبت سے پیش آئیں۔ ان سے زیادہ سخت

اس لئے اکثر غریب اور پریشان حال لوگ کچھہ رقم لیکر اپنے آپ کو گویا کھانے کپڑے کے عوض کسی کے حوالے کر دیتے تھے - اور پھر چونکہ اس پیشگی وصول کردہ رقم کو ادا نہ کر سکتے تھے اس لئے گویا عمر بھر کے لئے اسی کے ہو رہتے تھے - ہاں جب اوس شخص کو روپے کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ مناسب رقم کے معاوضے میں اپنے حق کسی دوسرے پر منتقل کر کے ان کو اس کے سپرد کر سکتا تھا - اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ان غلاموں کی حالت روس اور فرانس اور بہت سے مسیحی ملکوں کے اٹھارویں اور انیسویں صدی تک کے کاشتکاروں کی حالت سے بدر جہا بہتر تھی -

بلا شبہ وہ رسم غلامی قطعی اور فوری انسداد کے قابل تھی جس میں بیچارے غلام تمام حقوق انسانیت سے ہی محروم ہو جاتے تھے - جس میں ان کی موت و زیست تک ان کے مالکوں کی مرضی پر موقوف تھی جس میں ان کے سارے جذبات اور قدرتی تعلقات نہایت بیدردی سے پامال کر دئے جاتے تھے - روما کے ایک شخص کے قتل ہو جانے کی وجہ سے قانون نے اسکے چار سو غلاموں کو سزائے موت دیدی تھی - شہنشاہ اغسطس نے ایک بٹیر کے قصاص میں ایک غلام کو سولی پر چڑھا دیا تھا - اسی بادشاہ کے ایک مصاحب نے اس کے سامنے ہی ایک بلور کا گلدان ٹوٹ جانے کی وجہ سے اپنے غلام کو حوض میں ڈلوا کر مچھلیوں کی غذا بنا دینے کا ارادہ کیا تھا - مگر اس وقت خوش قسمتی سے شہنشاہ کو کچھہ رحم آگیا - اور یوں بیچارے غلام کی جان بچ گئی - لیکن یہ نہایت ہی خوفناک اور وحشیانہ سزا روما

آزاد کو بیچنے کی ممانعت کی وجہ سے بردہ فروشی کا زیادہ رواج نہیں ہوا۔ اور انہوں نے کبھی اپنے بچوں کو بیچ کر اپنی حریت اور حمیت پر داغ نہیں لگایا۔ مگر چونکہ ان دنوں میں زمانہ ان کا موافق تھا اور غلاموں کے خریدنے میں ان کو کچھ باک نہ تھا اس لئے ان کے ہمسایہ غیر مسلموں نے اس تجارت کو خوب ترقی دی۔ تاہم ان کے ایام عروج میں افریقہ کے حبشیوں پر اس کا عشر عشیر بھی ظلم نہیں ہوا۔ جو چند صدیوں بعد یورپ کی ترقی کے آغاز میں ان پر روا رکھا گیا۔ اور جس کے روکنے کے لئے مذہب مسیحیت نے کچھ بھی نہیں کیا۔ غلاموں کے ساتھ مسلمانوں کے حسن سلوک کا اس سے بڑھکر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ ابتک غلامی کے ایسے سخت انتظام کے باوجود قسطنطنیہ اور قاہرہ کے بازاروں میں گرجستان اور قاف کے باشندے اپنی پری جمال لڑکیوں کو خوشی خوشی فروخت کرنے کے لئے لاتے ہیں۔ کیونکہ عموماً مسلمان امرا کے حرموں میں ان کی حالت ان کے گھروں سے بدرجہا بہتر ہوتی ہے۔ اور ان میں سے بعض بعض کو تو اسلامی قانون کی طفیل ایک دن والدۂ سلطان تک بننے کی امیدیں ہوتی ہیں۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ یہ اُمیدیں کچھ بیجا نہیں ہوتیں۔ کوئی بتائے کہ کیا اسی غلامی کا انسداد نہ کرنے سے اسلام بدنام کیا جاتا ہے؟ کیا ایسے ہی ظلم وستم کے جاری رکھنے کا اس پر الزام لگایا جاتا ہے؟ ہم یہ پوچھتے ہیں کہ سرے سے اس کو عرفی معنوں میں غلامی کہہ بھی کون سکتا ہے؟ حقیقت میں اسلام نے غلامی کو باقی ہی نہیں چھوڑا۔ البتہ چونکہ اس زمانے میں روپے کی قلت تھی

جو وحشیانہ برتاؤ یورپ کے مہذب اور رحمدل مسیحی تاجر روا رکھتے تھے۔ اس کا کچھ ذرا سا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ نصف سے زیادہ حبشی اثنائے سفر ہی میں نذر اجل ہوکر غلامی کی اصلی مصیبتوں سے آزاد ہوجاتے تھے اُف ان حالات کو پڑھکر آدمی کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور نہایت تعجب ہوتا ہے کہ اِن لوگوں کے دل کس چیز کے تھے کہ ان کو ان بیکسوں پر ذرا رحم نہیں آتا تھا۔ لیکن خدا نے اس ظلم ہی کو اس ظلم کے خاتمے کا سبب بنا دیا ہے

با مردم فتادہ مکن دشمنی کہ برق	بر خرمنے نہ تاخت کہ خود ہم فنا نشد

تصویر کا ایک رخ تو یہ ہے۔ اب دوسرے رخ کی بھی ایک جھلک ملاحظہ ہو آستانِ نبوت کے ایک خادم انس کا بیان ہے کہ "میں دس برس تک جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت بابرکت میں رہا مگر اس تمام زمانے میں حضور نے کبھی مجھے اُف تک نہیں کہا۔ اور نہ کبھی یہ فرمایا کہ تو نے یہ کام کیوں کیا۔ اور یہ کیوں نہیں کیا" ام سلمہ کے غلام سفینہ کا بیان ہے کہ "میری مالکہ نے مجھے اس شرط پر آزاد کرنے کو کہا کہ میں حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کی خدمت کرتا رہوں اس پر میں نے کہا کہ اس شرط کی کیا ضرورت ہے۔ آستانِ بارگاہِ نبوت سے تو جیتے جی میں خود ہی جدا ہونا نہیں چاہتا۔ چنانچہ میں آزاد کردیا گیا اور عمر بھر خدمت بابرکت میں حاضر رہا" مسجد نبوی کے موذن بلال حبشی رحمتہ اللہ علیہ کے حالات محتاج بیان نہیں ہیں۔ ان کی

میں بہت عام تھی۔ اور وہاں سیکڑوں غلاموں کو حوضوں کی مچھلیاں نوچ نوچ کر کھا گئیں۔ وہیں کا یہ بھی دستور تھا کہ بیمار اور کمزور غلاموں کو دریائے ٹائبر کے ایک جزیرے پر سسک سسک کر مرنے اور تڑپ تڑپ کر جان دینے کے لئے چھوڑ دیتے تھے۔ یہ واقعات دردناک ہیں مگر ان سے بھی بدرجہا زیادہ سخت جبر و تشدد اور ظلم و زیادتی کی مثالیں وہ ہیں جو سولہویں سترہویں اور اٹھارویں صدیوں میں غلاموں پر یورپ اور امریکہ میں روا رکھی گئی ہیں۔ فن جہاز رانی کی ترقی اور بحری آمد و رفت کی آسانی نے جہاں یورپ کی ترقی کا سنگ بنیاد رکھا وہیں بیچارے سیاحان افریقہ اور امریکہ کی تباہی اور بربادی کا راستہ بھی کھول دیا۔ اندازہ[۱] کیا گیا ہے کہ امریکہ اور جزائر غرب الہند کے فقط انگریزی مقبوضات میں ۱۶۸۰ء سے ۱۷۸۶ء تک ۲۱ لاکھ ۳۰ ہزار حبشی غلام بنا کر بھیجے گئے تھے۔ جنکی سالانہ اوسط ۲۰ ہزار ۹۵ ہوتی ہے۔ اور صرف ۱۷۹۰ء میں تمام یوروپین بردہ فروشوں نے ۷۴ ہزار حبشیوں کو جلاوطن کیا جس میں سے ۳۸ ہزار صرف انگریز سوداگروں کے حصے میں آئے۔ (مگر یہاں یہ نہ کہنا بے انصافی ہوگا کہ جس طرح انگلستان اس شرمناک تجارت میں سب سے زیادہ آگے تھا۔ اسی طرح اس کے انسداد میں بھی وہ سب کا پیشرو رہا۔ اور دنیا اس کے قطعی تدارک کے لئے برطانیہ اور امریکہ کی ہمیشہ ممنون رہے گی) ان وحشیوں کے ساتھ

---

[۱] ماخوذ از انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا۔ طبع جدید جلد ۲۵۔ یہ اندازہ ۱۷۹۱ء میں ایک شخص بریان ایڈورڈز نے کیا تھا۔

حصّہ چہارم متفرقات

اسلامی تیوہار

اسلام نے جیسے سہل الحصول اور عام فہم قواعد عقائد و آداب کی بابت سکھائے ہیں۔ ویسی ہی صفائی اور سادگی مذہبی تیوہاروں وغیرہ میں رکھی ہے۔ قدیم مذہبوں کی سی اہمیت اور وقعت تو اسلام نے اپنے کسی تیوہار یا رواج کو دی ہی نہیں ہے۔ لیکن چونکہ رسموں سے بھی دنیا میں قسم قسم کے فائدے ہیں۔ اور تیوہاروں میں بھی طرح طرح کی مصلحتیں ہیں اور اگر سارے سال میں ہنسی خوشی کا کوئی بھی ایسا دن نہ ہو کہ عزیز اقارب باہم مل جل کر خوش ہوں اور دوست احباب ایک دوسرے کی صحبت میں کچھ دیر کے لئے افکار دنیا کو بھولجائیں تو پیچ بیچ زندگی اجیرن ہوجائے۔ اس لئے جس طرح ہفتے میں ایک روز تعطیل کا ہونا لازمی ہے۔ اسی طرح سال بھر میں چند دن عام خوشی اور قومی جشن کے ہونے بھی ضروری ہیں۔ مگر چونکہ یہ عالمگیر اثر مذہب کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں ہے۔ اس لئے عموماً قومی تیوہار کسی نہ کسی پہلو سے مذہب ہی کے سائیہ حمایت میں

غلامی پر شاہان جہاں کا رشک بجا ہے - اسلامی دنیا میں اس غلام کی عزت و حرمت کا اندازہ یوں کیجیے کہ بقول شبلی مرحوم

عہد فاروق میں جس دن کہ ہوئی انکی وفات	یہ کہا حضرت فاروق نے با دیدہ تر
اُٹھ گیا آج زمانے سے ہمارا آقا	اُٹھ گیا آج نقیب حشم پیغمبر

شاہان اسلام کے زمانے میں بالعموم غلام بہت بڑی بڑی خدمتوں پر سرفراز رہے ہیں جن کے تذکروں سے تاریخ کی کتابیں بھری ہوئی ہیں - اور جو عروج مصر کے مملوک اور ہندوستان کے غلام تاجداروں کو نصیب ہوا ہے اسکی نظیر تو دنیا کی کوئی تاریخ نہیں دکھا سکتی -

انصاف شرط ہے - آپ ہی بتائیے - کیا اسلام کے احکام غلامی پر ہمارا فخر کرنا کچھ بیجا ہے - ہم کو تو اپنے ان (علی الرغم اعدا) عیوب پر بھی تا زاور بجا ناز ہے -

نیا اور صاف ستھرا لباس پہننا ہی مسنون اور مستحب ہے۔ اور یہ ظاہری نمائش اور آرائش کی غرض سے نہیں بلکہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو بخل و خست کی وجہ سے چھپایا نہ جائے۔ بلکہ ان کو مناسب طور پر استعمال کرکے اوس کا عملی شکر ادا کیا جائے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ یوں بظاہر تو نماز زاہدانِ خشک کے کرنے کا کام معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے چاہیئے تھا کہ ایک عام جشن مسرت میں شروع ہی میں نماز کا کھٹراگ عام طبائع کے نزدیک مقبول نہ ہوتا۔ مگر حالت اس کے بالکل برعکس ہے۔ غیر قوموں کو تو اس کا تجربہ نہیں ہے۔ مگر مسلمان غالباً ہمارے اس قول کی تائید کریں گے کہ واقع میں عیدین کی ساری خوشی عیدگاہ جانے اور نماز پڑھنے تک ہی ہوتی ہے۔ اگرچہ ملنا جلنا ہنسنا کھیلنا۔ ایک دوسرے کے ہاں جانا آنا سب کچھ نماز کے بعد ہی ہوتا ہے۔ حالانکہ تیوہاروں کی خوشی منانے کی بڑی قوی وجہ یہی ہے اور عید بھی اس سے کچھ مستثنیٰ نہیں چنانچہ کہا گیا ہے کہ ؎

یہ عید شاد ہمہ خلق و من بعید زیار	چو من بعید زیارم مرا بہ عید چہ کار

مگر پھر بھی وہ قلبی مسرت اور روحانی انبساط جو نماز تک تھی اس کے بعد نہیں رہتی اور یہ حالت صرف عبادت گزار اور سنجیدہ طبع بوڑھوں ہی کی نہیں ہے بلکہ جوانوں اور بچوں سب کی یہی کیفیت ہے۔ آخر اس کی کیا وجہ۔ شاید کوئی کہے کہ خوشی کا اصلی سبب نئے اور بھڑکدار کپڑے پہنکر عیدگاہ کے میلے میں جانا ہوتا ہے ؎

ہوتے ہیں۔ اور چونکہ عبادات کے مقابلے میں زندگی کا زیادہ عام پسند اور ہر دلعزیز رُخ دکھاتے ہیں اس لئے مختلف قوموں کے تیوہاروں کے باہمی مقابلے سے انکے مذہبوں کی تعلیم کا اصلی رنگ اور واقعی اثر معلوم ہوتا ہے اور یوں یہ مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے اور جہاں تک ہم دیکھتے ہیں اس معاملے میں بھی اسلام نے اپنی سچی فطرت شناسی اور حقیقت دانی کا ثبوت دیا ہے۔

مسلمانوں کے اصلی تیوہار دو ہیں۔ ایک عید الفطر دوسرے عید الضحیٰ۔ اسلام نے ان دونوں کو نہایت پاکیزہ اور پسندیدہ مذہبی شان دیدی ہے۔ اور اگرچہ ان میں تیوہاروں کا اصلی مقصد ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ مگر پھر بھی سب سے مقدم دوگانہ نماز رکھا ہے۔ کہ آدمی ظاہری خوشیاں منانے اور دل بہلانے سے پہلے ذرا دیر کے لئے اپنے خالق ذوالجلال کے انعام اور احسان کا تو شکر بجا لائیں جس نے اپنی عنایت بے نہایت اور الطاف بے پایاں سے ان کو یہ مبارک دن دیکھنا نصیب کیا۔ اس میں بھی یہ خوبی رکھی کہ عیدین کی نماز یکجا ادا کرنے کا حکم دیا۔ تاکہ اکثر وہ لوگ بھی جن میں تعلقات محبت و قرابت اتنے گہرے نہیں ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے گھروں پر ملنے جائیں۔ وہیں عیدگاہ میں مل لیں اور ان میں بھی رفتہ رفتہ شناسائی دوستی کی طرف منجر ہو۔ اس مصلحت کے علاوہ اسمیں اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔ نماز کے لئے وضو اور طہارت تو لازمی ہے ہی۔ مگر عید کے دن نہانا خوشبو لگانا اور حتی المقدور

جب ہم اپنے ہاں کے ان مہذب اور شائستہ تیوہاروں کا مقابلہ ہولی کے رنگ پاشی اور گلال باری کے ہنگاموں اور دیوالی کے شراب نوشی اور قمار بازی کے جلسوں سے کرتے ہیں تو ہم کو اسلام کے مذاق کی پاکیزگی اور مزاج کی سنجیدگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور جب کارنیول[۵۱] کے فینسی ڈریس بالوں کے ولولہ انگیز بزمہائے عشرت پرستی سے اپنی مجالس عید کا موازنہ کرتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے کس خوبصورتی سے نفاست اور طہارت کو عبادت اور حسن معاشرت کے ساتھ جمع کیا ہے اور ہماری ہر ایک رسم یہاں تک کہ ہمارے تیوہاروں کو بھی افراط و تفریط کے مذموم پہلوؤں سے کس عمدگی کے ساتھ بچایا ہے۔

۵۱ - کارنی ول مسیحیت کے رومن کیتھلک فرقے کی عید جو مسلمانوں کی عید الفطر سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے کیونکہ یہ جس طرح ماہ رمضان کے روزوں کے بعد ہوتی ہے اسی طرح کارنی ول کا جشن لینٹ کی چلہ کشی سے پہلے منایا جاتا ہے۔ مگر اب دنیا کی مسیحیت میں لینٹ کے چالیس دن کے روزے رکھنے والے تو شاذ النادر کالمعدوم سے بھی کچھ کم ہوں مگر فرانس اور اٹلی کا جشن کارنی ول اپنی بے نظیر دلچسپیوں اور بے مثال طرب انگیزیوں کی وجہ سے نہایت دھوم دھام اور شان و شوکت سے منایا جاتا ہے۔ عورت مرد عجیب و غریب لباس پہنکر طرح طرح کے سوانگ بناتے ہیں۔ اور ایک دوسرے پر رنگ کے قمقمے اور مٹھائیوں کے پھول پھینکتے ہیں اس مذاق میں نہ اجنبیت مانع ہوتی ہے۔ نہ غیریت حائل ہوتی ہے۔ غرض مختصر یہ کہ اس ہفتے میں وہاں ہر قسم کا قانون معطل کر دیا جاتا ہے اور اذن عام ہوتا ہے کہ جس کا جو جی چاہے کرے اور جس طرح چاہے دل بہلائے۔

صباح عید کہ در تکیہ گاہ ناز و نعیم　　گدا کلاہ بہ کج نہاد و شہ دیہیم

قرین قیاس تو تھا کہ ایسا ہی ہو۔ مگر ہم پوچھتے ہیں کہ کپڑوں کی نمائش اور ساز و سامان کی چمک دمک کے دکھانے کا موقعہ تو نماز کے بعد ہوتا ہے جب لوگ ایک دوسرے سے ملتے جلتے اور میلوں تماشوں میں جاتے ہیں۔ عید گاہ میں ادب سے ایک جگہہ صف میں چپ چاپ بیٹھے رہنے۔ نماز ادا کرنے۔ خطبہ سننے کا اور دعا مانگنے میں۔ اظہار نمائش کا موقعہ کہاں۔ جہاں نہ کوئی لباس کی عمدگی کی داد دیتا ہے نہ کوئی حشم و خدم کی شان و شوکت کی تعریف کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں عام دلچسپی کی اور کوئی بات بھی نہیں ہوتی۔ نہ وہاں راگ رنگ کا جلسہ ہوتا ہے۔ نہ ناچ گانے کا جمگھٹا ہوتا ہے۔ تماشہ ہونے کے لحاظ سے تھیٹر اور سرکس اس سے بدرجہا بڑھے ہوئے ہیں اژدحام عام ہونے کی حیثیت سے اکثر میلوں میں اس سے زیادہ بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے پھر آخر اس دوگانہ نماز میں وہ کونسی بات ہے کہ بوڑھوں سے لیکر بچوں تک سب کو سب سے زیادہ خوشی اسی کی ہوتی ہے ؎

نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا　　کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے۔

ہماری سمجھ میں تو اس کے سوا اور کچھ نہیں آتا کہ ہو نہ ہو یہ وہ ہی مذہبی جذب اور روحانی کشش ہے جو سب کو کشاں کشاں لئے جاتی ہے۔ اور اس سنت مذہبی کو کسی پر بھی گراں نہیں ہونے دیتی ؎

رشتہ در گردنم افگندہ دوست　　می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

اس کے برخلاف عیسائیوں کے تقریبًا تمام تیوہار ان کے بزرگان مذہب کے واقعات زندگی سے وابستہ ہیں۔ چنانچہ ان کا سب سے بڑا تیوہار کرسمس یا بڑا دن گویا حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی یوم ولادت کی سالگرہ ہے۔ اور ایسٹر ان کے دوبارہ زندہ ہو کر قبر سے اٹھنے اور آسمان پر جانے کے دن کی یادگار کہا جاتا ہے۔ اگرچہ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ وہ فی الواقع مسیحی تیوہار ہی نہ ہو بلکہ مسیحیت نے اسے قدیم بت پرستی کے جشن نوروز سے لیا ہو۔ کیونکہ اشاعت مسیحیت سے بہت دن پہلے سے اسی نام کا ایک جشن روشنی اور بہار کی دیوی آسٹرا۔ کی شان میں ہر سال منایا جاتا تھا۔ اور اب ایسٹر بھی اسی زمانے میں ہوتا ہے۔ اور ان دونو ناموں کی مناسبت بھی ظاہر ہے

اس لحاظ سے اسلامی عیدین ایک مخصوص امتیاز رکھتی ہیں ان کا تعلق نہ تو کسی پیشہ سے ہے۔ نہ وہ بزرگان مذہب کی ولادت و وفات کی سالگرہ ہیں۔ بلکہ وہ نفس مذہب سے پیوستہ ہیں عید الفطر تو ماہ صیام کے بخیر و خوبی ختم ہو جانے کا جشن ہے۔ بلکہ نہیں یہ کہنا بھی درست نہیں۔ کیونکہ خود رمضان المبارک کے روزوں کی فرضیت کی وجہ غالبًا یہ ہے کہ یہی وہ بابرکت مہینہ ہے جس میں نزول قرآن کی ابتدا اور حضور سرور کائنات کی رسالت کا آغاز ہوا۔

شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ	ماہ رمضان جسمیں کلام پاک اترا۔
اور اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ	بیشک ہمنے اسے شب قدر میں اتارا۔

اس بات کا یقینی اور قطعی ثبوت ہیں اس لئے حقیقت میں غرہ شوال کا سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ اسلام اسی تاریخ سے شروع ہوا۔ اور ظاہر ہے کہ

یہاں سرسری طور پر ہم کو یہ بھی دیکھ لینا چاہیئے کہ عام طور پر ہمارے متعارف تیوہاروں کی بنا کیونکر پڑی اور ان کی ابتدا کس طرح سے ہوئی - ہندؤں ہیں تو ان کی بہت ہی کثرت ہے اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ان کے ہاں ہر مہینے میں ایک دو چھوٹے موٹے تیوہار ہو ہی جاتے ہیں مگر ان میں سب سے زیادہ ممتاز اور وقیع یہی تین چار تیوہار ہیں جیسے - ہولی - دیوالی - دسہرہ - راکھی ان میں سے ہولی دیوالی اور راکھی تو یقیناً دراصل مذہبی تیوہار نہیں ہیں - بلکہ موسموں کے آغاز اور اختتام اور فصلوں کی کاشت اور درو کے موقعوں پر گزشتہ کی شکرگزاری اور احسانمندی کا اظہار اور آیندہ کے لئے کامیابی اور خیر طلبی کی دعائیں - جو ایک زراعت پیشہ قوم کے واسطے نہایت ہی ضروری اور حسب حال ہیں - اب ہندوؤں کی اصلیت کی بابت خواہ کچھہ ہی کتھا کیوں نہ کہیں - مگر واقعہ یہی ہے کہ راکھی برسات کے شروع ہونیکا میلا ہے - دیوالی بارش کے اختتام اور کاشت کی ابتدا کا تیوہار ہے - اور ہولی فصل کے بخیر وخوبی درو جانے کا شکرانہ ہے - یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں ہے - لیکن اگر ان تیوہاروں کے منانے کے طریقوں پر غور کیا جائے تو ان سے ہی ہمارے اس قول کی تصدیق ہو سکتی ہے - دسہرہ کو البتہ قدیم اہل ہند کے پیشہ سے کچھہ تعلق نہیں - بلکہ وہ ایک تاریخی واقعے کی یادگار ہے - اور چونکہ وہ واقعہ ایک ایسے شخص کا ہے جو مذہبی حیثیت سے نہایت ہی بزرگ اور مقدس مانا گیا ہے - اس لئے اس کو مذہبی تیوہار سمجھنا چاہیئے -

سے بیت الاصنام بن گیا اور ارکان حج میں طرح طرح[۵] کی خرابیاں اور بیہودگیاں پیدا ہوگئیں۔ تو آخر مشیت ایزدی سے وہ وقت آگیا جسکی بابت ارشاد ہوا ہے کہ

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔	سچ آیا اور جھوٹ مٹ گیا۔ بیشک جھوٹ مٹنے ہی والا تھا۔

اور جب اسلام نے دلوں کو اوہام شرک وبت پرستی سے پاک اور کعبے کو بتوں کے وجود ظاہری سے خالی کردیا تو ارکان حج میں سے وہ تمام لغو اور بے معنی رسمیں بھی محو ہوگئیں۔ جو اس قدیم اور مقدس سنت ابراہیمی کو بدنما اور رسوا کئے ہوئے تھیں۔ اور حج اپنی نہایت ہی پاکیزہ اور پسندیدہ صورت میں آکر اسوۂ حسنہ خلیلی کی ایک دائمی یادگار بن گیا۔ اس کے ارکان میں بھی اسلام نے ناپاکیوں کے مٹانے کے سوا اور کچھ زیادہ تغیر وتبدل نہیں کیا۔ اور آخر یوں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ دعا باحسن وجوہ پوری ہوگئی۔ جو انہوں نے آفتاب اسلام کے طلوع سے تقریباً ڈھائی ہزار برس پہلے مانگی تھی۔

[۵]۔ زمانہ جاہلیت میں عرب کے لوگ کعبے کی زیارت کو آتے تھے تو عجیب عجیب حرکتیں کرتے تھے بعض اوقات طواف کعبہ بالکل برہنہ ہوکر کرتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ حج کے وقت کسی قسم کی آلائش دنیوی ساتھ نہ ہونا چاہئیے۔ گھروں میں آتے تھے تو دروازوں سے نہیں آتے تھے بلکہ پچھواڑے سے دیواریں پھاند کر آتے تھے تلبیہ میں کہا کرتے تھے کہ لاشریک لک الاشریک ہولک (تیرا کوئی شریک

اس بات کو تسلیم کر لینے کے بعد (اور تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں) مسلمانوں کے لئے اس سے زیادہ شادمانی کا کوئی دن ہو ہی نہیں سکتا - اور اس روز وہ جس قدر خوشیاں منائیں بجا اور زیبا ہے - یہ ہے اصل بنا غرۂ شوال کے یوم العید ہونے کی - اور اگر وہ اس اصل وجہ مسرت کو بھول بھی جائیں تب بھی ایک مہینے کے پیہم روزوں کے بعد عید کی سیویوں کا مزہ وہی جانتے ہیں جو روزوں کے لذت آشنا ہیں ع

"تا ب ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی"

عید الضحےٰ تکمیل حج پر امتنان و مسرت کا عملی اظہار ہے اور اس لحاظ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین حنیفی کی یادگار ہے ہر ملک اور ہر زمانے میں مقدس مذہبی مقامات کی زیارت کا دستور رہا ہے - اور اس میں شک نہیں کہ مذہبی خیالات کو زندہ رکھنے اور گزشتہ بزرگوں کی یادگار کو دستبرد روزگار سے بچانے کی اس سے بہتر کوئی صورت نہیں ہو سکتی - یہی سبب تھا کہ مصرع

"دنیا کے بتکدے میں پہلا وہ گھر خدا کا"

جسے ابراہیم خلیل ؑ جیسے بزرگ معمار کے ہاتھوں بننے کا شرف حاصل ہوا تھا - اسلام سے صدیوں پہلے سے مرجع انام اور مرکز خاص و عام تھا - اور دور دور سے لوگ اس کی زیارت کو آتے تھے - اور ہر سال بڑی دھوم دھام سے وہاں حج ہوتا تھا - مگر جب آہستہ آہستہ دین حنیفی کفر کی آمیزش اور شرک کی آلائش سے ناپاک ہو گیا تو خانہ کعبہ کا حرم محترم بھی بیت اللہ

میں شک نہیں کہ یہ نہایت ہی سخت اور وحشیانہ رسم تھی۔ لیکن اسلام سے
پہلے تمام قوموں کی مروجہ قربانیاں خواہ وہ کسی چیز کی ہوتیں اور کسی صورت میں
کیوں نہ کیجاتیں۔ اصولاً دو وجہوں پر مبنی ہوتی تھیں۔ یا تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ آسمانی
قوتیں فدیہ لے لیتی ہیں اور بدل کو قبول کر لیتی ہیں۔ چنانچہ مسیحیت میں
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قربانی کا عقیدہ اسی غلط فہمی پر موقوف ہے
یا یہ خیال کیا جاتا تھا کہ دیوتا کوئی کام معاوضہ لئے بغیر نہیں کرتے اس لئے
ان کے منانے کے واسطے ان کے سامنے ہر قسم کی نذریں اور قربانیاں
چڑھائی جاتی تھیں۔ اور کام جتنا اہم اور ضروری ہوتا تھا اسی قدر اسکی فیس
بھی زیادہ اور قیمتی ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ بڑی بڑی قومی اور ملکی ضرورتوں
کے وقت انسانی قربانی کیجاتی تھی۔ چنانچہ مصر میں ہر سال ایک خوبصورت
دوشیزہ کو دریائے نیل کی نذر چڑھانے کا رواج اسی خیال پر مبنی تھا لیکن
ظاہر ہے کہ یہ دونوں خیال صفات باری تعالیٰ کی بابت لاعلمی اور غلط فہمی
کی وجہ سے تھے۔ اس لئے اسلام نے جب ان اوہام باطلہ کی تردید کی
تو قربانی کے متعلق بھی یہ عقائد فاسدہ مٹا دئے۔ اور عید الضحیٰ کی قربانی
کو بھی صرف سنت ابراہیمی کی یادگار ہونے کے لحاظ سے مسنون کیا۔
مگر اس میں بھی نیت یہی جائز رکھی کہ وہ غربا اور مساکین کو بطور خیرات دینے
اور خود کھانے اور اپنے اعزا و احباب کو کھانے کھلانے کے لئے ہے۔ بارگاہ
خداوندی میں فدیہ یا رشوت سمجھ کر پیش نہیں کیجاتی۔ چنانچہ اسی غلط فہمی
کے انسداد کے لئے یہ صاف اور صریح ارشاد فرمادیا کہ

رَبَّنَآ اِنِّیۡۤ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجۡعَلۡ اَفۡئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَہۡوِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ وَ ارۡزُقۡہُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّہُمۡ یَشۡکُرُوۡنَ ۔
(ع ۵ پ ۱۳)

اے میرے پروردگار میں نے اپنی اولاد کو ایک ویران وادی میں تیرے مقدس گھر کے پاس لبسایا ہے۔ تاکہ وہ تیری عبادت گذاری کریں۔ پس تو لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کردے اور ان کو عمدہ پھلوں کا رزق دے۔ شاید کہ وہ شکر بجالائیں۔

دنیا کے دور و دراز حصوں سے آنے والے لوگوں کو اپنے پاک اور پیارے مذہب کے اس مرکز کے دیکھنے اور فریضۂ حج کے بجالانے سے جتنی خوشی ہو کم ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ عید انہی کی ہے۔ جنکو میدان منا میں قربانی کرنا نصیب ہوا ہو۔ لیکن ان کے طفیل میں اُس روز تمام عالم اسلام میں عید ہو جاتی ہے۔ مگر اس میں بھی سب سے مقدم وہی دوگانہ نماز ہے۔ اس کے بعد اگر استطاعت ہو تو قربانی ورنہ خیر۔ قربانی بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کے زمانے کی یادگار ہے۔ قربانی کا رواج تو دنیا کے سب ہی حصوں میں رہا ہے اور قدیم زمانے میں تو اکثر قوموں میں انسانی قربانی بھی کیجاتی تھی۔ یہاں تک کہ مسیحیت نے تو اسپر بھی قناعت نہ کی اور نعوذ باللہ اپنے خدا ہی کو قربان کرڈالا اس سے پہلے بنی اسرائیل میں بڑے بیٹے کی قربانی کا بھی دستور تھا۔ اور اس

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰۲۔ نہیں ہے مگر وہ شریک کہ وہ تو ہی ہے) جو بالکل بے معنی اور مہمل جملہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

رسوم اسلام

ہیں ہمنے قومی تیوہاروں کا ذکر کیا تھا - اور دیگر مذاہب کے
بس اسلامی عیدوں کی فضیلت اور معقولیت دکھائیگی
یہاں ہم ان رسوم کے متعلق بحث کرنا چاہتے ہیں جن کا
بس ہوسکتا - بلکہ جو فرداً فرداً ہر شخص کو پیدا ہونے سے
قات زندگی میں مثلاً شادی بیاہ وغیرہ کے موقعوں پر ادا
بس ہر ملک اور ہر قوم میں پائی جاتی ہیں اور ان کی تاریخ
م ہوتا ہے کہ ان کی ابتدا عموماً مدنیت کے ساتھ ہوتی
ب دونوں میں برابر ترقی ہوتی رہتی ہے - مگر معاشرت
جے تک پہنچکر رسوم کی ترقی رُک جاتی ہے اور جب وہ
ہیں اس درجے سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے - تو رسمیں ہر
ران میں فضول اُلجھنوں اور بے معنی پیچیدگیوں کی جگہ
یدا ہونے لگتی ہے - یہاں تک کہ آخر جب وہ قوم پوری
نہ ہوجاتی ہے تو اس میں صرف نہایت سادہ اور ضروری
یں - رسوم کی یہ کمی بیشی قومی تمدن اور تہذیب کا نہایت
ہے -

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ۔	اللہ کو نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے نہ ان کا خون - بلکہ اس کو صرف تمہارا تقوی اور پرہیزگاری پہنچتی ہے -

یہ ہے اسلام کے دونوں مسنون تیوہاروں کی کیفیت - اور کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ دنیا کے اور کسی مذہب نے پرانی یادگاریں قایم رکھنے اور قومی مسرت اور شادمانی کے جشن منانے کے ان سے زیادہ سنجیدہ اور پسندیدہ طریقے سکھائے ہیں - یا اور کسی قوم کے تیوہار اپنے ظاہری اور باطنی مقاصد کو ان سے زیادہ بہتر طور پر پورا کرتے ہیں - ہرگز نہیں - یہ اسلام ہی کی خوبی ہے کہ اسنے اپنے تیوہاروں میں بھی ایک طرف تو وہ مذہبی شان پیدا کردی جو اور مذہبوں کی عبادتوں میں بھی نہیں ہے - اور دوسری طرف اپنی روحانی اثر سے ان کو ایسی عام مسرت اور شادمانی کا ذریعہ بنا دیا - جو دوسری قومیں اپنے تیوہاروں میں مکروہ اور ناپسندیدہ اسباب نشاط کی اعانت سے بھی پیدا نہ کرسکیں ہ

ایں سعادت بزور بازو نیست		تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مذہبی اور معاشرتی رسمیں ایجاد کی ہیں تاکہ لوگ ان رسموں کو صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے ہر وقت اس طبقے کے محتاج رہیں۔ بات یہ ہے کہ ہمارے سنے اسلام کا خدا ہی ایسا نہیں ہے کہ اسکی عبادت کے لئے پجاریوں کی وساطت کی ضرورت ہو۔ اسلئے یہاں اس فرقے کی دال نہیں گلی۔ اور اسی سبب سے اسلام فضول اور مہمل رسموں کی زنجیروں میں بھی مقید نہیں ہوا۔

مسلمانوں میں ضروری تو کوئی رسم ہی نہیں البتہ چند رسمیں مسنون ہیں جن کی فضیلت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کو جناب رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مبارک اور مقدس ہاتھوں سے ادا ہونیکا شرف حاصل ہوا ہے۔ یہاں ہم ان کا مختصر ذکر کرتے ہیں اور اسی سے ان کی خوبیاں اور فائدے بھی معلوم ہو جائیں گے۔

مسلمان گھروں میں جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو سب سے پہلے اس کے دائیں اور پھر بائیں کان میں ایک یا زیادہ مرتبہ اذان دیجاتی ہے۔ چونکہ اذان کے الفاظ معروف ہیں اور ہم خود بھی ایک جگہہ ان کو مشرح لکھ چکے ہیں۔ اسلئے اب یہاں ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ مگر غالباً اس سے کسی کو بھی انکار نہو کہ بچے کے کان میں اس سے زیادہ پاکیزہ اور مقدس لفظ کہنے ممکن نہیں ہیں۔ اور گو بچے کو بظاہر اس سے کچھہ فائدہ نہو۔ تاہم اس رسم سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے اپنے پیرووں پر کتنا گہرا اثر ڈالا ہے اور جو اثر ڈالا ہے وہ کیسا معقول اور پسندیدہ ہے۔ پیدائش کے وقت رسمیں تو ہر ایک مذہب اور ہر ایک قوم میں بیسیوں قسم کی ادا کیجاتی ہیں مگر یہاں

رسمیں اکثر مقامی اور ملکی ہوتی ہیں۔ مگر اسلام کا اثر اتنا حاوی اور زبردست تھا کہ اسنے عقائد و عبادات سے لیکر آداب معاشرت و معاملات تک زندگی کے ہر ایک پہلو کو لے لیا۔ اور ہر ایک چیز کو اپنے رنگ میں رنگ دیا۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً	یہ اللہ کا رنگ ہے اور اللہ کے رنگ سے بہتر کون سا رنگ ہو سکتا ہے۔

یہاں تک کہ رسمیں بھی اسکی ترمیم و اصلاح سے نہ بچ سکیں اور گو بہت سی مقامی رسمیں اب تک بھی ہر جگہہ الگ الگ طریقے پر منائی جاتی ہیں۔ مگر ان میں وہ وقعت و عظمت باقی نہیں رہی جو رسموں کی جان ہے۔ اسلام نے فقط وہی چند سادہ اور ضروری رسمیں باقی رہنے دیں جو اپنی کسی نہ کسی تمدنی یا معاشرتی خوبی کی وجہ سے ممتاز تھیں اور اب ان اسلامی رسموں کے مقابلے میں وہ مقامی رسمیں بالکل ہیچ اور پوچ ہو گئیں۔

یہ اسلام ہی کی شان ہے۔ کہ جب کسی مسلمان کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہی تو سب سے پہلے اس کے کان میں اللہ اکبر اللہ اکبر کی صدا گونجتی ہے اور جب ان میں کوئی مرتا ہے تو سب کے آخر میں اس کے دوست اس کے جنازے پر نماز پڑھ کر اسے سپرد خاک کرتے ہیں۔ لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ ایسے گہرے مذہبی اثر کے باوجود بھی مسلمانوں میں اس خاص مذہبی طبقے کا وجود نہیں ہے۔ جسے پریسٹ ہڈ یعنی پجاریوں کی جماعت کہتے ہیں۔ اور جس نے ہمیشہ ہر عہد میں اپنی وقعت قایم کرنے کے لئے عجیب و غریب

روزہ کشائی جو بچے کے پہلی دفعہ روزہ رکھنے کی خوشی میں منائی جاتی ہے۔
یہ تقریبیں اگرچہ مذہبی حیثیت سے کچھ اہمیت نہیں رکھتیں مگر پھر بھی دیکھئے
کہ ان میں مذہبی عنصر کتنا غالب ہے اور لایعنی تکلفات اور بیہودہ مزخرفات
کی تو یقیناً کسی صورت میں اجازت ہی نہیں۔

یہ تو بچپن کے زمانے کی رسمیں تھیں۔ جوانی میں آدمی کی زندگی کا سب سے
بڑا واقعہ شادی ہے۔ اور اس میں ہر جگہہ طرح طرح کی رسمیں ادا کیجاتی ہیں۔ مگر
اسلام میں اسکی بنیاد تو صرف نکاح پر ہے۔ اور اس کے ساتھ فقط ایک
ولیمے کی رسم رائج اور مسنون ہے۔ ولیمہ شادی کی تکمیل کے اعلان اور اظہار
اظہار مسرت کے لئے رشتہ داروں اور دوستوں کی ضیافت کا نام ہے۔
اور کچھہ نہیں۔ چونکہ عام طور پر لوگوں کے ارمان اس سیدہی سادہی دعوت سے
پورے نہیں ہوتے اس لئے بیاہ براتوں میں بڑی دھوم دھام کیجاتی ہے۔ مگر
ان میں سے اکثر رسمیں مقامی ہیں۔ جو مسلمانوں نے اپنی ہمسایہ قوموں
کی دیکھا دیکھی اختیار کرلی ہیں۔ اور وہ تقریباً سب کی سب ایسی ہی ہیں
کہ ان میں سے کوئی بھی ریاکاری۔ فضول خرچی۔ شہرت طلبی اور خودنمائی
سے خالی نہیں ہے۔ اور بعض میں تو صریح منہیات و معصیات کا ارتکاب
ہوتا ہے۔

یہ تو خوشی کے جشن تھے۔ حادثوں اور مصیبتوں پر اسلام نے ہم کو فقط
اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ۔ | بیشک ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور اسی کی
طرف لوٹنے والے ہیں

ہیں ان کی تفصیل کی فرصت نہیں - تاہم ہر شخص خود ہی انصاف کر سکتا ہے
کہ جو رسمیں اس کے ہاں رائج ہیں - ان میں زیادہ معقولیت ہے یا اسلام کی
اس سادہ اور آسان رسم میں ؟ اُس وقت کان میں اذان دینے کے سوا
اور کوئی رسم مسلمانوں میں مسنون نہیں ہے -

پیدائش کے ساتویں دن عقیقہ ہوتا ہے - اس روز ماں اور بچے
کو نہلاتے ہیں - بچے کے سر کے بال اُتارے جاتے ہیں - اس کا نام رکھا جاتا ہے
اور اسی وقت قربانی بھی کیجاتی ہے - جس کا گوشت کچھ تو خیرات کر دیا جاتا
ہے اور باقی کا یا تو کچا ہی دوستوں اور عزیزوں میں بانٹ دیا جاتا ہے - یا
پکا کر ان کو بہ صورت ضیافت کھلا دیا جاتا ہے بہرحال اس قربانی کو کسی حیثیت سے
بھی بچے کی جان کا فدیہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے - بلکہ یہ محض اس تقریب پر
اظہار مسرت کا ایک ذریعہ ہے تاکہ یوں اقارب واحباب کی یکجہتی اور دوستی
میں بھی ترقی ہو - اور اسی کے ساتھ غربا و مساکین کی امداد کا بھی پہلو نکل آئے
غرض یہ بھی نہیں ہے - اور یوں حسب حیثیت و استطاعت جس کا جتنا
جی چاہے دل کھول کر خیرات دے اور دھوم دھام سے جشن کرے - گو اسراف
کسی بات اور کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے -

اس کے بعد بھی ماں باپ اپنے لخت جگر کی نشوونما پر اپنی خوشی کا
اظہار مختلف پیرایوں میں کرتے ہیں اور یوں وقتاً فوقتاً مختلف تقریبیں ہوتی
رہتی ہیں - جیسے دودھ چھڑانے کی تقریب یا بسم اللہ جو بچے کے پڑھنے
بیٹھتے وقت ہوتی ہے - نشرح جو ختم کلام مجید کی مبارک تقریب ہے -

کیوں نام کفن سنکے لرزتا ہی اپنس		ایکدن یہ قبا زیب بدن ہوتی ہے

اس وقت خالص نیت اور سچے دل سے آدمی اپنے خالق حقیقی کی طرف متوجہ ہوکر یہ دعا مانگتا ہے۔

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِحَیِّنَا وَمَیِّتِنَا وَشَاهِدِنَا وَغَائِبِنَا وَصَغِيْرِنَا وَکَبِیْرِنَا وَذَکَرِنَا وَاُنْثَانَا۔ اَللّٰھُمَّ مَنْ اَحْیَیْتَہٗ مِنَّا فَاَحْیِہٖ عَلَی الْاِسْلَامِ وَمَنْ تَوَفَّیْتَہٗ مِنَّا فَتَوَفَّہٗ عَلَی الْاِیْمَانِ۔ اَللّٰھُمَّ لَا تَحْرِمْنَا اَجْرَہٗ وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَہٗ۔

اے اللہ تو بخشدے ہمارے زندوں اور مردوں اور حاضر اور غائب اور چھوٹے اور بڑے اور مرد اور عورت سب کو اے اللہ تو ہم میں سے جسے زندہ رکھے اسے اسلام پر زندہ رکھ اور جسے دنیا سے اُٹھائے اسے ایمان کے ساتھ اُٹھا۔ اے اللہ تو ہم کو اس کے صلے سے محروم مت رکھ اور اس کے بعد ہمکو فتنے میں مت ڈال۔

ایسے وقت میں ایسی دعا اگر اور کچھہ اثر نہ رکھتی ہو تب بھی دل کے صاف کرنے اور نفسانیت پر غالب آنے کے لئے اس سے زیادہ قوی اور سریع التاثیر کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی۔ یہی نہیں بلکہ ایسی دعا سے طبیعت انسانی کو جو تسکین اور تقویت ہوتی ہے وہ اس دلی صدمے کو بھی بہت کم کر دیتی ہے۔ جو ایک عزیز قریب کے مرنے سے ہونا ضروری ہے۔ غرض جس پہلو سے غور کیجئے۔ نماز جنازہ ایک ایسا فرض ہے۔ جو سرتا سر عبرت و موعظت اور پند و نصیحت ہے اور یقیناً مرنے والے کے لئے اس سے بہتر کوئی دعا اور پس ماندگاں کے واسطے اس سے بڑھکر کوئی سبق نہیں ہو سکتا۔

کہنے اور صبر کرنے کی تلقین کی ہے۔ اور ہر طرح کے جزع و فزع اور نوحہ
وماتم سے منع فرمایا ہے۔ رسوم غم میں مرنے والے کی جنازے کی نماز پڑھنا تو
ضروری ہی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے اعزہ و پسماندگاں کے پاس تعزیت
کے لئے جانے اور ان کو تسکین دینے کی بھی تاکید کی گئی ہے۔ کیونکہ دنیا میں
موت سے کسی کو بھی مفر نہیں ہے۔ اور یہ دن سب کو پیش آنیوالا ہے۔ اس لئے
ظاہر ہے کہ ایسے موقعوں پر باہمی ہمدردی اور غمگساری نہایت ضروری اور
لازمی چیز ہے۔ جنازے کی نماز مرنے والے کے لئے سلام رخصت اور دعائے
مغفرت ہے۔ یہ ایک آخری فرض ہے کہ اس کے بعد تمام حقوق و فرائض
کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور ہر طرح کی محبت و اُلفت کا ظاہری رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔
یہاں ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ مرنے کے بعد دوسروں کے نماز پڑھنے سے مرنے
والے کو کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ اس کا کوئی یقینی جواب تو ہم دے ہی نہیں سکتے۔
کیونکہ ہم کو عقلی پہلو سے معلوم ہی نہیں کہ مرنے کے بعد کیا صورت پیش آتی ہے
اور دوسروں کے افعال کا مرنیوالے پر کیا اثر ہوتا ہے۔ مگر کم سے کم یہ تو ظاہر ہی
ہے کہ اگر بالفرض مرحوم کو اس سے کچھ فائدہ نہ پہنچتا ہو۔ تب بھی ان لوگوں
کے لئے جو ابھی بقید حیات ہیں عبرت اور نصیحت کا اس سے بہتر کوئی
موقعہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک عزیز کا جنازہ سامنے رکھا ہے۔ نہیں جنازہ نہیں
بلکہ دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی ناپائیداری کی مجسم تصویر پیش نظر ہے۔
اور ہر شخص اپنے اپنے لئے برأی العین اس مضمون کو دیکھ رہا ہے کہ

؎ طے منزل وحشت و محن ہوتی ہے | فرقت مابین روح و تن ہوتی ہے

طعام اہل اسلام

اسلام کو تمام مذاہب عالم میں یہ خاص امتیاز حاصل ہے کہ اسنے روحانی ترقی کو جسمانی تندرستی اور پاکیزگی سے بے تعلق اور علیحدہ نہیں سمجھا۔ یہ بات ہے بھی نہایت ہی معقول۔ کیونکہ اس عالم شہود میں بہرحال روح اپنے وجود کے اظہار کے لئے جسم کی وساطت کی محتاج ہے۔ اور اسکی ہر طرح کی ترقی اور تنزل کا انحصار محض جسمانی حرکات و سکنات پر ہے۔ یہاں تک کہ تصور و تفکر اور سکون و اطمینان بھی روح سے زیادہ دماغی مادہ کی خاص کیفیات اور جسمانی تاثیرات کے مخصوص نتائج کے نام ہیں۔ لیکن یہ یقینی بات ہے کہ جسم کے تقریباً سارے حالات براہ راست ہماری غذا کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس لئے اس میں بھی کچھ شک نہیں ہو سکتا۔ کہ ہمارا کھانا ہماری جسمانی صحت و توانائی پر ہی نہیں۔ بلکہ ہماری روحانی فلاح و بہبودی پر بھی بہت قوی اثر رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے مقنن نے فقط چند اخلاقی احکام کی تاکید یا بعض روحانی عبادتوں کی تعلیم پر اکتفا نہیں کی۔ بلکہ ہماری کھانے پینے کی چیزوں تک میں بھی دخل دیا۔ اور ہم کو ان کے اچھے بُرے کا سمجھنا اور نیک و بد میں تمیز کرنا بھی سکھایا۔ یہی سبب ہے کہ ہماری کھانے کی چیزیں دنیا بھر کی اشیاء خوردنی میں سب سے زیادہ

ان کے سوا اسلام نے اور کسی رسم کی ضرورت کو تسلیم نہیں کیا اور
غالباً ان کے بعد اور کسی رسم کی حاجت بھی نہیں ہے۔ **بقول غالب مرحوم**

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں۔ اجزائے ایماں ہو گئیں

غذا جذب کرنیوالی جڑوں کو ہٹانا چاہیں یا بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کھانا چھوڑ دیں تو نظام کائنات کو از سر نو بنانے کی ضرورت ہو۔ حقیقت میں اس کے برخلاف کرنا قوانین قدرت کے مخالفت کرنا ہے کیونکہ ان چیزوں کی آفرینش کی علت غائی ہی یہ ہے کہ وہ ان دوسری زیادہ اعلیٰ درجے کی چیزوں کا جزو بدن ہو کر ارتقائی مدارج طے کریں ۵

بجا ہے گلشن عالم میں سب پہولونکا رشک بسر ا	کھلے جس پہولکی دلکی کلی منقار بلبل سے

بہر کیف یہ امر مسلم ہے کہ اصحاب ہنود کا گوشت سے پرہیز اسکی برائی پر دال نہیں ہے۔ اس لئے اس میں کلام نہیں ہو سکتا کہ ہمارے لئے جو کچھہ حلال کیا گیا ہے۔ وہ عین طیب ہے۔ اور اسے ساری دنیا میں کوئی بھی بُرا نہیں کہہ سکتا۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ۔
(ع ۲۱ پ ۲)

اے وہ لوگو جو کہ ایمان لائے۔ تم ان پاکیزہ چیزوں کو کھاؤ جو ہم نے تم کو دی ہیں اور اگر تم اللہ کی بندگی کرتے ہو تو اس کا شکر بجا لاؤ۔

البتہ ایک اعتراض گوشت خوری پر روحانی ترقی کے اعتبار سے کیا جا سکتا ہے اور گو آج کل کے مادہ پرستی کے دور میں وہ اعتراض کچھہ زیادہ وقیع نہو۔ مگر پھر بھی چونکہ وہ ایک اصول کی بنا پر ہے۔ اس لئے ہم اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ گوشت ایک مہیّج غذا ہے اس لئے وہ شخص جو اپنی مادی اور جسمانی خواہشوں کو دبا کر روحانی ترقی کی

نفیس اور پاکیزہ مانی جاتی ہیں - کیونکہ جو چیزیں ہمارے ہاں حلال ہیں وہ
بالاتفاق دنیا کی کسی قوم کے نزدیک بھی بری نہیں ہیں - ہاں اور قوموں کی
جائز چیزوں میں سے ضرور کوئی نہ کوئی شئے ہمارے نزدیک حرام ہے - ہمارے
کھانوں کی فضیلت کی یہی ایک دلیل کافی ہے - یہ سچ ہے کہ گوشت جو
ہمارے ہاں حلال ہے اسے اہل ہنود مکروہ سمجھتے ہیں لیکن ان کی یہ کراہیت
جانداروں کی عظمت و حرمت کی وجہ سے ہے - گوشت کے کسی قسم کے
نقصان یا مضرت کے سبب سے نہیں ہے - واقعات بتاتے ہیں کہ قدیم آریہ
ورت میں تو ہر قسم کے جانوروں کا گوشت کھایا جاتا تھا - یہاں تک کہ بیلوں
کی بھی قربانی ہوتی تھی - مگر بدھ اور بالخصوص جین مت میں جیو رکھشا پر نہایت
زور دیا گیا - اور صدیوں تک ان مذہبوں کے باہمی اختلاط نے ہندوؤں
کے دلوں میں جان کی حفاظت کا خیال پیدا کر دیا جو رفتہ رفتہ جزو مذہب
بن گیا - چونکہ ہندوستان جیسے زراعت پیشہ ملک کے لئے گائے نہایت
ہی مفید اور کارآمد جانور ہے - اس لئے گو قدرتاً تو پہلے ہی سے بہت تھی -
مگر اب خاص طور پر اس کی پرورش اور نگہداشت کی طرف توجہ ہو گئی
اور آہستہ آہستہ اس کا مارنا گناہ کبیرہ بنگیا - ہم اس اصول کو دل سے تسلیم
کرتے ہیں اور مانتے ہیں کہ گوشت سے احتراز - رحم اور ہمدردی پر مبنی تھا -
لیکن اس کا کیا جواب ہے کہ قدرت نے اصولاً دنیا میں ادنیٰ درجے کی چیزوں
کو اعلیٰ درجے کی چیزوں کی خدمت کے لئے بنایا ہے اگر سربفلک درخت
اپنے سائے میں اُگنے والے ننھے ننھے پودوں کے آس پاس سے اپنی

(ان کے قول کے مطابق) ان کی ایک دوست جولیا کی روح نے لکھے ہیں ان میں روحانی ترقی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچنے کے جو طریقے بتائے گئے ہیں۔ وہاں صاف طور پر گوشت سے پرہیز کرنے کی ممانعت کر دی ہے۔ چنانچہ جولیا لکھتی ہے "ورزش کرو۔ زندگی کا مقصد کھانا مت سمجھو۔ بلکہ کھانا زندہ رہنے کے لئے کھاؤ۔ نہیں غذا کی کوئی بندش نہیں ہے۔ جو تمہارا جی چاہے کھاؤ۔ کھانے پینے کے لئے صرف ایک ہی قاعدہ ہے اور وہ یہ کہ اسے استعمال کرو" اس مقام پر مسٹر سٹیڈ نے یہ کہا کہ "تو تم صرف نباتی غذاؤں کی تاکید نہیں کرتیں" جواب "نہیں ان مقاصد کے لئے محض نباتی غذاؤں کی قید غیر ضروری ہے۔ اگر تم ہمیشہ سے یہی کھاتے ہوتے تو اور بات تھی۔ ممکن تھا کہ اس حالت میں تمہارے لئے یہ مفید ہوتا۔ مگر اب تمہارے لئے اور ان سب آدمیوں کے واسطے جو ملے جلے کھانے کے خوگر ہیں روحانی بصارت حاصل کرنے کے لئے نباتات خوار بنجانا۔ ٹھیک نہیں ہے"[لے]

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۸۔ بالکل مشتبہ نہیں رہتی ہے۔ اس لئے ہمکو بھی بلا جانے بوجھے اسپر کوئی اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس کتاب کا نام آفٹر ڈیتھ یعنی بعد الموت ہی ہے میں نے "اسلام اور روحانیت" کے باب میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ جہانتک میرا خیال ہے۔ اس کتاب کے ہر ایک مضمون سے اسلامی عقائد کی تائید ہوئی ہے بلکہ حقیقت میں اسکے مسائل اسلامی تعلیم کا ایک دھندلا سا پرتو ہونیکے سوا اور کچھ ہیں ہی نہیں۔ بہر حال یہ ایک قابل دید اور قابل قدر کتاب ہے۔ مسٹر سٹیڈ کا انتقال ۱۹۱۳ء میں جہاز ٹائی ٹینک کی غرق آبی سے ہوا تھا۔

ملے ملاحظہ ہو "آفٹر ڈیتھ" جدید ایڈیشن صفحہ ۸۸

طرف بڑھنا چاہیے - اسے اس سے احتراز کرنا چاہیے - چنانچہ آجکل کے روحانیت جدید کے بڑے بڑے حامی اور تھیوسوفی کے معلم اسی بنا پر گوشت کے استعمال سے روکتے ہیں - اور نباتی غذاؤں کے استعمال کی راے دیتے ہیں اس میں شک نہیں کہ یہ اعتراض بہت سخت ہے - اور میں اپنی متفقہ رایوں کا جواب مشکل سے دے سکتا تھا - کیونکہ میں اسلام کے صوفیائے کرام کے اقوال سے اسکی تردید کرتا - مگر آجکل ان کو کون مانتا - لیکن خدا کی قدرت ہے کہ اسنے انہی لوگوں میں سے ایک شخص کی وساطت سے اس قول کی ایسی تردید کرادی جسے ہم سے زیادہ خود وہی لوگ تسلیم کرتے ہیں اور یقینی سمجھتے ہیں - اس لئے یہاں مجھے اس اعتراض کا جواب دینے کے لئے صرف اسی مضمون کا مختصر طور پر اعادہ کر دینا کافی ہوگا - یہ مضمون میں نے ان خطوط سے لیا ہے - جو مشہور مضمون نگار مسٹر[۵۱] سٹیڈ مرحوم کے قلم سے

۵۱ - مسٹر ڈبلوٹی سٹیڈ - انگلستان کا ایک بہت مشہور اور قابل احترام جرنلسٹ تھا جس کے اہتمام سے وقتاً فوقتاً بہت سے اخبار اور رسالے شایع ہوتے رہے - ان میں سب سے زیادہ مشہور ریویو آف ریویوز ہے - یہ شخص اپنی راستبازی - دیانتداری - آزادہ روی اور سنجیدہ مزاجی کی وجہ سے بڑی عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا - اسے اوٹومیٹک رائٹنگ میں خاص دستگاہ تھی - چنانچہ اسی طریقہ پر اسکے قلم سے بہت سے مضامین اور خطوط لکھے گئے - جو گویا اسکی ایک دوست جولیا کی روح نے اس کے ہاتھ سے لکھے تھے یہ مضامین ایک کتاب کی صورت میں متعدد مرتبہ شایع ہو چکے ہیں اور چونکہ اب محققین کے نزدیک ایسی تحریر

اس بحث کو پیش نظر رکھکر غور کیجئے۔ کہ صرف خواص کے لئے ہی نہیں بلکہ عام طور پر سب کو ایسی ضروری اور مفید غذا سے محض اس احتمال سے روک دینا کہ وہ روحانی ترقی میں حارج ہوگی کہاں تک مناسب ہے۔ اور پھر اب تو آجکل کی روحانیت ہی کے وسیلے سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ وہ احتمال جو سیکڑوں ہزاروں برس سے تمام لوگوں میں پھیلا ہوا تھا۔ وہ بھی فی الواقع بے بنیاد اور غلط ہی اور اسلام نے جو احکام دئے تھے۔ وہ ہر پہلو سے درست اور سچا تھے یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص فرط احتیاط و شدت اتقا سے اپنے اوپر ہر قسم کی لذتوں کو حرام کرلے۔ اور گوشت وغیرہ کھانا چھوڑ دے تو اس سے ہم کو بھی انکار نہیں کہ یہ ایک اچھی نیت ہی۔ خدا اس کے ارادے میں برکت دے اسلام نے اس کو کہیں اس سے منع نہیں کیا۔ اور گوشت خوری کو جزو مذہب نہیں ٹھیرایا۔ البتہ اس نے جو کچھ حکم دیا ہے۔ وہ کسی طرح بھی قابل اعتراض نہیں ہے۔

اس لئے اپنے ہاں کی حلال چیزوں کی بابت تو ہمکو اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں دیکھنا یہ ہے کہ ہم کو روکا کن چیزوں سے گیا ہے۔

اکثر اقوام عالم میں اشیا خوردنی کی بابتہ رسم و رواج کے سوا اور کوئی مقررہ قاعدہ نہیں ہے چنانچہ انجیل بھی اس باب میں ساکت ہے اور مسیحیت نے بھی ایسی بے تعلق باتوں سے سروکار نہیں رکھا۔ یہود کا یہ حال تھا کہ کُلُّ الطَّعَامِ حِلًّا لِّبَنِیْ اِسْرَآءِیْلَ | بنی اسرائیل پر تمام کھانے جائز تھے سوائے

یہ بحث یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ جب مسٹر سٹیڈ نے ایسے اہم مضمون کو اپنی ذمہ داری پر شائع کرنے میں تامل کیا۔ اور اسے تھیوسوفی کے ایک ارکن رکین اور مسز بیسنٹ[۵۱] کے خلیفہ اعظم مسٹ لیڈ بیٹر کے پاس استصواباً بھیجا۔ تو اس نے بھی اس مضمون کے صرف ایک اسی مسئلہ سے اختلاف کیا۔ اور مسٹر سٹیڈ کو اس کے جواب میں یہ لکھا کہ "مجھے ہمیشہ تجرد اور گوشت اور شراب سے پرہیز کی تائید کی گئی ہے۔ اور میرے نزدیک یہ باتین اس سے زیادہ اہم ہیں۔ جتنا کہ جولیا نے ان کو قرار دیا ہے۔ یہ امر میں بلاشبہ تسلیم کرتا ہوں کہ اپنے جسم کو تندرست رکھنا آدمی کا فرض ہے مگر میرے خیال میں اسے اسپر قابو رکھنا چاہیئے۔ اور اسے استعمال کرنا چاہیئے۔ یہ نہیں کہ خود اسکی خواہشات کا بندہ بنجائے۔"[۵۲] مگر اس اعتراض کے جواب میں بھی جولیا نے اپنے پہلے ہی قول پر اصرار کیا ہے۔ اور ایسے پرہیز کو جو جسمانی تکلیف کا باعث ہو۔ مفید ہونے کی بجائے مضر قرار دیا ہے۔[۵۳]

[۵۱]۔ غالباً بہت کم تعلیم یافتہ ہندوستانی مسز اینی بیسنٹ کے محترم نام سے ناآشنا ہونگے۔ یہ ایک نہایت قابل اور فاضل مقررہ اور مصنفہ ہیں اور خاصکر تھیوسوفی میں ان کا رتبہ معلم اول کا سمجھا جاتا ہے۔ ان کو ہندوستان سے ایک خاص ہمدردی ہے۔ بہر حال بحیثیت مجموعی وہ ایک نہایت ہی بزرگ اور قابل عزت خاتون ہیں۔

[۵۲]۔ ملاحظہ ہو۔ کتاب مذکور ضمیمہ صفحہ ۱۵۹ [۵۳] ملاحظہ ہو کتاب مذکور ضمیمہ صفحہ ۱۶۰

حب نور اور بڑی بھی چیزیں بھی ہم پر حرام کی گئیں جنکی تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ لیکن چونکہ ایسی اشیاء کو آدمی عموماً بالطبع ناپسند کرتا ہے اس لئے ان کی ممانعت کے لئے احادیث و سنن نبوی کافی سمجھی گئیں۔

اگر ہم ان ممنوعات میں سے ہر ایک چیز کے سارے نقصانات بتا کر اس کی وجہ ممانعت سمجھانے کا دعوی کریں۔ تو یقیناً ہماری غلطی ہوگی۔ کیونکہ حالت تو یہ ہے۔ کہ ہم ایک معمولی طبیب کے تجویز کئے ہوئے پرہیز کی ساری عقلی وجہیں سمجھنے سے قاصر ہیں۔ تو کیونکر ممکن ہے کہ ہم اس عالم مطلق اور حکیم برحق کے بتائے ہوئے پرہیز کے سارے عاجل و آجل نقصانوں اور مضرتوں سے واقف ہوں

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا | اور تم کو زیادہ علم نہیں دیا گیا۔

لیکن پھر بھی یہ ظاہر ہے کہ اسلام نے خون کے کھانے کی قطعی ممانعت کی ہے۔ چنانچہ اسی سبب سے حلال جانوروں کو بھی ذبح کرنا ضروری ہے تاکہ انکے جسم کا سارا بہتا ہوا خون نکل جائے۔ اور اس اصول کے مطابق ان تمام صورتوں میں حلال جانوروں کا گوشت بھی حرام کر دیا گیا جنمیں وقوع مرگ سے پہلے دم مسفوح کا خارج ہو جانا یقینی نہیں ہتا۔ اللہ کی حکمت بالغہ نے تو نہیں معلوم اس میں کیا کیا ضرر دیکھ کر ایسا حکم دیا ہوگا لیکن اتنا تو آج کل کے ڈاکٹر بھی بتاتے ہیں کہ اکثر بیماریوں کا مادہ اور بیشتر امراض کے جراثیم خون ہی میں ہوتے ہیں۔ اور اسی کے توسط

إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ۔

ان کھانوں کے جو ان لوگوں نے نزول توریت سے پہلے خود اپنے اوپر حرام کر لئے تھے۔

ہندو اور بدھ مذہب کے قانون میں بھی اس بحث کو جگہہ نہ ملی اور آخر اسلام ہی نے دنیا کو یہ بھی بتایا کہ یہ چیزیں انسانی غذا بننے کے قابل نہیں ہیں

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ۔

(ع ۱ پ ۶)

تم پر حرام کیا گیا مرا ہوا جانور اور خون اور سور کا گوشت اور جو جانور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر مارا گیا ہو۔ اور جو گلا گھٹنے سے مرا ہو اور جو چوٹ سے مرا ہو اور جو اوپر سے گر کر مرا ہو اور جو سینگ کی چوٹ سے مرا ہو اور جسے درندے نے پھاڑ کھایا ہو۔ مگر جسکے مرنے سے پہلے تم اسے ذبح کر لو (وہ حلال ہے) اور جو کسی بت پر چڑھا کر ذبح کیا گیا ہو اور یہ بھی ناجائز ہے کہ جوے کے تیروں کے پانسوں سے جانور کا گوشت آپس میں بانٹو۔

یہ سب قیود تو سور کے سوا باقی ایسے جانوروں کے متعلق ہیں جو معمولی طور پر حلال ہیں اور اسی وجہ سے چونکہ ان کی خاص طور پر ممانعت کی ضرورت تھی اسلئے کلام پاک میں ان کی بابت حکم آیا۔ ان کے علاوہ ہر قسم کے درندے اور شکاری جانور کیڑے مکوڑے اور ہر طرح کے مکروہ اور گھناؤنے

حرام ٹھہرایا ہے۔ جن کے طریقہ ذبح میں کچھ شائبہ شرک پایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسکی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ طبائع میں زمانہ بت پرستی کے جو ناپاک اور مشرکانہ رسم و رواج جمے ہوئے تھے وہ نکل جائیں اور دلوں میں ایک معبود حقیقی کے سوا اور کسی کے قابل پرستش ہونے کا کبھی بھولے سے خیال تک نہ آئے۔ کیونکہ یہ تو بدیہی بات ہے کہ جانور کا گوشت اس کے ذبح کے طریقے سے اثر پذیر نہیں ہوتا۔ مگر اسلام اپنی تعلیم میں جسم اور روح دونوں کی بہتری اور بہبودی کا خیال رکھتا ہے۔

بہرکیف اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اسلام نے جن چیزوں کو حلال کیا ہے وہ بالاتفاق نہایت ہی پاکیزہ اور پسندیدہ ہیں اور ہمکو یہی ارشاد ہوا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ع پ ۲	اے لوگو زمین کی پاک اور حلال چیزوں کو کھاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو۔

کھانے پینے کی چیزوں میں شراب اور دیگر مسکرات کو ناجائز ٹھیرا کر بھی اسلام نے دنیا پر بہت بڑا احسان کیا ہے اور اس بارے میں اسکا اور مذہبوں سے ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ کیونکہ شراب اکثر اقوام عالم کو ہمیشہ سے اتنی مرغوب رہی ہے کہ انہوں نے اسے اپنے دیوتاؤں کا آب حیات قرار دے رکھا ہے۔ اور کبھی کوئی بھینٹ یا قربانی اس دلپسند چیز کے بغیر مقبول نہیں ہوتی۔ خیر اور مذہبوں کو تو جانے دیجئے

سے سارے بدن میں سرایت کرتے ہیں۔ بلکہ بہت سے مرض تو خون کے اپنی اصلی اور طبعی حالت سے متغیر ہو جانے ہی کی نمایاں صورتیں ہیں چنانچہ اسی لئے طب کی تحقیقات جدیدہ کے مطابق بہت سی بیماریوں کا علاج یہ تجویز کیا گیا ہے کہ دوا پلانے کے بجائے ٹیکا لگا کر براہ راست خون میں پہنچائی جائے تاکہ وہ خون کے مزاج کی اصلاح کر کے ازالۂ مرض کرے۔ ایسی صورت میں خون کے حرام ہونے کی وجہ آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ اور یہیں سے طبی قاعدوں کے لحاظ سے ذبیحے کی غیر ذبیحے پر فضیلت دیکھی جا سکتی ہے۔

سور کا گوشت اگرچہ یورپ میں عام طور پر کھایا جاتا ہے۔ مگر وہیں کے تجسس و تفتیش سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ اس گوشت میں بعض ایسے جراثیم ہوتے ہیں۔ جو اُبالنے اور پکانے سے بھی زائل نہیں ہوتے اور جو جسم انسانی میں نشو نما پا کر گوناگوں امراض کا سبب بنجاتے ہیں۔ عجب نہیں کہ ایسے ہی احتمال سے اسلام نے اسکی ممانعت کی ہو۔ بہرحال یہ محض ہمارے قیاس ہیں اور ممکن ہے کہ صحیح نہ ہوں۔ مگر ہمارے نکتہ خیال سے تو مسیحیت میں بھی سور ناپاک ہی سمجھا جانا چاہئیے تھا۔ کیونکہ از روئے انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھوتوں اور پلید روحوں کو آدمیوں سے نکالکر انہی جانوروں میں حلول کرنے کی اجازت دی تھی لیکن غالباً اس واقعہ کی علمائے عیسوی نے زیادہ پروا نہیں کی۔

ان کے سوا اسلام نے ان عام طور پر حلال جانوروں کو بھی

أَنْتُم مُّنْتَهُوْنَ۔ | سے باز رہو گے۔

کسی چیز کا اس سے بڑھ کر اور کیا نقصان ہو سکتا ہے کہ آدمی خدا کو بھول کر اپنی انسانیت کھو بیٹھے اور جانوروں کی طرح اپنے ابنائے نوع کے حقوق کی رعایت اور اپنے فرائض کی بجا آوری کے ناقابل ہو جائے۔

اب رہا یہ امر کہ آیا فی الواقع شراب سے یہ نقصان ہوتے بھی ہیں یا نہیں۔؟ اس کا جواب ہمکو دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ اس کی بابت ہماری طرف سے یورپ کی ان ٹمپرنس سوسائٹیوں سے پوچھا جائے۔ جو مذہب اور قانون اور رواج کی متفقہ اجازت کے باوجود بھی شراب نوشی کی روک تھام میں اتنی کوشش کر رہی ہیں۔ کیونکہ ان کا وجود ہی اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ وہاں میخواری کے تلخ نتائج حد برداشت سے بڑھ گئے ہیں۔ اس ایک بات سے ہی اسلام کے اس اخلاقی اثر اور روحانی جذبات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسنے ایک حکم

إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ

بیشک شراب اور جوا اور بت اور پانسے ناپاک شیطانی کام ہیں پس تم ان سے پرہیز کرو اور بچو تاکہ تم بہبودی حاصل کرو۔

دیکر ہمیشہ کے لئے اپنے بیشمار پیرووں میں سے اس عادت بد کو کس آسانی سے نکال دیا جو نشہائے پشت کے رواج سے طبیعت ثانیہ بن گئی تھی۔ اور جس کے انسداد کی کسی مذہب نے اس سے پہلے جرأت تک نہیں کی تھی اس کے مقابلے میں اب باوجودیکہ شراب کے مخرب صحت و اخلاق نقصانات

انجیل مقدس[5] سے معلوم ہوتا ہے کہ خود حضرت عیسیٰ علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام بھی اس سے قطعاً احتراز نہیں کرتے تھے اور اوسکی ممانعت تو انہوں نے یقیناً نہیں فرمائی تھی۔ آغاز اسلام کے وقت عرب میں بھی اس کا نہایت عام رواج تھا۔ اور اسلام نے خود بھی اس کے فوائد سے انکار نہیں کیا چنانچہ ارشاد ہوا کہ

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ	لوگ تجھسے شراب اور جوئے کی بابت پوچھتے ہیں۔ تو کہدے کہ ان دونوں باتوں میں بڑا گناہ ہے۔ اور آدمیوں کے لئے فائدے بھی ہیں۔

مگر اس کے ساتھ ہی چونکہ یہ بھی ہے کہ

وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا	اس کے نقصان اس کے فائدوں پر غالب آجاتے ہیں۔

اس لئے وہ حرام کردی گئی۔

اسلام نے ان مضرتوں کو بھی کس خوبصورتی اور خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے۔

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ	بیشک شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ سے تم میں باہم دشمنی اور بغض ڈالدے۔ اور تم کو اللہ کی یاد اور نماز سے باز رکھے تو کیا تم اب بھی ان سے باز آؤ گے

[5]۔ ملاحظہ ہو انجیل متی باب ۲۶۔ آیت ۲۷۔ ۲۸۔

بھی پلاتے تھے۔ قمار بازی ہوتی تھی۔ اور قرعہ اندازی سے کسی جانور کے حصے بخرے کئے جاتے تھے۔ جیتنے والے اپنے حصے دوستوں کی دعوت اور مہمانوں کی ضیافت میں صرف کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ شراب نوشی اور قمار بازی پر فخر و مباہات کیا کرتے تھے۔ اور ان کو دولتمندی کی شان اور سخاوت کا نشان سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے ؎

نُحَابِیْ بِھَا اَکْفَاءَنَا وَنُھِیْنُھَا وَنَشْرَبُ فِیْ اَثْمَانِھَا وَنُقَامِرُ	ہم اپنے اونٹ اپنے بھائی بندوں کو بخشدیتے ہیں۔ اور مہمانوں کے لئے ذبح کرتے ہیں اور ان کی قیمت سے شراب پیتے ہیں اور جوا کھیلتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اس نکتۂ خیال سے دیکھا جائے تو بلا شبہ ان عادتوں میں مدح کا ایک پہلو نکلتا ہے اور وہ اشارۂ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ کے فخر کی مستحق معلوم ہوتی ہیں۔ مگر انجام ان لوگوں کا بھی وہ ہی ہوتا تھا جو آج کل کے ان آدمیوں کا ہوتا ہے جن کے نزدیک شراب نوشی کثرت عیاشی کا ایک ذریعہ اور قمار بازی زر پرستی کا ایک طریقہ ہے۔ یعنی ان میں انہماک کی وجہ اور غرض کچھ ہی ہو مگر نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ کہ ان کی وجہ سے آدمی حق و باطل میں فرق اور نیک و بد میں تمیز نہیں کرسکتا۔ اور دنیا میں ذلیل و خوار اور عقبیٰ میں نادم و شرمسار ہوتا ہے۔

جوئے کے ناجائز ہونے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ اصولاً ہی ظلم اور بے انصافی پر مبنی ہے۔ اسکی ہار بے وجہ اور جیت بے سبب ہوتی ہے۔ اور

اتنے نمایاں ہو چکے ہیں کہ خود شراب نوش قومیں بھی ان سے انکار نہیں کر سکتی ہیں اور انہوں نے اپنے تحفظ کے لئے اتنی بڑی بڑی انجمنیں اور سوسائٹیاں بنا کر اس کے روکنے کی کوشش کی ہے۔ مگر نتیجہ ہیچ۔

بہر حال یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ لیکن شراب کے نقصانات کے اتنے صاف اور بدیہی ہونے کے بعد ہم کو اسلام کی اس حکمت بالغہ کی تصریح کرنے کی ضرورت نہیں رہتی جس نے ہمیں اس مہلک اور مضر چیز سے پرہیز کرنے کی ہدایت کی ہے۔ اور یقیناً اسلام کا سختت سے سخت مخالف بھی اس خاص شان امتیاز میں دنیا کے کسی اور مذہب کو اسلام کا حریف نہیں ٹھہرا سکتا۔

یہاں ضمناً ایک اور نکتہ بھی قابل بیان ہے۔ کلام پاک میں ہر جگہ شراب اور جوئے کا ذکر اکٹھا کیا گیا ہے۔ اسکی وجہ غالباً یہ ہے کہ اکثر مجالس رندی میں یہ دونوں چیزیں باہم لازم ملزوم ہوتی ہیں۔ بزم بادہ کشی میں دل لگی کا بہترین مشغلہ قمار بازی ہوتا ہے۔ اور محفل قمار بازی میں ہار کا رنج مٹانے یا جیت کی خوشی منانے کا سب سے اچھا ذریعہ شراب نوشی سمجھا جاتا ہے۔ غالب نے اس حالت کی تصویر کھینچی ہے اور کیا اچھا کہا ہے ؎

بادہ بہ وام خوردۂ و زر بہ قمار باختہ		وہ کہ ز ہرچہ ناسزاست ہم بہ سزا نہ کردہ ایم

عرب جاہلیت میں تو یہ دستور ہی تھا کہ جہاں یاران ہمدم کی صحبتیں گرم ہوتی تھیں وہاں شراب کے دور چلتے تھے۔ آپ بھی پیتے تھے اوروں کو

اسلام اور روحانیت

اسلام کی روحانی تعلیم کی بابت ہمارا اس سلسلے میں کچھ کہنے کا ارادہ نہ تھا۔ کیونکہ اس میں ہمنے شروع ہی سے اسلامی تعلیم کی تمام خصوصیات پر عقلی پہلو سے غور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور آجکل کے الحاد اور مادہ پرستی کے زمانہ میں روحانیت اور معقولیت میں بعد المشرقین سمجھا جاتا ہے۔ اسلئے کسی تعلیم کے روحانی اثر کے اظہار کا خیال ہی فضول ہے۔ ظاہر ہے کہ جہاں سرے سے روح کا وجود ہی مسلم نہو۔ وہاں یہ دکھانا کتنا مشکل ہوگا کہ اس خاص قسم کے طرز عمل سے روحانی قوتوں میں اتنی ترقی ہوئی۔ اس باب میں ہمارے سکوت کا یہ عذر کافی تھا مگر جب بعض مخالفین اسلام کی کتابوں میں یہ اعتراض ہمکو نظر آیا کہ اسلام نے کسی قسم کی روحانی تعلیم ہی نہیں دی تو چارونا چار ہمکو اس مبحث پر بھی قلم اٹھانا پڑا۔

جس طرح ورزش کا منشا یہ ہے کہ اعضائے جسمانی میں طاقت آئے اور تعلیم کا مدعا یہ ہے کہ دماغی قوتوں کی نشوونما ہو۔ اسی طرح مذہب کا اصلی مقصد یہ ہے کہ وہ ہماری اخلاقی اصلاح اور روحانی ترقی میں ممد و معاون ہو اور اس کے تمام اعمال و عبادات کی غایت و غرض اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ ہم کو علائق دنیوی سے یکسو کرکے ہماری قوائے باطنی کو بیدار

یہ ناحق شناسی اسلام کی منصف مزاجی کے نزدیک کسی طرح روا نہیں ہو سکتی یہ بھی ہے کہ جوئے میں ہارنا اس میں انہماک سے مانع ہونیکی بجائے اور اُلٹا اس کا محرک ہوتا ہے - کیونکہ آدمی ہر بار یہی خیال کرتا ہے کہ اب کے ضرور جیت جاؤنگا - یوں لالچ اسے رکنے نہیں دیتی - یہاں تک کہ آخر وہ ہمیشہ قلاش ہو کر اُٹھتا ہے - بلکہ بعض اوقات تو اپنے آپ کو اور اس سے بھی بڑھکر اپنے ننگ و ناموس تک کو حرص کی دیوی پر بھینٹ چڑھا دیتا ہے - پھر اس کے مقابلے میں اتنا سا بھی فائدہ نہیں ہے کہ جیتنے والا تو کچھہ بہتر حالت میں رہے - نہیں - کیونکہ اس کے پاس روپیہ بے مشقت آیا ہے - اس لئے وہ اس کی قدر نہیں کر سکتا - اور حرص مزید میں اسے بھی اسی طرح کھو دیتا ہے جس طرح اس نے حاصل کیا تھا - اور اس کا انجام بھی وہی رسوائی بربادی اور تباہی ہوتا ہے - غرض جوئے سے کسی کو بھی کسی طرح کا فائدہ نہیں پہنچتا - اس کے نقصانات کے متعلق ہم کو اس سے زیادہ کچھہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے - کیونکہ اب وہ اس قدر مسلم ہیں کہ اکثر سلطنتوں نے قانوناً اسکی روک تھام کر دی ہے - اور یوں اگرچہ بظاہر وہ اسلام کی متبع نہیں ہیں مگر حقیقت میں اسی کے سکھائے ہوئے اصول پر کاربند ہو رہی ہیں اور اسکو تسلیم نہ کرنا انکی ناحق ناشناسی اور ناشکرگزاری ہے ؏

منکر مے بودن و ہمرنگ مستان زیستن		وجہد و منع بادہ زاہد ایں چہ کافر نعمتیست

ایک حد تک تجربے کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ریاضت اور نفس کشی سے روح قوی ہوتی ہے۔ اور خواہشات مادی اور علائق دنیوی میں انہماک سے یہ طاقت کمزور ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اکثر مذہبوں میں عام اخلاقی تعلیم اور معمولی عبادتوں کے علاوہ خواص کو سخت مجاہدے کرنے کی بھی ہدایت کی گئی ہے۔ چنانچہ ہندوؤں میں جوگ اور عیسائیوں میں رہبانیت کا وجود اسی غرض سے ہوا۔ اور اسی نعمت بے بہا کے حاصل کرنے کے لئے انسانوں نے ایسی ایسی ریاضات شاقہ برداشت کیں۔ کہ شاید اس سے زیادہ محنت اور کسی کام میں نہیں کی گئی۔ گھربار اہل وعیال سے علیحدہ ہوئے تجرد اور تنہائی اختیار کی اچھا کھانا پہننا چھوڑا۔ مہینوں برسوں تک روزے رکھے اور چلے کھینچے۔ غرض جسم مادی کو دبانے اور کمزور کرنے کے وہ طریقے نکالے جن کو سنکر اب تعجب ہوتا ہے۔ ہاتھ اُٹھایا تو اسے سُکھا لیا۔ ایک پانوں پر کھڑے ہوئے تو اسے بالکل سن کر دیا۔ جب آسن پر بیٹھ گئے تو برسوں تک پہلو نہیں بدلا۔ یہاں تک کہ حبس دم کی مشق کی اور سانس تک لینا بند کر دیا۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ ان جانکاہ ریاضتوں سے کیا کیا فائدے ہوئے۔ ممکن ہے کہ قدیم ہندوستان کے جوگیوں کے جو حیرت انگیز قصے مشہور ہیں ان میں بہت کچھ واقعیت اور صداقت ہو۔ اور وہ سب روحانیت ہی کے کرشمے ہوں۔ مگر اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ وہ لوگ دنیا کے مطلق کسی کام کے نہیں رہتے تھے۔ نہ ان کی ذات سے ان کے ابنائے جنس کو کچھ فائدہ تھا نہ ان کے

کریں اور یوں عرفان و تقرب الی اللہ کی طرف راہبر ہوں - اور جس مذہب کے ارکان اس مدعائے عالی کو پورا نہ کریں - وہ مذہب یقیناً اپنے فرض منصب کو ادا کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا - یہ سچ ہے کہ جیسے نکوکاری کسی خاص قوم کے ساتھ وابستہ نہیں ہے - ویسے ہی روحانی ترقی بھی کسی ایک مذہب کا مخصوص حصہ نہیں ہے بلکہ کم و بیش تمام بڑے بڑے ادیانِ عالم کی تعلیم میں اس کو مدنظر رکھا گیا ہے - مگر ان کے اثرات کے باہم موازنہ کرنے میں بڑی دشواری یہ ہے کہ ہم صورت پرست اور ظاہر بیں لوگوں کے لئے روحانی ترقی کا کوئی معیار مقرر کرنا اتنا ہی مشکل ہے جیسے کسی علم البرق سے ناواقف آدمی کے لئے برقی رو کی طاقت کا صحیح اندازہ اور امتحان کرنا دشوار ہے - ایسی صورت میں کیونکر ممکن ہے - کہ ہم اسکی ترقی کے مختلف مدارج کا ایک دوسرے سے ٹھیک طور پر مقابلہ کریں اور یہ دیکھیں کہ وہ ترقی کن اسباب پر مبنی ہے - البتہ ہم اس کے نہایت ہی بدیہی اور نمایاں نتائج کو دیکھ سکتے ہیں اور انہی کو پیش نظر رکھکر اس بحث کو لیتے ہیں -

روح اور جسم کا تعلق کچھ ایسا عجیب اور پیچیدہ تعلق ہے کہ مادی دنیا میں اسکی کوئی مثال نظر نہیں آتی اسلئے اس کا سمجھ میں آنا بھی تقریباً محال ہے - اس اشکال کی اصلی وجہ یہ بھی ہے - کہ روح کی ماہیت ہی معلوم نہیں اور اسکی بابت

قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ | میرے پروردگار کے حکم سے ہے -

کے سوا اور کچھ کہا ہی نہیں جا سکتا - لیکن تمام مذاہب کے مشترکہ عقائد اور

تو نافرمان اور فاسق ہیں۔

ناظرین کو یہ سنکر حیرت ہو جائے گی کہ مسیحیت کی اس روحانی تعلیم کا نتیجہ یہ تہا کہ روم کے ایک صومعے کا تالاب پوپ گریگوری کے حکم سے صاف کیا گیا تو اسمیں سے چھہ ہزار سے زیادہ نوزائیدہ بچوں کی کھوپریاں نکلیں۔ اور آسٹریا کی ایک خانقاہِ دوشیزگان کی بنیادوں نے بہی اپنی رہنے والیوں کی عصمت مابی کی ایسی ہی شہادت پیش کی[۱]۔ یہی سبب ہے کہ یہ ریاضتیں خواہ کتنی ہی مفید اور نتیجہ خیز کیوں نہ ثابت ہوئی ہوں - پہر بہی ان کے عامل رفتہ رفتہ اتنے کم ہو گئے - کہ اب ان کا وجود ہی موہوم ہو گیا - اور یوں ان کا جو کچہہ فائدہ تہا - وہ بہی نابود ہو گیا۔

ان مذہبوں میں ایک نقصان اور بہی تھا - اور وہ یہ کہ جہاں انہیں خواص کے لئے روحانی ترقی کے ایسے اعلیٰ درجے کی تعلیم رکہی گئی تھی - وہاں اس کے مقابلے میں عوام کو اس سے بالکل ہی محروم رکھا تھا اور ان کی روحانی بہبودی کے واسطے کسی طرح کے اعمال بہی نہیں سکھائے تھے - حالانکہ یہ بات اصول انصاف سے بالکل بعید تہی - چنانچہ ایک مصنف جسنے ہندوستان کے فلسفۂ قدیم کی نہایت غور سے تحقیق کی ہے - رقمطراز ہے کہ "مندروں میں جن کے خزانے لاکھوں کروروں آدمیوں کی عرقریزی سے مالامال تھے - پجاری بڑے تزک و احتشام سے شان و شوکت کا لباس پہنکر مجمع عوام میں آتے تھے - اور خود اپنے بنائے

[۱] ملاحظہ ہو میڈم بلیوٹسکی کی مشہور تصنیف "آئسس اَن وَیلڈ" حصہ دوم صفحہ ۵۸

وجود سے آیندہ نسلوں کا کوئی نفع ہوا - حالانکہ ہماری زندگی کا صحیح دستور العمل یہ مقولہ ہونا چاہیئے - کہ "اگر بر ہوا پری - مگسے ہستی - وگر بر آب روی خسے ہستی - کارے کن کہ کسے ہستی" اسی لئے قانون ابقائے بہترین نے ان کا نام ونشان تک مٹا دیا - اور اصول ارتقا کے مطابق ان کا مٹ جانا ہی ان کے لغو اور فضول ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے یہ بھی ظاہر ہے کہ ان ریاضتوں کی دشواری اور اصول فطرت سے مخالفت ہی ان کی عمومیت میں سب سے بڑی سد راہ تھی - کیونکہ ایک نہایت ہی محدود طبقے کے سوا عوام کسی طرح اس راستے میں قدم رکھ ہی نہیں سکتے تھے - اور اگر کبھی کسی وجہ سے ایسا ہوتا بھی تو نظام عالم درہم برہم ہو جاتا - لیکن قدرت کی زنجیریں ایسی کچے دھاگوں کی نہیں ہوتیں کہ انکو ہر کس و ناکس توڑ ڈالے - چنانچہ اب تک جہاں کہیں یورپ کا کوئی قدیم کنیسہ یا صومعہ کسی وجہ سے منہدم ہوتا ہے تو صدہا معصوم اور بیگناہ بچوں کی ہڈیاں زمین میں سے نکل نکل کر اپنے پاکباز اور عصمت شعار ماں باپ کے تقدس کا اعلان کر کے اس ارشاد پاک کی تصدیق کرتے ہیں -

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ ۵

اور ترک دنیا جو انہوں نے خود ایجاد کی تھی خدا کی خوشنودی کے لئے ہمنے اسی ابپر فرض نہیں کیا - پس وہ اسکو کافی طور پر نباہ نہ سکے پھر ان میں سے جو لوگ ایمان لائے - ہمنے ان کو ان کا صلہ دیا - مگر ان میں سے بہت سے

حسرت رہجائے۔ اور اس کا دل یہی کہے کہ ؎

شمع ساں باتو شبنم رفت و تمنا ماند است		ہمہ تن صرفِ نظر گشت و تماشا ماند است

اور دوسرے کو دو رکعت ادا کرنا ہی اتنا دوبھر ہو کہ وہ نمازِ قصر میں بھی اختصار کا خواستگار ہو۔ بہرحال یہ اپنی اپنی استعداد پر موقوف ہے ؎

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست		در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

اسی لئے اسلام نے اپنی تعلیم میں ایسی کوئی تفریق نہیں کی جس سے ایک طبقۂ خاص باقیوں سے الگ ہو گیا ہو۔ بلکہ فی الواقع ہماری تو سمجھ میں آتا ہی نہیں کہ کوئی عالمگیر مذہب اپنے مسائل کی تفسیر ایسے دو مختلف طریقوں میں کس طرح کر سکتا ہے کہ ان میں سے ایک تو عام اور ظاہر بیں لوگوں کے لئے ہو۔ اور دوسری ایک محدود اور مخصوص باطنی حلقے کے واسطے ظاہر ہے کہ اس کا منشا تمام نوعِ انسان کی اصلاح اور تہذیب تھا۔ پھر یہ انتخاب و اختصاص کیا؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ حصول اعزاز و امتیاز کے واسطے مقتدایانِ مذہب کا محض ایک خود ساختہ حیلہ تھا کہ انہوں نے مذہبی تعلیم کے دو ٹکڑے کر دئے۔ ایک ظاہری عوام کے لئے اور ایک باطنی۔ اپنے واسطے۔ اس اندرونی حلقہ میں وہ اپنے حسب منشا جسے چاہتے تھے۔ داخل کرتے تھے۔ چنانچہ برہمنوں میں اس درجے تک پہنچنے کے واسطے چالیس سال کی مسلسل ریاضت و اطاعت اور بے چون و چرا فرمانبرداری کی ضرورت تھی۔ اور اس کے بعد بھی ستر برس کے سن سے پہلے کوئی شخص حلقۂ خاص میں نہیں لیا جاتا تھا

ہوئے لکڑی پتھر اور پیتل کے بتوں کے سامنے سر جھکا کر لوگوں کو نہایت ہی بیہودہ اور مہمل وہم پرستی سکھاتے تھے۔ ان مذہبی رسوم کی بجا آوری سے ان کا اصل منشا یہ تھا کہ لوگوں پر ان کی حکومت قایم رہے۔ چنانچہ جب قربانی ہو چکتی تھی۔ تو ویش اور سودر اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتے تھے۔ راجہ اور امیر اپنے عیش و عشرت میں محو ہو جاتے تھے۔ اور برہمن اپنے مخفی معبدوں میں چلے جاتے تھے۔ جہاں وہ نہایت ہی اعلیٰ درجے کے مذہبی اور فلسفی مسائل کی تحقیق و تعلیم میں اپنا وقت صرف کرتے تھے"[۱۵]

اسلام نے اپنی تعلیم کو ان دونوں پہلوؤں سے بچایا۔ ایک طرف اس نے جو عبادتیں مقرر کیں۔ ان کو بلا استثنا اپنے تمام پیروؤں پر فرض کر دیا اور سب کو ان کے بجا لانے کا ارشاد فرمایا۔ تاکہ اپنے اپنے ظرف اور حوصلے کے مطابق ہر شخص ان سے مستفید ہو۔ کیونکہ گو اس میں تو شک نہیں کہ جیسے اور حیثیتوں سے سب آدمی یکساں نہیں ہیں اسی طرح روحانی ترقی کی قابلیتیں بھی متفاوت ہیں۔ لیکن انصاف کا یہ تقاضا ہے کہ ترقی اور ترمیم کے موقعے سب کے سامنے یکساں پیش کئے جائیں۔ تاکہ جو چاہے ان سے فائدہ اوٹھائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نماز اگرچہ ایک ہی ہے۔ مگر ممکن ہے کہ ایک شخص کو اس میں اتنا استغراق ہو کہ وہ ایک ہی سجدے میں شام سے صبح کر دے۔ اور پھر بھی اسے رات کے چھوٹے ہونے کی

۱۵ ملخوذ از "دی اوکلٹ سائنس ان انڈیا" مصنفہ جیکولیٹ۔

رشتہائے انسانیت سے بیگانہ ہوکر زندہ درگور ہو جاتا اور پھر اپنی اس ریاضت سے کسی کو کچھ فائدہ بھی نہ پہنچا سکتا۔ بیشک قربانی فائدوں سے خالی نہیں۔ لیکن چراغ کی طرح جلنا چاہیئے۔ پروانہ کی طرح جلنا بیکار ہے ؎

شمع بنکر بزم ہستی میں بسر کر زندگی	تاکہ تیرے سوز سے سارے جہاں میں نور ہو

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا میں رہ کر تعلقات دنیوی سے روگردانی کئے بغیر آدمی کسب فضائل و معالی کرے ؎

یاد از نگاہ گیر طریق سلوک را	در عین آشنائی مردم رسیدہ باش

ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ معقول تعلیم اور کیا ہو سکتی ہے۔ مگر اس قدر معقولیت کے باوجود بھی اگر غور کیا جائے۔ تو حقیقت میں غیر مذہبوں کی سخت سے سخت روحانی ریاضتیں بھی اتنی مشکل نہیں ہیں۔ جسقدر یہ با ہمہ و بے ہمہ ہونا دشوار ہے۔ کیونکہ ایک شخص تو ایسا ہے۔ جو کسی سے کچھہ تعلق ہی نہیں رکھتا۔ نہ اسکی بیوی ہے نہ بچے۔ نہ گھر ہے۔ نہ بار۔ اس نے ایک بار دل کڑا کر کے سب سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اور جوگ لے لیا۔ اب اسے کسی بات کا کچھہ فکر ہی نہیں رہا۔ اور وہ سارے جھگڑوں سے بے کھٹکے ہو گیا۔ ہر کہ ہیچ ندارد ہیچ غم ندارد۔ اس کے مقابلے میں ایک دوسرا شخص ہے۔ کہ اس کا گھر بار بھی ہے اہل و عیال بھی ہیں۔ وہ دنیا میں اپنا کاروبار بھی کرتا ہے۔ لوگوں سے لین دین بھی رکھتا ہے۔ مگر پھر بھی وہ ان سب کاموں کو نہایت ہی اعتدال اور میانہ روی سے انصاف اور ایمانداری کے ساتھ کرتا ہے۔ اور اس کا دل ان سب جھگڑوں سے بے لگاؤ رہتا ہے۔ وہ بظاہر مصیبتوں پر رنجیدہ بھی

اور برہمنوں کے سوا اور کسی ذات کے آدمی پر تو اس علم باطنی کا نام تک لینا حرام تھا - اور ان میں سے بڑے سے بڑے اور اچھے سے اچھے شخص کے لیے اس کا ایک حرف ہولے سے بھی سن لینا مستلزم موت تھا - یہی وجہ تھی کہ ان کے اسرار سے عام طور پر سب لوگ بالکل بے خبر رہتے تھے - اور ایسے ہی حیلوں سے اس مذہبی طبقے کا اقتدار اور اختیار ہر ایک ملک اور قوم میں اتنے عرصۂ دراز تک قایم رہا - یہاں تک کہ مصر قدیم سے لیکر یورپ کے قرون مظلمہ تک ان کا درجہ بادشاہوں سے بھی بڑھا رہا - مگر آفتاب عالمتاب اسلام کی زندگی بخش شعاعیں ہر کہ و مہ اور تمام خاص و عام پر برابر نور افشاں ہیں - اس نے اس قسم کی تفریق و تخصیص کا موقعہ ہی نہیں دیا - اور اپنے ہاں سرے سے اس طبقے کا وجود ہی نہیں ہونے دیا - جو خالق اور مخلوق میں واسطہ ہوتا - اور مذہب کے اسرار باطنی کا محرم اور محافظ بنکر ایسی حیلہ بازیوں سے اپنا اثر قایم رکھنا چاہتا - اور یوں دماغی اور اخلاقی ترقیوں کی طرح روحانی ترقی کا انحصار بھی صرف ذاتی سعی و کوشش پر رہگیا -

اس کے ساتھ ہی اسلامی عبادات نہ تو اتنی مشکل اور تکلیف دہ ہیں کہ وہ عام آدمیوں کی طاقت سے زیادہ ہوں - اور کسی کو ان کی بجا آوری میں دشواری کا عذر ہو - نہ وہ تعلقات زندگی میں مخل اور کاروبار دنیا میں حارج ہیں - کہ ان کا ہو کر آدمی اور کسی کام کا ہی نہ رہے - اور اس کا عدم وجود برابر ہو جائے - اسلام کی فطرت شناسی سے یہ بات بہت بعید تھی کہ وہ کسی مفید سے مفید اور عالی سے عالی منشا کے لئے بھی الیسا طرز عمل سکھاتا - جس سے انسان سارے

سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اس بارے میں ایک نامعلوم روحانی طاقت کا ارشاد یہ ہے کہ "جب تک سر ہے اور سر میں سودا۔ اور دل ہے۔ اور دل میں سویدا۔ یار کا بھید پانا او کھی گھاٹی اور کڑی منزل ہے۔ اس پہ بھی ہوس ہو تو دونو ہاتھ خالی کر کے رحمت کی طرف لپکے۔ دل کو پورا صاف کر کے محبت کی طرف بڑھے۔ تردامنیوں سے پاک ہو کر نیکی کا دامن پکڑے اور سلامتی کے سیدھے راستے سے ایک قدم ہی نہ چوکے آگے زبان لال ہے۔ اور ایک حرف کی بھی مجال نہیں"۔ اب دیکھیے کہ اسلامی عبادتوں میں ان میں سے کیا کیا باتیں شامل ہیں؟ طہارت لازمۂ عبادت ہے۔ عبادت فرض مذہب ہے۔ اور خشوع و خضوع کے لئے نماز سے بہتر کوئی عبادت ممکن نہیں چلہ کشی کے لئے صیامِ رمضان ہیں۔ اور عجز و نیاز اور تذلل و انکسار کے واسطے حج ہے اور نیکی اور نکوکاری سب کے ساتھ لازم ہے۔ قلبِ سلیم کے لئے یہی اعمال بہت ہیں۔ اور اگر یہ نہ ہو تو کوئی عبادت اور کوئی ریاضت بھی اس صدفِ مقصود کو نہیں کھول سکتی ہے

دل آگاہ مے باید دگر نہ	گدا ایک لحظہ بے نامِ خدا نیست

ہاں اگر کسی کو خدا اتنی توفیق دے کہ وہ ان سب کو کما حقہ بجا لانے کے بعد بھی اس درجے پر قانع نہ ہو تو وہ فرائض ہی میں جتنے چاہے نوافل بڑھا سکتا ہے۔

وَمِنَ الَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ	اور رات کو تو نماز تہجد ادا کر جو تیرے لئے نفل ہے۔ شاید اللہ تجھے کسی مقامِ محمود

ہوتا ہے۔ اور مسرتوں پر خوش ہی ہوتا ہے۔ لیکن اس کا دل اِن سب اثرات سے بیگانہ ہوتا ہے اور اسکی طبیعت میں اپنے خالق کے شکر اور تسلیم کے سوا اور کوئی خیال ہی نہیں آتا۔ حضرت رابعہ بصری کا قول ہے کہ "سچی بندگی یہ ہے کہ بندہ آقا کے دیکھنے میں اتنا محو و مستغرق ہو جائے۔ کہ اسے اپنے آقا کے عتاب یا انعام کا ہوش ہی نہ رہے۔ اور اس کی سزا و جزا کی خبر ہی نہو" اب آپ ہی انصاف کیجئے۔ اور بتایئے کہ دونوں میں کونسی حالت زیادہ مشکل ہے۔ ہماری رائے میں تو ان دونوں میں اتنا زمین آسمان کا فرق ہے۔ کہ ان کا باہم کچھہ مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ اس اعلیٰ درجے کی روحانی اور اخلاقی تعلیم کا بہترین اور کامل ترین نمونہ جناب پیغمبر اسلام علیہ التحیتہ والسلام کی پاک اور مقدس زندگی نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

مگر یہاں شائد کوئی یہ اعتراض کرے کہ "اسلام نے یہ سب کچھہ تو کیا اور مانا کہ بجا کیا۔ مگر روحانی ترقی کے لئے کیا کیا اور اس کا کون سا راستہ سکھایا؟" اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ اسلام نے جتنی عبادتیں فرض کی ہیں وہ سب روحانی ترقی ہی کے لئے سکھائی ہیں۔ اور غالبًا ان سے زیادہ سیدھا اور نزدیک کا راستہ اس منزل مقصود پر پہونچنے کا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا یہ تو ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ روحانی ترقی کا کوئی معیار قایم کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں ہے۔ مگر ہاں تمام مذاہب کے مشترکہ اعتقاد سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کے لئے پاکیزگی۔ پاک دلی اور راست روی کی

کا معیار اور ماحصل صرف اظہار خوارق عادت کو ٹھیراتے ہیں اور ہندو
یوگ کی خوبی کو جوگیوں اور فقیروں کی فوق الفطرت کرامتوں سے مستنبط
کرتے ہیں - وہ بھی اسی معیار کے مطابق اگر انصاف سے غور کریں تو کسی
پہلو سے صوفیائے کرام اسلام کی روحانی طاقتوں کا انکار نہ کر سکیں گے
حالانکہ اصولاً تصوف اسلام کا منشاء و مدعا عرفان آلہی ہے - شعبدہ بازی
نہیں ہے - اور بزرگان اسلام نے اظہار کرامت کی طاقت کو ہمیشہ
حصول مقصد میں حارج اور مخل خیال کیا ہے - اور اسی سبب سے اپنے
پیرودن کو تاکیداً اس سے روکا ہے - بہرحال اِن سب باتوں کے بعد
ہمارے نزدیک یہ کہنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا کہ اسلام نے روحانی
ترقی کا کافی لحاظ نہیں کیا - ہاں اگر کوئی صاحب اسلامی تصوف کو ہی
غیر اسلامی اثرات کا نتیجہ کہیں اور ارشادات نبوی کو ہی عیسائی راہبوں
کی تعلیم پر مترتب سمجھیں تو یہ بات ہی جدا ہے - اور اس کا جواب ان کی
خیرہ سری اور تنگ نظری پر ہنسنے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے -

روحانی طاقتوں کی بابت جو انقلاب عظیم اہل یورپ کے خیالات
میں واقع ہوا ہے وہ انسانی قیاسات و معلومات کی بے ثباتی و بے
اعتباری کا ایک قابل دید نمونہ ہے - یا تو چند صدی پہلے یہ حالت تھی کہ
ہر قسم کے بھوت پلید - اور جادو اور آسیب کا اعتقاد ان کے ہاں مذہبًا
اور قانونًا مسلّم تھا - یہاں تک کہ صدہا ناکردہ گناہ عورتیں ڈاکن اور چڑیل
سمجھ کر زندہ جلادی گئیں (چنانچہ صرف ایک صوبہ لورین میں ۱۵۸۰ء سے ۱۵۹۵ء

مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۔	تک پہنچا دے ۔

مگر اسلامی عبادات کی نوعیت میں فرق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اِن سے بہتر اور کوئی صورت ممکن ہی نہیں۔ ہاں ان کی مقداریں بیشی ممکن ہے اور یہ ایک حدِ معین کے بعد ہر شخص کی طاقت اور استطاعت پر موقوف ہے۔ اسلام میں بھی ایسے ایسے لوگ گزرے ہیں جنہوں نے سالہا سال تک زمین سے پہلو نہیں لگایا۔ برسوں تک شب بیداری کی اور ایسی کہ پلک سے پلک نہیں لگی۔ مدتوں تک صائم الدہر رہے اور ایسے کہ دنیا کی کسی نعمت سے لب آشنا نہیں ہوئے۔ مگر خوبی یہ تھی کہ اِن سب ریاضتوں کے باوجود بھی بالعموم اُنہوں نے دنیا ترک نہیں کی۔ اور قدرت نے جو فرائض بحیثیت انسان ان کے متعلق کئے تھے۔ ان کو پوری پوری احتیاط اور اعتدال سے پورا کرتے رہے اور اس کے ساتھ ہی ان کی روحانی طاقت بھی اتنی بڑھ گئی کہ ان کی ایک نگاہ آئینہ دل سے عمر بھر کی سیاہ کاریوں کا زنگ دور کر دیتی تھی۔ اور ان کے آستانۂ گدائی پر بڑے بڑے بادشاہانِ عالی وقار کے سرِ نیاز جھک جاتے تھے ؎

نازم بہ چشم خانہ کہ شاہانِ جہاں جو	ہم بر درآں خانہ گزارند حشم را

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ روحانیت کا کوئی درجہ ان بزرگوں کے زیر قدم آنے سے بچ گیا تھا۔ یا کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی خوبی ایسی تھی کہ جو ان میں علی وجہ کمال موجود نہ تھی۔ لیکن یہ جو کچھ تھا۔ وہی اسلام کی تعلیم اور اسلامی عبادتوں کی تعمیل کا نتیجہ تھا۔ جو لوگ تمام روحانی ریاضتوں اور جان کاہ ہول

یہاں ہم کو روحانیت جدید کے مسائل و اصول سے کچھ سروکار نہیں اس کا یہ ذکر بھی صرف اس غرض سے کیا گیا ہے۔ کہ ان انکشافات نے روحانی ترقی کے جو طریقے بتائے ہیں ان کا بھی سرسری طور پر اسلامی عبادات سے مقابلہ کر کے دیکھ لیں۔ اب سے پانچ ہزار برس پہلے سری کرشن جی مہاراج نے ارجن سے یہ کہا تھا کہ "بلا شبہ دل کو قبضے میں رکھنا نہایت مشکل ہے مگر پھر بھی دائمی کوشش اور زہد (ویراگ) سے ایسا ہونا ممکن ہے۔ جو شخص اپنے نفس پر قادر نہیں ہے وہ یوگ مشکل سے پا سکتا ہے لیکن ایک ضابطہ آدمی خاص خاص طریقوں سے اسے حاصل کر سکتا ہے"[۵۱] اسی تعلیم پر تمام ہندو یوگی فلسفے کا دارومدار ہے۔ اور اسمیں شک نہیں کہ جو کچھ کہا گیا ہے بالکل بجا اور درست کہا گیا ہے۔ مگر پھر بھی ان خاص خاص طریقوں کی کہیں تفصیل نہیں کی گئی۔ جو ہماری روحانی ترقی کے لئے استنے ضروری تھے۔ یہ ممکن ہے کہ مخفی طور پر خواص کو ان کی تعلیم دیگئی ہو۔ مگر کم سے کم بھاگوت گیتا میں ان کی تشریح نہیں ہے۔ اور ان کا مخفی اور مخصوص ہونا خود ہی اس

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۴۔ رہے گا۔ اور یہ چند نام تو صرف فضلائے انگلستان کے ہیں۔ ان کے علاوہ اس خیال کے فلسفے فرانس۔ جرمنی۔ اور خاص کر امریکہ میں نہایت کثرت سے ہیں۔ اور اب رفتہ رفتہ ان کی تصانیف و تجارب سے تمام یورپ اور امریکہ کے خیالات کا رنگ بدلتا جاتا ہے۔

۵۱ از بھاگوت گیتا۔ باب ششم اشلوک صفحہ ۳۶۲۵۔

تک پندرہ برس میں نو سو عورتیں جادوگری کے الزام پر زندہ جلا دی گئی تھیں) یا جب خیالات نے پلٹا کھایا تو ایک دم سے ان اوہام کے ساتھ روح اور خدا تک کے وجود سے انکار کر دیا گیا۔ اور اس کا اثر اتنا پھیلا کہ ہمارے بزرگ قوم اور مصلح ملت سر سید مرحوم کو ان خیالات کی تقلید میں شیطانوں اور جنوں اور فرشتوں کے وجود خارجی کی تردید میں طرح طرح کی تاویلیں پیش کرنی پڑیں۔ اب خیالات کی رو پھر بدلی اور مسمریزم اور ہپناٹزم کی تحقیق و تفتیش کرتے کرتے فلاسفۂ مغرب روحانیت جدیدہ تک جا پہنچے جس نے اب پھر ان کے سارے قیاسات کی ہیئت بدل دی۔ اور دنیائے سائنس و فلسفہ کے نہایت ہی سر برآوردہ اور مستند اوستاد صرف ہر قسم کی روحانی ترقی کے ہی قائل نہیں ہوئے۔ بلکہ انہوں نے یہ بھی تسلیم کر لیا کہ روحیں جسم ظاہری کے فنا ہو جانے کے بعد بھی مادی اشیاء پر مختلف قسم کا اثر ڈال کر اپنے وجود کا اظہار کر سکتی ہیں اور ہم کو اپنے حالات بعد الموت سے آگاہ کر سکتی ہیں۔ چنانچہ اس سے قبل آٹومیٹک رائٹنگ (از غیبی تحریر) کا ذکر کئی جگہ آ چکا ہے۔ جس کا ماخذ روحانی طاقت ہی کہا جاتا ہے۔

۵۷ مثلاً پروفیسر ویلیس جو ڈارون کے ساتھ اصول ارتقا کی تحقیق میں شریک مساوی تھا۔ سر ولیم کرکس جو ایک ہی وقت یعنی ۱۸۹۸ء میں برٹش ایسوسی ایشن اور سائی کیکل ریسرچ سوسائٹی دونوں کا پریزیڈنٹ تھا۔ پروفیسر سجوک سر آلیور لاج وغیرہم۔ یہ ایسے اصحاب ہیں جن کے نام پر سائنس اور فلسفے کو ہمیشہ ناز

اس کے مقابلے میں دیکھئے کہ اسلام نے دن میں ایک وقت نہیں بلکہ پانچ بار نہایت خلوص کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دیا ہے اور بڑے خضوع وخشوع سے دنیا سے زیادہ عقبیٰ اور جسمانی مفاد سے بڑھکر روحانی بہتری کے لئے دعا مانگنے کی تعلیم دی ہے۔ اس نے اطمینان قلبی حاصل کرنے کے لئے کوئی پوشیدہ ریاضتیں اور غیر معمولی ترکیبیں نہیں بتائیں بلکہ یہ اعلان عام کیا ہے کہ۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ	بیشک اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔

اور کیا کوئی شخص اس سے زیادہ عمدہ اور پسندیدہ طریقہ حصول اطمینان کا تجویز کرسکتا ہے۔ یہ وہی اطمینان قلبی ہے۔ جس کو ارجن نے ہوا کو تھامنے کے برابر دشوار کہا تھا۔ اور جس کے لئے یوگ اور ویراگ کی تلقین کی گئی ہے۔ مگر اسلام نے سکھایا کہ اپنے معبود کو یاد رکھنا۔ اس کی قدرتوں پر غور کرنا۔ اسکی نشانیوں کو دیکھنا اور اس کے مصنوعات سے اس کے کمال صناعی پر استدلال کرنا یہی اطمینان قلبی حاصل کرنے کی سب سے اچھی اور یقینی تدبیر ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ ہمت افزا اور دل خوش کن وعدہ صادقہ بھی فرمایا گیا کہ

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ۔	تم ہم کو یاد کرو ہم بھی تمکو یاد رکھیں گے اور ہمارا شکر کرتے رہو۔ اور ناشکری مت کرو۔

بات کی قطعی دلیل ہے کہ عام طور پر لوگ اس سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ اور وہ مذہب کی سہی عالمگیر اشاعت کے قابل نہیں ہیں۔ اس ارشاد کے پانچ ہزار برس بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان سے ہزاروں کوس دور کے ایک ملک میں جولیا کی روح اپنے پس ماندگان کی روحانی پستی اور کوتاہ بینی سے بیقرار ہو کر عالم برزخ سے یہ مشورہ دیتی ہے کہ ہم تم سے ناممکنات کی توقع نہیں رکھتے اگر کم سے کم اتنا تو ہو کہ ہر روز ۵ منٹ کے لئے افکار دنیا سے یکسو ہو کر امور عقبیٰ کا فکر کیا جائے۔ دن بھر اپنے کام کاج میں لگے رہو۔ لیکن کیا اپنے اور خدا کے تعلقات پر غور کرنے کے لئے ۵ منٹ بھی صرف کرنا تضیع اوقات ہے۔ سب سے مقدم ہم کو یہ کہنا ہے کہ تم کو خدا اور اوس کے آثار الطاف و عنایات پر غور کرنے کے لئے کچھ وقت نکالنا چاہیئے۔ ورنہ تمہاری دنیوی کاروبار کی بھرمار سے تمہاری زندگی میں خدا کے لئے کوئی جگہ باقی نہ رہے گی۔ تم امور عقبیٰ کے سمجھنے کی کیونکر توقع رکھ سکتے ہو۔ جبکہ تم ہر وقت دنیا کے جھمیلوں میں دیوانہ وار دوڑتے پھرتے ہو۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ تم ان جھمیلوں کو چھوڑ دو۔ لیکن کم سے کم ۲۴ گھنٹوں میں چند منٹ ایسے بھی ہونے چاہئیں کہ تم دائمی اور ابدی حقیقتوں کی طرف توجہ کرو"[۵۹] بلاشبہ جولیا کا یہ مشورہ نہایت عمدہ اور قابل عمل ہے۔ مگر یہ زیادہ تر انہی لوگوں کے لئے مفید ہے کہ جن کو ان کے مذہب نے آٹھویں دن گرجے میں جا کر پادری کا خطبہ سننے کے سوا اور کوئی طریقہ عبادت نہیں سکھایا۔ اسلامی عبادتوں کے مقابلے میں یہ سرسری اور عام ہدایت کچھ وقعت نہیں رکھتی

۵۹۔ آفٹر ڈیتھ صفحہ ۵۸، ۵۹۔

مسلمانوں کی موجودہ حالت

حقائق اسلام کی بابت ہمیں جو کچھ کہنا تھا۔ مجمل اور مختصر طور پر کہہ دیا گیا اگرچہ حقیقت میں ان حقیقتوں کا دریا میں سے قطرہ اور صحرا میں سے ذرہ برابر بیان بھی نہیں ہوا۔ اور ہمارا کیا مونہہ تھا کہ ہم کما حقہ ان کی تشریح و تصریح اور تفسیر و تفصیل کر سکتے۔

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ۔ (لقمان پ ٢١)

اور اگر زمین کے تمام درخت قلم بنجائیں اور ایک نہیں بلکہ ساتوں سمندروں کی سیاہی بنجائے تب بھی اللہ کی باتیں پوری نہ لکھی جاسکیں۔

مگر پھر بھی جتنا لکھا گیا ہماری بساط سے کہیں زیادہ ہے۔ اور غور کیا جائے تو چشم حقیقت بیں کے واسطے اتنا ہی بہت ہے۔ اسلام کی حقیقتیں ایسی نہیں ہیں کہ ان کو مجھ جیسے حقیقت ناشناس کے تعارف کی ضرورت ہو

حباب از بحر گوہر خیز نتواند نشاں دادن
سراغ عالم دل از من بیدل چہ می پرسی

صرف ذرا سے تفکر و تدبر کی ضرورت ہے کیونکہ ان پر فقط تغافل کا حجاب اور تساہل کا نقاب پڑ گیا ہے۔ اور کچھ نہیں۔

مگر یہاں ہم کو نہایت حسرت اور افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے

جس سے قطعی طور پر معلوم ہو گیا کہ ہماری تمام روحانی ترقی صرف یاد الٰہی اور ذکر زبانی پر موقوف ہے ٭

آنانکہ وصل یار ہمی آرزو کنند
باید کہ خویش را بگداز ند و او کنند

ایک چھوٹی سی مثال ہے کہ آج کل مدارس میں مذہبی تعلیم کی بڑے شدومد سے تاکید کیجاتی ہے - لیکن کیا ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کے معزز اصحاب نے کبھی خود اپنے آپ میں بھی اس کمی کو تسلیم کیا اور اس کی تلافی کے لئے کچھ سعی فرمائی - ہندوستان ایک وسیع ملک ہے اور ممکن ہے کہ خدا کے بعض بندے ایسے بھی ہوں - مگر بہر حال میں وہ النادر کالمعدوم کے حکم میں ہیں اگر ان کے والدین نے غلطی سے (کیونکہ اب مذہبی تعلیم کو نظر انداز کر دینا غلطی تسلیم کرلیا ہے) ان کو بچپن میں ایسی تعلیم نہیں دی تو کیا اب ان کو اس کی ضرورت ہی نہیں رہی - مانا کہ وہ معزز عہدوں پر سرفراز ہیں یا کسی شریف اور محترم پیشہ میں ممتاز ہیں - لیکن - کیا اس وجہ سے وہ مذہبی معلومات سے بھی بے نیاز ہو گئے - ہم کو تو اس کا جواب دینے کا کوئی حق نہیں ہے مگر ہر شخص خود اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھ سکتا ہے اور اس سوال کا جواب اپنے لیئے آپ دیسکتا ہے - اتنا ہم البتہ ضرور کہیں گے کہ نئی نسل میں مذہبی لاپروائی ایک زینہ اور ترقی کرگئی ہے - کاش کہ اسکی وجہ ان کے والدین کی مثال نہ ہو -

یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا - لیکن بہر حال یہ مسلم ہو چکا ہے کہ ہمارے لئے مذہبی تعلیم نہایت ہی ضروری ہے - اور جب تک اس کا خاطر خواہ انتظام نہ ہوگا تب تک ہماری اخلاقی حالت کی اصلاح اور قومی ترقی کا امکان محال ہے - لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ اسکی کیا صورت ہے؟ کیا دینیات کے چند ابتدائی رسالے پڑھا دینے سے ان اثرات کا تدارک ہو جائیگا

کہ ہمنے جوکچہہ اسلام کی بابت کہا ہے - وہ اپنے اسلام کی بابتہ نہیں کہا اور اسلام نے جو تعلیم دنیا کے سامنے پیش کی ہے - ہم خود اوس کا نمونہ نہیں ہیں - (اس ہم کی ضمیر جمع متکلم "میں" تو ضرور شامل ہوں ہی - اور ممکن ہے کہ خدانخواستہ آپ بہی ہوں) یہی وجہ ہے کہ اغیار نے ہماری حالت کو ہمارے مذہب کا معیار سمجہا - اور ہماری اخلاقی پستی نے اسلام کے پاک نام کو بدنام کیا - انا للہ وانا الیہ راجعون

وقتست کہ ہر بیکسی عشق بنالیم	کیں شعلہ رخسار و خس ما خاک نشیں شد

اسلام اب بہی وہی ہے جو جناب رسالتمآب کے سامنے تہا مگر مسلمان وہ مسلمان نہیں ہیں جو آپ سے تیرہ سو برس پیشتر تھے - ہماری آج کل کی حالت کا ہوبہو فوٹو یہ ایک فقرہ ہی کہ "مسلمانان در گور و مسلمانی در کتاب" ہم جو کچہہ کہتے ہیں وہ خالی کہنے ہی کے لئے ہوتا ہے - اور خیر اگر دوسرے خدا کے بندے اسپر کچہہ عمل کریں تو کریں - ورنہ خود ہمارے کرنے کا اس میں کچہہ نہیں ہوتا - یہی وجہ ہے کہ بیسیوں مذہبی انجمنوں کے پیہم ریزولیوشنوں اور سینکڑوں قومی لیڈروں کی دہواں دہار تقریروں کے باوجود بھی ہماری قومی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے - اور اس وقت اگر کوئی مذہب دنیا میں اپنی معتقدین کی اخلاقی پستی کی وجہ سے انگشت نما ہے تو وہ مذہب اسلام ہے ؎

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے	پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے
جس دین کے مدعو تھے کبہی قیصر و کسریٰ	خود آج وہ مہمان سرائے فقرا ہے

ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہے | تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

چونکہ ہم کو کامل یقین ہے کہ جو شخص متانت اور سنجیدگی سے اصول اسلام پر غور کرے گا - وہ ضرور اپنے دل میں ان کی معقولیت کا قائل ہو جائیگا اس لئے اب اگر وہ اس پر خلوص نیت سے عمل بھی کرنے لگے تو وہ یقیناً بعنایت ایزدی اسلام کا ایک قابل تقلید نمونہ ہو جائے - اب اس نمونے کو آپ اپنے بچوں کے سامنے پیش کیجئے - اس کا اثر ہزار کتابوں سے زیادہ ہو گا - مگر ہاں ایک بات اور ہے - ایسے ایک نمونہ سے زیادہ کام نہیں چلتا کیونکہ اس کے مقابلے میں اس کا اثر باطل کرنے کے لئے لامذہبی کے جو نمونے لاکھوں کروروں پھیلے ہوئے ہیں - انکا مجموعی اثر کیوں کر مٹے گا - ؟ یہ تو تب ہی ہو گا - جبکہ ہم میں سے ہر ایک اپنے آپ کو نمونہ بنانے کی کوشش کرے - تاکہ یوں عمدہ مثالیں برے نمونوں سے بڑھکر ان پر غالب آجائیں -

ممکن ہے کہ یہاں یہ کہا جائے کہ ایسے مذہبی اخلاق و آداب کے نمونے پیش کرنا علمائے ملت کا کام ہے - اور انہی کو یہ اہم فرض انجام دینا چاہیے بلا شبہ یہ صحیح ہے - اور ہم کو اس بات سے انکار نہیں کہ

اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ | علما پیغمبروں کے وارث اور جانشین ہیں

مگر انصاف کا خون نہ کیجئے - یہ تو بتائیے کہ اب علما کو مانتا کون ہے - اور ان کی کوئی سنتا کب ہے وہ دن گئے - جب مولوی قوم کے مقتدا اور پیشوا تھے - اب تو لیڈروں کا دور دورہ ہے - اور لوگ انہی کے نقش قدم پر چلنے کو مقصد حیات اور ذریعہ نجات سمجھے ہوئے ہیں - تو پھر یہ بھی انہی

جو مذہب کے برخلاف کام کر رہے ہیں اور چپکے ہی چپکے دلوں میں سے شعائر اللہ کی عظمت اور سنن نبوی کی وقعت کی بیخ کنی کر رہے ہیں۔ حاشا و کلا۔ آخر دیکھیے نا۔ مشن اسکولوں اور کالجوں میں درس انجیل لازمی ہے۔ مگر کیا اس سے غیر لڑکے عیسائی ہو جاتے ہیں؟ ہرگز نہیں یوں اور مختلف وجہوں سے کوئی عیسائی ہو جائے تو ہو جائے۔ مگر غالباً ان مدارس میں درس انجیل سے تو مسیحیت کی عملی اشاعت میں بہت کم مدد ملتی ہے۔ تو اگر اسی طرح اسلامی مدرسوں میں چند مذہبی رسالے شامل نصاب کر بھی دئے گئے تو ان سے کچھ نتیجہ نکلنا معلوم۔ اور نتیجے نکل بھی کیونکر سکتے ہیں زمانے میں لامذہبی کی جو عالمگیر وبا پھیل رہی ہے۔ اس کا علاج چند رسالوں سے کیا معنی ساری کتب شرعیہ کے کل نسخے چاٹ جانے سے بھی ہونا مشکل ہے۔ تو پھر آخر کیا کریں؟ ہمارے خیال میں اسکی صرف ایک تدبیر ہے۔ اور وہ ہے۔ "غور اور عمل" یعنی عقائد اسلام کی ہر ایک پہلو سے دل کھولکر چھان بین کیجئے۔ ان کو معیار عقل پر اچھی طرح پرکھیئے۔ جو بات خلوص دل سے غور کرنے کے بعد بھی معقول نہ معلوم ہو۔ اسے جانے دیجئے۔ (اگرچہ ہمارے نزدیک عقائد اسلام میں کسی ایسی بات کا ہونا بالکل خلاف قیاس ہے۔ مگر خیر) لیکن جس بات کو سمجھ لیجئے۔ اسپر پھر سچے دل سے کاربند بھی ہو جیئے اور اس کو کسی حالت میں خواہ مخواہ ترک بھی نہ کیجئے۔ اسلام کو تجسس اور تفتیش کا ڈر نہیں ہے۔ تغافل اور تساہل کا خوف ہے۔ کچھ نہیں تو بلا سے آپ اعتراض ہی کیجئے تاکہ یہ تو معلوم ہو کہ آپ کو اس سے کچھ مس تو ہے بقول غالب

کے لیڈروں پر مذہب اسلام کا نمونہ نہ ہونے کا اتہام کس بنا پر لگاتا ہوں ممکن ہے کہ وہ فرائض مذہب کو پوری پابندی سے بجا لاتے ہوں - اور عقائد اسلام کو سچے دل سے مانتے ہوں - بلا شبہ ممکن ہے - نہیں بلکہ قرین قیاس ہے کہ وہ ایسے ہی ہوں - اور ہماری دعا ہے کہ اگر خدانخواستہ وہ ایسے نہیں ہیں تو خدا ان کو توفیق دے کہ وہ ایسے ہی ہو جائیں لیکن پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ وہ اسلام کا سچا نمونہ نہیں ہیں - جس دلی یقین سے میں اس بات کو مانتا ہوں کہ مذہب کا تعلق بالکل دل کے ساتھ ہے - اس قطعی وثوق سے یہ بھی کہتا ہوں کہ دل کی حالت ہمیشہ ظاہری کیفیت سے متأثر اور خارجی اسباب کی متبع ہوتی ہے - اس کا ذکر میں ایک جگہ پہلے بھی کر چکا ہوں - اور اب یہاں اس کی تکرار بیکار ہے - مگر میرے خیال میں اس سے کسی کو انکار نہیں ہونا چاہیئے - پس جب میں ان کے ظاہر کو اسلامی شان سے معرا پاتا ہوں - تو باطن میں وہ لاکھ مسلمان ہوا کریں - میں کیونکر کہہ سکتا ہوں کہ وہ اسلام کا سچا نمونہ اور مسلمانوں کے لئے قابل تقلید مثال ہیں؟ دل کا دیکھنے والا اللہ ہے - مگر ہم تو ظاہر ہی کو دیکھ سکتے ہیں - اور اسی کے مطابق حکم لگا سکتے ہیں - سعدی علیہ الرحمہ فرما گئے ہیں ؎

ہر کرا جامہ پارسا بینی ورنہ دانی کہ در نہانش چیست	پارسا دان و مرد نیک انگار محتسب را درون خانہ چہ کار

اسلامی شان کا ہمارے پاس ایک ہی معیار ہے - اور وہ وہی ہے جو

لیڈروں کا فرض ہونا چاہیئے۔ کہ وہ لوگوں کے سامنے مذہب اسلام کا سچا اور مجسم نمونہ بنکر آئیں۔ تاکہ ان کے مقلد بھی انہی کی نقل کریں اور اسی راستے پر چلیں۔ کیوں کہ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ عوام میں اول تو سوچنے اور غور کرنے کا مادہ ہی کم ہوتا ہے اور جن کے دماغ اس قابل ہوتے بھی ہیں۔ ان کو افکار روزگار اتنی فرصت نہیں دیتے۔ اس لیئے عموماً وہ کسی کو اپنا رہنما مان لیتے ہیں اور پھر آنکھ بند کرکے اس کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ اس لیے لیڈر خود اپنے ہی اعمال کے جواب دہ نہیں ہوتے بلکہ ان کے مقتدیوں کے افعال کا بھی تھوڑا بہت مواخذہ انکی گردنوں پر ہوتا ہے۔ اس لیئے امر واقعی یہ ہے کہ جو لوگ اب مسلمانوں کے لیڈر کہلاتے ہیں وہ مذہب کا عملی نمونہ پیش کرنے کی تکلیف ان علما کو دینے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ جن کو وہ منصب سرکردگی سے معزول کر چکے ہین۔ اور جن کی مثالیں اب عوام کی نظروں میں قابل تقلید نہیں رہیں۔ بلکہ اگر وہ فی الواقع سچے دل سے مسلمانوں میں عقائد مذہبی کی پابندی اور اخلاقی پستی کی اصلاح چاہتے ہیں تو ان کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ خلوص قلب سے اسلام کا صحیح اور سچا نمونہ بننے کی کوشش کریں۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔	کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔ حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو کیا تم سمجھتے نہیں۔

یہاں ممکن ہے کہ کچھ غلط فہمی پیدا ہو اور مجھپر یہ اعتراض کیا جائے کہ میں اپنی قوم

میں چار ابرو کا صفایا ہو جائے گا۔ لیکن خیر سر دست ہمکو اس سے سروکار نہیں۔ ہم تو یہ پوچھتے ہیں کہ آخر اس انقلاب وضع کی وجہ کیا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ داڑھی کا مخالف سے مخالف شخص بھی یہ نہیں کہ سکتا کہ داڑھی رکھنے میں کوئی نقصان تھا جس کے سبب سے لوگوں نے اس کا منڈوانا اختیار کر لیا۔ اور اگر کوئی بفرض محال بالوں میں کنگھا کرنے اور تیل وغیرہ ڈالنے کی تکلیفوں کا عذر کرے بھی تو یہ عذر سر کے بالوں کی بابت بھی ہو سکتا ہے۔ وہ کیوں نہیں منڈوائے جاتے۔ اور اس سے بدرجہا زیادہ تکلیف تو ہر روز صبح اُٹھ کر سب سے پہلے داڑھی منڈوانے میں ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ توجیہ ہے ہی غلط نہ داڑھی رکھنے والے اس کے منڈوانے کی تکلیف کے ڈر سے داڑھی رکھتے تھے نہ اب داڑھی منڈوانے والے بالوں کی دیکھ بھال کی وقت کے خوف سے اسے منڈوانے لگے۔ بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ "فیشن بدل گیا ہے"۔ لیکن یہ تو ہمارے سوال کا کچھ جواب نہیں ہے کیونکہ ہم فیشن کے بدلنے ہی کی تو وجہ دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے یہ دیکھنا چاہیے کہ فیشن کہتے کس کو ہیں۔ فیشن حقیقت میں کسی ہر دلعزیز اور مقبول عام شخص کی وضع کا نام ہے جسکی عالمگیر عزت اور وقعت اس کی طرز خاص کو مقبول عام بنا دیتی ہے۔ اور جب تک اس شخص کی شہرت اور مقبولیت باقی رہتی ہے۔ تب تک وہ فیشن بھی قایم رہتا ہے۔ اسکے بعد جوں جوں امتداد زمانہ سے لوگ اسے بھولتے جاتے ہیں یا کوئی اور سر برآوردہ شخص لوگوں کے دلوں میں اسکی جگہہ لینا چاہتا ہے

ہم کو جناب رسالت مآب کے آداب و عادات نے بتایا ہے۔ ہمارے خیال
میں جس طرح قرآن مجید ہم کو اسلام کے احکام اور فرائض بتاتا ہے۔ اسی طرح
حالات نبوی سے ہم کو اسلام کا فیشن یا شعار معلوم ہوتا ہے۔ اور اسی بنا پر
ہم مانے لیتے ہیں کہ جس طرح فیشن کی خلاف ورزی کوئی قانونی جرم نہیں
ہے۔ اسی طرح اسلامی وضع کی مخالفت بھی کوئی مذہبی گناہ نہو۔ لیکن کم
سے کم اتنا تو ضرور ہے کہ آخر فیشن سے منحرف شخص اس طرز خاص کے لوگوں
میں ضرور انگشت نما ہوتا ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ شعار اسلامی کا تالاک
مسلمانوں میں کیوں نگاہ وقعت سے دیکھا جائے۔ جب تک کہ ہم یہ نہ
مان لیں۔ کہ درحقیقت قوم کی قوم اپنی طرز خاص سے بیزار اور کسی وضع نو کی
خواستگار ہوگئی ہے۔ مگر اس کے ضرور کچھہ نہ کچھہ اسباب ہونے چاہیں۔
آئیے دیکھیں کہ آج کل کے فیشن اور پرانے اسلامی شعار میں کیا فرق ہے
اور علی العموم طرز جدید کو وضع قدیم پر ترجیح دینے کی کیا وجہ ہے۔

طرز جدید اور وضع قدیم میں فرق تو زمین آسمان اور مشرق و مغرب کا
ہے۔ جو بات ایک میں معیوب ہے وہ ہی دوسرے میں مقبول ہے جو شئے
ایک کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ وہ ہی دوسرے کی نظروں میں مکروہ ہے۔
ایک چھوٹی سی مثال داڑھی کی لیجئے۔ ایک زمانہ تھا کہ داڑھی منڈوا دینے
سے بڑھکر کوئی ذلیل کن سزا نہ تھی۔ اب اگرچہ ابھی تک داڑھی رکھنا قانونی
جرم نہیں ہے۔ مگر فیشن کے خلاف تو ضرور ہے۔ اور اب تو داڑھی کے ساتھ
موچھیں بھی رخصت ہوتی جاتی ہیں۔ اور اگر یہ ہی صورت ہے تو چند دن

سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی اتنی عزت اور محبت باقی نہیں رہی ہے کہ ان کی ہر ایک بات ہمارے دل کو محبوب ہو۔ اور ان کی ہر ایک ادا پر ہم جان سے قربان ہوں۔ مجھے مسلمانوں سے یہ امید ہے کہ کم سے کم ابھی تک انشاء اللہ وہ اپنے اوپر یہ الزام گوارا نہ کریں گے۔ کیونکہ اگر خدانخواستہ حالت اس درجہ کو پہنچ چکی ہے کہ اس الزام سے بھی ان کی رگِ حمیت میں تحریک نہیں ہوتی۔ تو سمجھ لینا چاہیئے کہ قومی نبض بند ہوگئی ہے۔ اور مذہب کی جان نکل چکی ہے۔ مگر انشاء اللہ ایسا نہیں ہے مسلمانوں نے تبدیل فیشن کی اصلیت پر کبھی اس پہلو سے غور نہیں کیا۔ اس لئے وہ ایک حد تک معذور ہیں۔ مگر میں پھر کہونگا کہ اسکی اصلی وجہ یہی ہے خواہ اسکی کچھہ ہی تاویل کیوں نہ کیجائے اور اسے کتنے ہی پردوں میں کیوں نہ چھپایا جائے۔ کلیہ قاعدہ ہے کہ محبوب کی ہر ایک چیز مقبول اور مرغوب اور دوست کی ہر ایک بات دلکش اور دلربا معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ محبت کیش دل کو ان میں اسی کی جھلک نظر آتی ہے۔ جسے وہ چاہتا ہے۔ سعدی علیہ الرحمہ نے اس مضمون کو کس خوبصورتی سے سمجھایا ہے ؎

گِل خوشبوئے در حمام روزے ۔۔۔ رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری ۔۔۔ کہ از بوئے دلآویز تو مستم
بگفتا من گلِ ناچیز بودم ۔۔۔ ولیکن مدتے با گل نشستم
جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد ۔۔۔ وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

اسی رفتار سے اسکی وضع بھی چھوٹتی جاتی ہے - اور نیا فیشن مروج ہوتا جاتا ہے
ابھی کل کی بات ہے کہ عموماً نوجوان تعلیم یافتہ اور خاصکر فوجی طبقے کے
اصحاب میں قیصر کی سی چڑھی ہوئی موچھیں رکھنے کا بہت رواج تھا -
مگر جب سے لڑائی شروع ہوئی - یہ فیشن بھی بدلنے لگا - اسی طرح
نپولین نے کسی عذر سے داڑھی کے ساتھ مونچھوں کو بھی صاف کر دیا تو
لوگ بکثرت اسی کی تقلید کرنے لگے - مجھے یقین ہے کہ فیشن کی اصلیت
اور اسکے انقلاب کی کیفیت میں کسی کو میری اس رائے سے اختلاف
نہ ہوگا - تو پھر اب اس اصول کو پیش نظر رکھکر دیکھیے کہ ہمارا آج کل اپنی قدیم
اسلامی وضع کو چھوڑ کر یورپ کی طرز جدید اختیار کرنا کیا معنی رکھتا ہے - ہم
یہ نہیں کہتے کہ داڑھی کا تعلق نفس اسلام سے ہے - ہم اس پر بھی زور نہیں
دیتے - کہ آپ

قُصُّوا الشَّوَارِبَ وَاَعْفُوا اللُّحٰی | موچھیں کترواؤ اور داڑھیاں بڑھاؤ -

کے ارشاد نبوی کو حکم مذہبی ہی سمجھیں - یہی سہی کہ وہ اس زمانہ کی وضع تھی
اس لئے آنجناب نے ایسا فرمادیا - بالکل درست - مگر کم سے کم اس سے
یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ اب ہمنے اپنا فیشن تبدیل کر دیا ہے - یعنی اپنی اسلامی
وضع کو چھوڑ دیا ہے - لیکن کیوں ؟ - اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے
کہ ہمنے اپنے نصب العین کو بدل دیا ہے - ہمارے نزدیک وہ وضع
اب متروک اور معیوب ہوگئی ہے - ہماری نظروں میں اس طرز کے
لوگ قابل تقلید نہیں رہے - اور ہمارے دلوں میں ہمارے پیغمبر حضور

لباس میں اگرچہ عہد نبوی کی سی سادگی اور بے تکلفی تو نہیں رہی تھی تاہم اس میں ایک خاص قومی شان ضرور تھی۔ اور کم سے کم وہ مذہبی احکام کی بجاآوری میں کبھی حارج اور مخل نہیں ہوتا تھا۔ اس کے برخلاف ہماری آج کل کی تعلیم یافتہ جماعت کا مقبول عام لباس جو بلا کم وکاست بجنسہ انگریزی لباس کی نقل ہے۔ ان سب خصوصیتوں سے محروم ہے۔ نہ تو وہ ہماری حالت کے مناسب ہے۔ کیونکہ وہ ایک ایسے ملک کا اور ایسے لوگوں کا لباس ہے جہاں کی آب وہوا ہمارے ملک کی آب وہوا سے بالکل مخالف ہے اور جن کی طرز بود وباش ہم سے بالکل مختلف ہے۔ نہ اس میں ہماری کوئی قومی خصوصیت قائم رہتی ہے۔ کیونکہ وہ فی الواقع ہماری حکمراں قوم کا لباس ہے۔ اور ہم اسے اختیار کرکے اپنی قومیت کو محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ اور نہ اپنی کثرتِ تعداد کے زور سے اسے اپنا قومی لباس بنا سکتے ہیں کیونکہ سیاسی غلبہ کثرت اعداد پر ہمیشہ غالب آجاتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ترکی ٹوپی جو ابھی چند دن پہلے بالخصوص ایک قومی نشانی کی حیثیت سے رائج ہوئی تھی اب آہستہ آہستہ انگریزی ٹوپی سے بدلتی جاتی ہے اور یوں ہماری سیاہ روئی کے سوا ہم میں اور اہل یورپ میں کچھ فرق نہیں رہتا۔ یہی نہیں اس لباس میں ایک نقصان اور بھی ہے یہ لباس ہماری طہارت اور عبادت میں بھی حارج ہے۔ جو لوگ پانی سے استنجا کرتے ہیں ان سے پوچھئے کہ پتلون پہنے ہوئے پیشاب کرنا کیسا مشکل کام ہے اور کھڑے کھڑے پیشاب کرنے میں کپڑوں پر چھینٹے پڑنے کا کتنا احتمال ہوتا ہے جو صاحب کالر اور کفوں کی عمدگی کے

اس لئے اسلام کے سچے شیدائی وہی ہیں جو احکام مذہبی کی پابندی اور فرائض دینی کی بجا آوری کے ساتھ ان چھوٹی چھوٹی سی جزئیات میں بھی سنت نبوی کی تقلید کرتے ہیں۔ کیونکہ جناب رسالت مآب کی محبت اسی کی مقتضی ہے۔

اسی طرح لباس کو لیجیے۔ اخلاقی حیثیت سے تو یہ قول نہایت ہی بجا اور صحیح ہے کہ ؎

دلق بہ چہ کار آید و تسبیح و مرقع	خود را ز عملہائے نکوہیدہ بری دار
حاجت بہ کلاہ برکی داشتنت نیست	درویش صفت باش و کلاہ تتری دار

اور اس میں ذرا بھی کلام نہیں ہو سکتا کہ اسلام نے من حیث المذہب لباس وغیرہ سے بالکل بحث نہیں کی اور صرف دل پر تمام اعمال کا دارومدار رکھا ہے اس لئے ہم کو اختیار ہے کہ جو چاہیں پہنیں اور جس طرح چاہیں رہیں۔ مگر تمدنی حیثیت سے اس امر کی ضرورت ہے کہ ہمارا لباس ایسا ہونا چاہیے جو ہماری حالت کے مناسب ہو۔ اور جس سے ہماری قومیت کے زائل ہو جانے کا احتمال نہ ہو۔

عرب سے نکل کر مسلمانوں کے لباس نے مختلف حصہ ہائے عالم میں وقتاً فوقتاً مختلف رنگ بدلے اور متعدد طرزیں اختیار کیں۔ مگر چونکہ اکثر اس کے مخترع وہ لوگ تھے جنہوں نے عربیت کی آغوش میں پرورش پائی تھی اور جن کو غرور حکومت اور ناز سلطنت نے غیر اقوام کی طرز پوشش و رہائش کی تقلید سے بے نیاز کر رکھا تھا۔ اس لئے ان کے

ریاکاری کے اتہام کے ڈر سے ادا نہیں کیجاتی - ورنہ مذہبی طبیعت کے آدمی بہی خلاف وضع ہونے کے سبب سے ارکان مذہب کی بجاآوری میں تامل کرتے ہیں - لسان العصر اکبر نے خوب کہا ہے ؎

ہم نے اکبر سے کہا آئیے حجرہ میں مرے | اس چٹائی پہ نمازیں پڑہیں سب دستور
چہوڑیے آپ یہ ہنگامۂ تعلیم جدید | کاٹ ہی دیگا کسی طرح خدائے غفور
بولا جہنجلا کے کہ ہے سہل جہنم مجھ پر | اس کی نسبت کہ ہوں کالج میں بڑا احمق مشہور

اس تقریر سے میرا یہ مطلب نہیں کہ ہمارے ہاں پہر ردا اور تہبند کا رواج دیا جائے - اسلئے نہیں کہ وہ وضع ادنیٰ درجے کی ہے - حاشا - اس لحاظ سے تو میں جناب رسالت مآب کے ملبوس خاص کی وضع کو بنظر استخفاف واستہزا دیکھنے والے مسلمان پر کفر کا حکم لگا دونگا - بلکہ اس وجہ سے کہ میرے خیال میں فی زماننا ہم میں کوئی شخص اتنا ظرف عالی نہیں رکھتا کہ اسلام کے تمام محاسن باطنی حاصل کرکے تشبہ نبوی میں ان حدود کے درجے تک پہنچے اور اس میں خودپسندی اور نخوت کے مہلک اور بربادکن مرض پیدا نہ ہوجائیں - لیکن اگر یہ نہو تو کم سے کم اتنا تو ہو کہ ہمارا لباس ہم کو غیروں کا غلام نہ بنادے اور ہمارے ارکان مذہبی کے بجالانے میں مخل اور مانع نہ ہو - کیسی عجیب بات ہے کہ وہ ٹائی جو جارج چہارم نے

؎ مشہور ہے کہ جارج چہارم بادشاہ انگلستان کے گلے میں ایک دفعہ ایک پہوڑا ہوگیا اس نے اس کے چہپانے کی یہ تدبیر کی کہ ایک خوبصورت سے کپڑے کی پٹی اسپر لپیٹ لی اسکی دیکہا دیکہی سب درباریوں اور پہر اور لوگوں نے بہی اس کا استعمال شروع

دلدادہ ہیں وہ اگر نماز پڑھتے بھی ہوں گے تو وہی بتا سکتے ہیں کہ نماز کے کے وقت ٹائی اور کالر کو اتارنا اور کفوں کو چڑھا کر وضو کرنا کیسا سخت کام ہے۔ اور ان کے کتنے وقت کی نمازیں محض اس کی وقت اور کف اور کالر کے بگڑ جانے کے اندیشے سے قضا ہو گئی ہیں۔ اور انگریزی ٹوپی پہنکر تو سجدہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے۔ جن لوگوں کے دلوں میں احکام اسلام کی کچھ بھی عظمت ہے اور جو اصحاب وضو نماز کی فرضیت کے منکر نہیں ہیں ان کے نزدیک تو ان میں سے کوئی ایک بات بھی کسی ظاہر مقید سے مفید اور عمدہ سے عمدہ لباس کو ناجائز قرار دینے کیلئے کافی ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزی لباس میں تو اتنی قباحتوں کے مقابلے میں کوئی فائدہ بھی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اس سے خاطر خواہ طور پر ستر عورت بھی نہیں ہوتا۔ اسکی ترویج کے محرک سر سید مرحوم تھے اور بلاشبہ انہوں نے اسے اس خیال سے پسند کیا تھا کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں جو اجنبیت اور منافرت تھی وہ کم ہو جائے۔ مگر سوچا تھا کیا اور ہو گیا۔ انگریزوں نے تو اسے اپنے قومی لباس کی تذلیل و توہین سمجھا اور مسلمانوں نے اپنی قومیت اور مذہب کو اسپر قربان کر دیا ؏

پیر و مرشد نے کیا تو میں بچپن پیدا	وہ یہ سمجھے تھے کہ ہو جائیگا جوبن پیدا
وہ تو پیدا نہ ہوا ہاتھ سے لڑکوں کے مگر	ہو چلے دین کی دیوار میں روزن پیدا

اسی تبدیلی فیشن کا اثر بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ جس طرح پہلے نماز بعض وقت ریاکاری سے ادا کیجاتی تھی ویسے ہی اب بسا اوقات

جن کی اسلام نے ایسی عمدہ اور بے مثال تعلیم دی ہے - اور جن کے
چھوڑ بیٹھنے سے ہم اس قعر ضلالت اور چاہ ذلت میں آ پڑے ہیں - یہ
اصول کبھی ہی غلط نہیں ہو سکتا کہ

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ -	بیشک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا - جب تک کہ وہ ان باتوں کو نہ بدلیں جو ان کے دلوں میں ہیں -

پس جب تک ہم اسلام کے اصلی احکام کی تعمیل نہ کریں گے - تب تک
ان اوضاع ظاہری میں سنت نبوی کی تقلید ہمارے لئے فضول اور
بیکار ہی نہیں بلکہ گستاخی اور گناہ ہے کیونکہ ایسی ظاہری وضع بنا کر ہم گویا
اپنی طرف وہ صفات باطنی منسوب کرتے ہیں جو ہم میں موجود نہیں ہیں - اور
یوں ہم لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں - کتنی پاکیزہ رباعی ہے

شیخے بہ زن فاحشہ گفتا مستی؟	از خیر گسستی و بہ شر پیوستی
زن گفت چنانکہ می نمائیم ہستم	تو نیز چنانکہ می نمائی ہستی؟

یہی نہیں - جب ہم داڑھی بڑھا کر اور جبہ و عمامہ پہنکر کوئی ناشائستہ حرکت کرتے
ہیں تو ہم صرف اپنے آپ ہی کو رسوا نہیں کرتے بلکہ اس وضع کو ذلیل
کرکے ان بزرگوں پر بھی دھبہ لگاتے ہیں - جن کے نام سے وہ وضع موسوم
اور ممتاز ہے اور میرے خیال میں یہ ایک ایسا گناہ ہے جو اس حرکت

بقیہ حاشیہ صفحہ ٣٦٤ - کے فقیرانہ زندگی بسر کرنے والے طالب علم
ڈالے رہا کرتے تھے -

اپنے گلے میں پھوڑے کے چھپانے کے لئے باندھنی شروع کی تھی - آج ہمارا طوق گلوبن رہی ہے - اور وہ جھولی[۵] جو یونانی فقیر ڈالے پھرتے تھے اب ہمارا بہترین سرمایۂ فخر و ناز ہوگئی ہے لیکن وہ لباس جسے ہم اپنا قومی لباس کہہ سکیں اب اس قابل ہی نہیں سمجھا گیا کہ ہم اسے پہنکر کسی اپنے قومی جلسے میں تو آئیں - حالانکہ ظاہر ہے کہ لباس خود کوئی ایسی چیز نہیں ہے - جو ذلیل ہوسکے - اسکی عزت یا ذلت اس کے پہننے والوں کی عزت یا ذلت پر موقوف ہے - چونکہ ہم میں خود کوئی خوبی نہیں رہی - اسلئے ہمنے اپنے لباس کو بھی اپنی اور دنیا کی نظروں میں حقیر کردیا - اور اب بجائے اس کے کہ ہم کوئی ذاتی ہنر اور کمال پیدا کرکے اپنے لباس کو پر موقر بنائیں - ہم یہ چاہتے ہیں کہ اورونکا لباس مستعار ہماری ناقابلیت اور بے ہنری کی پردہ پوشی کرے اور اپنے وقعت سے ہمکو بھی عزت بخشدے لیکن یہ ذرا مشکل ہے ؎

سفلہ از قرب بزرگاں نکند کسب شرف	رشتہ پر قیمت از آمیزش گوہر نشود

اس میں ذرا بھی شک نہیں ہوسکتا کہ ہماری وضع خاص اسی وقت دنیا میں مقبول اور ممتاز ہوسکتی ہے جبکہ ہم میں تمام اندرونی خوبیاں پیدا ہوجائیں

بقیہ حاشیہ صفحہ ٣٦٣ - کردیا یہاں تک کہ نکٹائی اب انگریزی لباس کا ایک لازمی جزو ہے -

۵ - کہا جاتا ہے کہ آج کل بی اے اور ایم اے کی ڈگریوں کے امتیازی لباس گون کے اوپر جو ایک جھولی سی ہوتی ہے جسے ہڈ کہتے ہیں اور جو ہر ایک درجے کے لئے خاص رنگ کی ہوتی ہے حقیقت میں اس گدایانہ جھولی کی یادگار ہے - جو قدیم یونان

شرف حاصل ہے۔ اگر ہم سچے دل سے آنجناب سے ارادت اور عقیدت رکھتے ہیں۔ تو ہمارا فرض ہے کہ ہم آپ کی وضع ظاہری کے اختیار کرنے سے پہلے ان محاسن باطنی کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصب رسالت پر سرفراز اور خیر البشر اور خاتم النبیین کے القاب سے ممتاز فرمایا۔ ظاہر ہے کہ آپکی ریش مبارک کی تراش یا پیراہن مقدس کی کاٹ میں کوئی خاص خوبی نہ ہوگی۔ جو خواہ مخواہ واجب التقلید ہو بلکہ اصل میں آپ کی وہ نیکیاں قابل عمل ہیں جنہوں نے آپ کو جوانی ہی میں مبعوث ہونے سے برسوں پہلے مخالفوں تک سے امین کا معزز لقب دلوا دیا تھا۔ اور بعثت کے بعد آپ میں زہد و ریاضت۔ تقویٰ و عبادت۔ جود و سخاوت صبر و استقامت۔ حلم و شجاعت۔ رحم و عدالت۔ غرض ہر طرح کی خلاقی اور روحانی خوبیاں کامل سے کامل تر ہو گئیں۔ اور اسلام کا حکم جناب رسالت مآب کا ارشاد اور آپ سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم انہی کے نقش قدم پر چلکر دفع رذائل اور کسب فضائل میں کوشش کریں یہ تو نہ کرنا اور خالی ظاہری وضع قطع میں آپ کی نقل کرنا اتباع سنت کے دعوے اور اسلام کی شان سے بہت بعید ہے ٥

تکیہ بر جائے بزرگان نتواں زد بہ گزاف	مگر اسباب بزرگی ہمہ آمادہ کنی

سوء اتفاق یہ کہ تزکیۂ باطن جس قدر مشکل اور وقت طلب ہے ظاہری وضع داری اسی قدر آسان اور سہل الحصول ہے۔ اسی طرح یہ کہ دنیوی فائدے جتنے ہیں سارے نمائش اور ریاکاری ہی میں ہیں۔ تصفیۂ نفس میں کچھ

کی ناشائستگی سے بدرجہا زیادہ ہے اور جسکی تلافی نہایت مشکل ہے۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ آدمی جتنا چاہے سیاہ کاریوں میں مبتلا رہے۔ لیکن بزرگوں کی وضع کو اپنی بداعمالیوں کی آڑ بنا کر "بدنام کنندۂ نکونامے چند" کا مصداق نہ بنے۔ فی الواقع ہماری تعلیم یافتہ جماعت میں طرز قدیم کے متروک ہو جانیکی وجہ تبدیل فیشن کے علاوہ ایک حد تک یہ بھی ہے کہ اس روش کے آدمیوں نے اپنی نازیبا حرکتوں سے اپنی وضع کو بھی انگشت نما بنا دیا ہے۔

حقیقت میں اس سے بڑھکر کوئی غلطی نہیں ہے۔ کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ ظاہری اسلامی وضع کسی طرح سے بھی صفائی باطن اور تزکیۂ نفس کی قایم مقام ہو سکتی ہے۔ ایسا سمجھنا سراسر اسلامی تعلیم کے خلاف ہی نہیں بلکہ اسکی بیخ کنی کی سب سے بڑی تدبیر ہے۔ اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ہمارے پاک مذہب کو جس قدر نقصان ان ظاہر پرست دشمنان دوست نما کے منافقانہ طرز عمل سے پہنچا ہے۔ اتنا کسی سخت سے سخت مخالف کی حرف گیریوں اور بڑے سے بڑے معترض کی نکتہ چینیوں سے بھی نہیں پہنچا۔ ایسے ہی لوگوں کے بابت کہا گیا ہے کہ ؎

گر مسلمانی ہمینست کہ واعظ دارد	وائی گر در پس امروز بود فردائے

مختصر یہ کہ اتباع سنت کے یہ معنی ہی نہیں ہیں کہ ہم فقط ظاہری وضع و صورت میں تو جناب رسالت مآب کی پیروی کریں۔ اور ان اخلاق کریمانہ اور صفات حسنہ کی طرف کچھ بھی توجہ نہ کریں جو اس ذات والا صفات میں بدرجۂ کمال جمع تھیں بلکہ جنکو اسی ذات سراپا برکات سے منسوب ہونے کا

جس کا وہ شایاں نہیں ہے اور اسی وجہ سے اسلام کے اصلی فرائض کی اہمیت کا بہت کچھ حصہ اس نے ابتک غصب کر رکھا ہے۔

غرض اب اسے ہماری شومیِ قسمت کہئے یا شامتِ اعمال سمجھئے۔ مگر حالت یہ ہے کہ ایک طرف تو ہمارے علما اور ائمہ دین ظاہری طرز و وضع کے اتنے پابند اور الفاظ قانون کے ایسے نقاد بنے ہوئے ہیں کہ انہوں نے باطنی صفائی اور پاکیزگی کی اہمیت کو بالکل چھوڑ دیا ہے۔ اور اصول اسلام کو قطعاً نظرانداز کر رکھا ہے۔ اور دوسری طرف ہمارے قومی لیڈر اور ملکی رہبر یوروپین فیشن کے ایسے گرویدہ اور مغربی تہذیب کے اتنے دلدادہ ہو رہے ہیں کہ ان کو اسپر مذہب کے سارے اصول و فروع قربان کر دینے میں بھی تامل نہیں ہے۔ انہوں نے اسکی جگہہ قومیت کا نام سیکھا ہے مگر تعجب ہے کہ وہ قوم کیسی ہوگی جس میں مذہب کی شیرازہ بندی نہ ہوگی بہرحال حال یہ ہے کہ ؎

اے صبا مایۂ سودا نہ تو داری و نہ من	بوئے آں زلف چلیپا نہ تو داری و نہ من

اور یہی وجہ ہے ہماری پستی اور پریشاں حالی کی۔ قومی ترقی اسوقت تک ممکن ہی نہیں جب تک کہ یہ دونوں فریق افراط و تفریط کو چھوڑ کر جادۂ اعتدال پر نہ آجائیں۔ اور اسلام کے صراط المستقیم پر نہ چلنے لگیں۔ ابھی تو ہماری حالت ایک پرکاہ کی سی ہے۔ جسے مخالف ہواؤں کے جھونکے چاروں طرف لئے پھرتے ہوں ؎

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک تیزرو کے ساتھ	پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

یہی نہیں اور غضب پر غضب یہ ہوا کہ چونکہ مذہب اسلام نے ہم کو اخلاق باطن کے ساتھ قانون ظاہری کی بھی تعلیم دی تھی اور ہم شروع ہی سے اکثر جگہہ برسر حکومت رہے اس لئے ہمارے قاضیوں اور مفتیوں نے از روے قانون افعال ظاہر کے مطابق شریعت ہونے پر اتنا زور دیا کہ لوگ مذہب کی اصلی تعلیم یعنی دل کی پاکیزگی کو بھول گئے اور یوں طبیعتوں میں ظاہر پرستی اور ریا کاری بہت زیادہ دخیل ہوگئی اور ہم پر بالعموم یہ قول صادق آنے لگا کہ

آراستہ ظاہریم و باطن نہ چناں	افسوس چنانکہ می نمائیم نہ ایم

تصوف نے ریا کے ان اسباب کا بہت کچھہ مقابلہ کیا اور ظاہر و باطن کے یکساں ہونے پر بہت زور دیا اور شعرا کے زبانی تازیانوں نے بھی اس منافقت کی خوب خبر لی - چنانچہ فارسی کی اخلاقی اور صوفیانہ شاعری میں شراب اور اس کے مرادف الفاظ مجازاً اس طاقت کے لئے استعمال کئے گئے ہیں جو دلوں سے اس نمود و نمائش کی خواہش کو نکال کر ظاہر و باطن کو ایک کردے - اسی بنا پر یہ غالب نے کہا ہے

سجادہ رہن مے نہ پذیرفت میفروش	کیں رانسب بہ خرقۂ سالوس میر

یہ سب کچھہ ہوا - مگر پھر بھی تزکیۂ نفس ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے - اور اگرچہ اسلام کی تو ساری عبادتیں ایسی ہی ہیں اور اسی کے لئے لازم کی گئی ہیں کہ دل کا زنگ دور کرنے کے واسطے ان سے بہتر کوئی مصقل ممکن نہیں ہے - پھر بھی عوام میں ظاہری وضع و لباس کو وہ وقعت حاصل رہی

رسالت کی بھی ہدایت کردے - تاکہ وہ سب ہر قسم کی نمود و نمائش کی آمیزش و آلائش سے پاک ہوکر دلی خلوص اور سچی نیک نیتی سے قوم کی وہ خدمات انجام دے سکیں - جن کے لائق اللہ تعالےٰ نے ان کو بنایا ہے - اور یوں ہم سب اپنے طرز عمل سے ان بدنما دھبیوں کو اسلام کے پاک نام پر سے مٹا سکیں - جو ہماری تنگ خیالیوں اور بداعمالیوں نے اس پر لگا دئے ہیں -

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ

اور ہماری آخری بات یہ ہے کہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۙ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۙ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ؏	تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو سب جہانوں کا پالنے والا ہے - اور بڑا مہربان اور بخشنے والا ہے - اور قیامت کے دن کا مالک ہے - اے اللہ ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں - توہمکو سیدھے راستے کی ہدایت کر ان لوگوں کے راستہ کی جنپر تو نے انعام کیا ہے - ان لوگوں کے راستے کی نہیں - جو تیرے معتوب اور گمراہ ہیں -
رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۪ وَاغْفِرْ لَنَا ۪ وَارْحَمْنَا ۪ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ	اے ہمارے پروردگار تو ہمیں مواخذہ مت کر اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کریں - اے پروردگار ہم پر ایسا بار مت ڈال جیسا کہ ہمسے پہلوں پر پڑا تھا -

ریاکاری اور منافقت کا عیب کم وبیش تمام سرآوردگان قوم کا مظہر امتیاز بنا ہوا ہے۔ اور اسی سبب سے ان کے کسی کام میں خلوص اور صداقت کا نام بھی نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ جہاں بچے ہوش سنبھالتے ہی اخلاق اور مذہب کے ایسے عملی نمونے دیکھیں گے۔ وہاں ان کو مدرسے میں دینیات کے چند رسالے پڑھا دینے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ اور بڑے ہو کر ان میں قومی حمیت اور اخلاقی جرأت کی کیا امید رکھی جا سکتی ہے۔ اس لئے اگر ہم سچے دل سے اپنی حالت کی اصلاح اور اپنی قوم کی بہبودی چاہتے ہیں۔ تو ہمارا فرض ہے کہ ہم میں سے ہر ایک ہر طرح کی ظاہرداری اور ریاکاری کو چھوڑ کر خالصۃً لوجہ اللہ تمام ظاہری اور باطنی احکام اسلام پر کاربند ہو۔ ہمارا دل اخلاقی خوبیوں سے معمور ہو۔ اور ہماری ظاہری وضع سے اسلامی شان ٹپکتی ہو۔ تاکہ ہم اپنے رسول اکرم جناب سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم کا کچھ تو برا بھلا عملی نمونہ پیش کر سکیں۔ حقیقت میں جس طرح فرائض کو چھوڑ کر سنن کو لینا احکام مذہب کے خلاف ہے۔ ویسے ہی صرف فرائض کو ماننا اور سنتوں کو نظر انداز کر دینا بھی شان دینداری کے شایاں نہیں۔ کیونکہ سچا اسلام وہی ہے جس میں خدا کی اطاعت اور نبی کی محبت دونو شامل ہوں۔

آخر میں ہم نہایت ادب اور عاجزی سے بارگاہ رب العزت میں دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے علما کو قانونِ شریعت کی پابندی کے ساتھ اسلام کے اخلاقی اصول اور روحانی تعلیم سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور ہمارے لیڈروں کو قومی عصبیت کے ساتھ اتباع سنت اور تقلید آداب

الْكٰافِرِيْنَ ۔ اٰمِين ۔ اٰمِين ثُمَّ اٰمِين ۔	اے پروردگار ہم سے اتنا بوجھ نہ اٹھوا جو ہماری طاقت سے زیادہ ہو۔ اور تو ہم کو معاف کر دے اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم کر تو ہمارا مالک ہے۔ پس تو ناشکر گزار لوگوں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔ آمین۔ آمین۔ آمین۔

ختم شد